ماہنامہ
کرن
نومبر 2022

حمد — محسن احسان — 9

نعت — سید عارف معین بلے — 9

انٹرویو

نادیہ اختر سے ملاقات، — شاہین رشید — 10

میری بھی سنیے، — شہزاد شیخ — 15

مقابل ہے آئینہ، — نوشی مغل — 19

ناول

تاش گھر، — ایمل رضا — 22

دامنِ سحاب، — مہوش افتخار — 92

ناولٹ

کا، — نتاشا حسن علی — 76

اک چھوٹا سا لڑکا تھا، — میمونہ صدف — 110

مکمل ناول

نمکین پانیوں کا سفر، — منعم ملک — 128

دوریاں اور نزدیکیاں، — آسیہ رئیس خان — 38

چنار کا آخری پتا، — فلک تنویر — 170

افسانے

کانٹے، — سیمابنت عاصم — 165

حرام کمائی، — تکبیر فاطمہ — 89

سنگِ گراں، — روبینہ شاہین — 202

زندگی زندہ دلی کا نام، — جویریہ مریم — 34

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) —— 1,440 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ —— 21000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 24000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com

کرن کتاب

بیوٹی باکس، — ادارہ — 4

فیشن اور اسٹائل — ادارہ — 5

گزرے پل جو سوچوں تو، — عائشہ قیوم خان — 6

صحت، — ادارہ — 8

کرن کا دسترخوان، — خالدہ جیلانی — 9

معاشرتی اور نفسیاتی مسائل، — ادارہ — 10

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو، — شعاع عمیر — 206

یادوں کے دریچے سے — بشریٰ محمود — 209

موتی چنتے ہیں، — ادارہ — 211

نامے میرے نام، — مدیرہ کرن — 212

واٹس ایپ

03172266944

نومبر 2022

جلد 44 شمارہ 08

قیمت 120 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37-اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

نادیہ اختر سے ملاقات

شاہین رشید

گزشتہ چند برسوں میں خواتین رائٹرز نے ڈراموں کی دنیا میں اپنی دھاک بٹھا دی ہے...... اپنی بہترین تحریروں سے پہلے ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں نام پیدا کیا اور اب ڈرامہ نگاری میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں...... آج کل ایک ڈرامہ سیریل ''بخت آور'' بہت پسند کیا جارہا ہے اسے ''نادیہ اختر'' نے لکھا۔ ان کے اور بھی ڈرامے بہت مقبول ہوئے تو ہم نے اپنی مہمان بنایا نادیہ اختر کو ان سے ان کے ڈراموں کے بارے میں اور ان کی دیگر تحریروں کے متعلق کچھ بات چیت کرسکیں۔

''کیسے مزاج ہیں نادیہ صاحبہ؟''

''الحمدللہ۔''

''نادیہ، سعدیہ...... دو بہنیں ہم قافیہ نام...... کنفیوژن تو ہوتا ہوگا؟''

''آپ کے اس دلچسپ سوال کا جواب یہ ہے کہ اکثر نہیں بلکہ بار بار کنفیوژن ہوتا ہے لوگوں کو...... اور اب جب ہمارے ڈرامے ایک ساتھ چلتے ہیں تو لوگ گھپلا کردیتے ہیں۔ جیسے میرا سیریل ''بخت آور'' چل رہا ہے اور اس کا ''وہ پاگل سی'' چل رہا ہے تو بخت آور کی مبارک باد اس کو ملتی رہتی ہے اور اس کے ڈرامے کی مجھے ملتی رہتی ہے اور آپ نے بھی مجھے سعدیہ کے ڈرامے کی مبارک باد دی کہ آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں...... اور نام کے مکس اپ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم دونوں نے شادی کے بعد اپنے والد کا ہی نام اپنے نام کے ساتھ لگایا ہے۔''

''آج کل آپ کا ڈرامہ سیریل ''بخت آور'' بہت پسند کیا جارہا ہے۔ تو اس کے بارے میں کیا کہیں گی؟''

''میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو ''بخت آور'' کو پسند کررہے ہیں...... یہ پروجیکٹ 2018ء میں شروع کیا گیا۔ اور چینل والے اس کو شوٹ پر نہیں لے گئے۔ پھر میں نے بھی کام چھوڑ دیا۔ یہ ڈرامہ تین بار ری رائٹ کیا گیا۔ پہلے اس کو ''بخت آور'' کی پوری کہانی کو لے کر فلمانا تھا۔ پھر مجھ سے چینج کروایا گیا۔ آپ خود سوچیں کہ جب ایک پروجیکٹ تین چار سال پھنسا رہے گا اور اس میں لوگوں کے مزاج کے مطابق تبدیلیاں آتی رہیں تو پھر اس میں وہ بات نہیں رہتی جو رائٹر کہنا چاہتا ہے...... لیکن پھر بھی اسے لوگ پسند کررہے تو اسے میں اپنی کامیابی ہی سمجھوں گی۔ لیکن اگر جب یہ آئیڈیا اپروو ہوا تھا اسی وقت یہ بن جاتا اور میری سوچ کے مطابق بنتا تو یہ بہت زیادہ مقبولیت حاصل کرتا۔ لیکن ہم ابھی بھی اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں ''بختو'' اگر کسی کو حقیقت سے دور لگے تو یہ ہمارے معاشرے کے منہ پر ایک تماچا ہے۔ ایک لڑکی جب کوئی بات کرتی ہے تو کوئی اس کو عزت و اہمیت نہیں دیتا مگر جب وہ لڑکا بن کر اور لڑکی کا بھائی بن کر ''شٹ اپ کال دیتی ہے تو سب کے منہ بند ہوجاتے ہیں۔ ڈرامہ مقبول ہورہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے تھوڑا فریش لگا ہے لوگوں کو...... اگر میں خود تنقیدی نگاہ سے دیکھوں تو مجھے بہت خامیاں بھی نظر آرہی ہیں...... بہت جلدی

میں بتایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود شاید شفقت پروڈکشن نے بہت اچھا (پروڈیوسر) کام کیا ہے — پروڈکشن نے بہت اہمیت اور دلیری دکھائی ہے ایک مختلف پروجیکٹ پر پیسہ لگایا ہے۔ کیونکہ پروڈکشن ہاؤس والے ابھی ساس بہو کے علاوہ کسی اور ٹاپک پر رسک نہیں لیتے تو میں تو ان کو داد دینا چاہوں گی کہ انہوں نے بہت اچھا سیریل بنایا ہے۔ پورا ٹیم ورک ہوتا ہے اور مجھے فخر ہے کہ یمنیٰ زیدی نے یہ رول کیا ہے اور مجھے یہ بھی فخر ہے کہ اس میں ہر فنکار نے بہت اچھا رول نبھایا۔ اس سیریل میں ہر ایک کے لیے ایک پیغام ہے کہ ہر داڑھی والا برا نہیں ہوتا اور ہر بے پردہ عورت بھی بری نہیں ہوتی...... میں نے کسی ایک کو ٹارگٹ نہیں کیا۔ بلکہ ہر ایک کردار کو اس کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ بتایا ہے اور میں نے معاشرے کے جو بنیادی مسائل ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔

''آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟''

''میں بہت کم لکھتی ہوں اور ''بخت آور'' لکھ کر مجھے اچھا لگ رہا ہے اور سب کی حوصلہ افزائی نے میرا حوصلہ بڑھایا ہے اور اب میں کامیڈی پر طبع آزمائی کررہی ہوں...... جو کہ فیملی کامیڈی ہوگی اور میری بہن فائزہ افتخار جن کا بہت نام ہے، وہ کامیڈی میں میری انسپائریشن ہیں۔ میں ان کے جیسا تو نہیں لکھ سکتی لیکن ان کی مدد سے اچھا لکھ لوں گی...... اور کامیڈی لکھنے کا خیال یوں آیا کہ ڈراموں میں بہت سارے موضوعات پر لکھا جارہا ہے مگر کامیڈی کا فقدان ہے۔ اور میں جو کامیڈی لکھ رہی ہوں اس میں بہت سخت قسم کے میسجز ہیں سوشل اور برنس والے میسجز ہیں...... لیکن ان ٹنس نہیں لگے گا بلکہ بہت لائٹ کامیڈی ہے اور جو ایشوز ہیں جو ٹاپکس ہیں وہ بہت سیریس ہیں...... اور وہ ایک بہت مختلف سبجیکٹ ہوگا مجھے لکھنے میں مزا آرہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دیکھنے والوں کو بھی مزا آئے گا۔ باقی ایک دو پروجیکٹ پائپ لائن میں ہیں۔''

''ڈراموں پر کچھ بات چیت...... چاہوں گی کہ آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟''

''میرے والد کا تعلق لاہور پنجاب سے ہے اور میری والدہ کا تعلق کے پی کے پشاور سے ہے۔ میری پیدائش پشاور کی ہے اور تعلیم و تربیت بھی پشاور میں ہی ہوئی۔ میں ''لاء'' میں گریجویٹ ہوں۔ ہم سات بہنیں ہیں اور سب کا تعلق کسی نہ کسی طریقے سے لکھائی پڑھائی سے ہے۔ سب بہت ٹیلنٹڈ ہیں ان میں سعدیہ اور فائزہ افتخار کا خاص طور پر ذکر کروں گی جن کو ڈائجسٹ کے حوالے سے اور ڈرامہ رائٹر کے حوالے سے سب جانتے ہیں۔ اور مجھے بھی اس حوالے سے پہچان ملی ہوئی ہے۔ باقی بہنوں میں کوئی ڈاکٹر ہے۔ کوئی یونائیٹڈ نیشن میں ہے کوئی آئی ٹی اسپیشلسٹ ہے۔ مگر سب کے اندر لکھنے کا کیڑا موجود ہے کسی نہ کسی فام میں۔ میری شادی 2012ء میں ہوئی اور میری ماشاءاللہ سے دو بیٹیاں ہیں۔''

''فیلڈ میں آنے اور پھر جگہ بنانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟''

''فیلڈ میں آنے اور جگہ بنانے کے لیے کوئی پاپڑ نہیں بیلنے پڑے۔ نہ کوئی سفارش...... کیونکہ کوئی بھی اپنا پیسہ نہیں ڈبوتا۔ اس فیلڈ میں نہ تو دوستی چلتی ہے اور نہ ہی سفارش...... تو جناب جیسے ہی پہلی کہانی بھیجی اپروو ہوگئی...... انہوں نے کہا کہ آپ کا ون لائنز اپروو ہوگیا ہے آپ کچھ اقساط لکھ کر بھیجیں۔ جب اقساط بھیجیں تو بغیر کسی ایڈیٹنگ کے وہ بھی اپروو ہوگئیں۔ بس اس کے بعد مجھے کام ملتا گیا اور میں کرتی گئی۔''

''بریک تھرو کس ڈرامہ نے دیا آپ کو؟''

''2012ء میں میرا ایک سیریل چلا تھا ''کبھی ان کہی'' یہ لائٹ سا اور رومانٹک سیریل تھا عائزہ خان اور شہریار منور اس کے مین رول تھے اور یہ ''ہم'' ٹی وی پر چلا تھا...... ہمارے یہاں ''TRP'' کو شہرت کا پیمانہ سمجھا جاتا ہے تو TRP میری جس سیریل کی آئی تھی وہ ''ملکہ عالیہ'' تھا جو 2014ء میں ''سوپ''

کی طرح چلا تھا اور "جیو" سے یہ ٹیلی کاسٹ ہوا تھا اور یہ سوپ بہت زیادہ مقبول ہوا تھا۔"

"اپنی پسند کے چینلز کو ڈرامہ دیتی ہیں۔ ڈائریکٹر اور پروڈکشن ہاؤس کا بھی خیال رکھتی ہیں کیا؟"

"ہاں...... میری کچھ پسند ناپسند بھی ہے...... اور میں چونکہ خود بہت پروفیشنل ہوں تو میں کام بھی پروفیشنل لوگوں کے ساتھ ہی کرتی ہوں...... ہاں...... میں نے اپنے ذاتی تجربے سے سیکھا ہے کہ جب میں اس فیلڈ میں نئی تھی اور کچھ لوگوں نے اپنی نئی پروڈکشن شروع کی تھی اور جب وہ مجھ سے رابطہ کرتے تھے تو میں ان کے لیے کام کر دیتی تھی۔ میرا بہت تلخ تجربہ رہا ہے "نان پروفیشنل" لوگوں کے ساتھ کہ وہ وقت پر پے منٹ نہیں کرتے تھے اور کافی وقت ضائع کرتے تھے...... تو میرا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے کہ آپ کم کام کریں مگر پروفیشنل لوگوں کے ساتھ کریں۔ اچھے چینل اور اچھی پروڈکشن کے ساتھ کریں۔ کیونکہ وہ آپ کے ساتھ کوئی غلط گیم نہیں کھیلیں گے۔ تو میرا پسندیدہ چینل وہی ہے جو پروفیشنل ہو۔ اور ٹاپ کا چینل ہو۔"

"آپ پورا اسکرپٹ دیتی ہیں یا ون لائنر۔ یا پھر چینل کی مرضی سے لکھتی ہیں؟"

"کبھی ون لائنر مانگتے ہیں تو کبھی آپ سے کہانی مانگ لیتے ہیں...... اور زیادہ تر تو میں چینل سے کہتی ہوں کہ آپ مجھے کوئی آئیڈیا دے دیں...... کیونکہ اگر میں اپنی چیز دوں تو اس میں اتنی تبدیلیاں آجاتی ہیں کہ یہ چینج کر دیں...... کردار زیادہ ہو گئے ہیں، رومینس کم ہے، مسالا نہیں ہے...... تو پھر میں یہی بہتر سمجھتی ہوں کہ جو وہ آئیڈیا دیں اسی پہ کام کروں...... تو جیسا کہ میں نے کہا کہ میرے کچھ تلخ تجربات بھی ہیں اور اچھا برا سب کچھ رائٹر کو ہی سننا پڑتا ہے...... اس لیے میں بہت احتیاط کرتی ہوں...... اور یہ چینل والوں کی یا ڈائریکٹر کی یا پروڈکشن ہاؤس کی اپنی مرضی ہوتی ہے کہ انہیں سوشل میسج پہ کچھ چاہیے...... یا کامیڈی چاہیے یا کوئی لو اسٹوری چاہیے۔ یہ ان کی ڈیمانڈ ضرور ہوتی ہے اور اسی پہ ہم کام کرتے ہیں...... اور ان کے آئیڈیاز پر کہانی بنا کے دے دیتے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ ڈرامہ رائٹنگ میں پیسہ بہت ہے...... کیا واقعی؟"

"میں ان رائٹرز میں سے نہیں ہوں جو پیسوں کے لیے کام کرتی یا کرتے ہیں...... اگر آپ سرچ کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے کب کب لکھا۔ ہاں جب میری شادی نہیں ہوئی تھی 2011، 2012ء میں تو اس وقت میرے پاس فراغت تھی...... پھر شادی ہوئی تب بھی فراغت تھی کوئی ذمہ داری بھی نہیں تھی۔ تو اس وقت میں نے کافی لکھا اور پیسے کمائے اور پیسوں کو انجوائے کیا اور بینک بیلنس تو نہیں بڑھا، کیونکہ خرچ کرتی رہی اور پھر۔ جب بچے ہوئے، ذمہ داریاں بڑھیں۔ میاں صاحب کی پوسٹنگ ادھر سے ادھر اور پھر میاں صاحب نے بھی کہا کہ اب مت کام کرو۔ اور 2014ء کے بعد اچھا خاصا گیپ آگیا۔ اور اب میں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا ہے...... اور نہ پہلے اور نہ اب...... پیسوں کے لیے نہیں بلکہ کچھ کرنے کے لیے لکھتی ہوں۔ بس کچھ کرنے کی جستجو مجھے کام کرنے پر مجبور کر رہی ہے...... کچھ الگ ہی نظر آنے والا کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہتے ہیں کہ اسکرپٹ چوری ہو جاتا ہے؟ اور آئیڈیا بھی چوری ہو جاتا ہے؟"

"میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا...... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نہیں ہوتا۔ اسکرپٹ چوری ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے۔ مجھے الحمدللہ کسی نے تنگ بھی نہیں کیا ہے...... اور "ہم" ٹی وی اور "جیو" کے ساتھ کام کرنے کا بہت اچھا تجربہ ہے۔"

"ڈرامہ دیکھنے والوں پر اثر انداز ہوتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ ڈرامے تو لوگ تفریحاً دیکھ رہے ہیں کہ اثر انداز ہونے کے لیے اور بہت کچھ ہے...... یوٹیوب ہے، سوشل میڈیا ہے یہ لوگوں پر بہت اثر انداز ہو رہا ہے...... ڈراموں میں تو میرے خیال سے ہیروئن کے فیشن سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں لوگ...... نوجوان ہو یا دیگر عمر کے لوگوں نے پہلے سے ہی ٹک ٹاک بھی دیکھ لیے ہوتے ہیں۔ نیٹ فلکس بھی دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے ڈراموں کی باری بہت بعد میں آتی ہے...... اور ڈرامے معاشرے کے بگاڑ کا سبب نہیں ہیں کیونکہ بچے پہلے ہی نیٹ فلکس سے بہت کچھ سیکھ چکے ہوتے ہیں۔"

"آپ کے میاں صاحب آپ کے ڈرامے دیکھتے ہیں؟...... تنقید تعریف کس پر زور ہوتا ہے؟"

"میرے میاں کے لیے تو گھر کی مرغی دال برابر ہے۔ نہ وہ میرے ڈرامے دیکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں ڈراموں سے کوئی دلچسپی ہے۔ لیکن میری والدہ میرے ڈرامے دیکھتی ہیں کہ میری بیٹی کا ڈرامہ آرہا ہے اور سچ کہوں تو امی کے کہنے پر ہی میں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ اب بیٹی تمہاری سمجھ دار ہو گئی ہے تو بے کار بیٹھنے سے بہتر ہے کہ کام کرو اور یہ ان ہی کی موٹیویشن ہے کہ میں دوبارہ لکھنے لگی ہوں اور میرے سب سے بڑے فالوور میرے "سسر" ہیں وہ بہت زیادہ شوق سے میرے ڈرامے دیکھتے ہیں اور اگر کوئی ڈرامہ مس ہو جائے تو پھر وہ یوٹیوب پر دیکھ لیتے ہیں۔"

"اتنا اچھا لکھتی ہیں۔ لوگ پسند کرتے ہیں تو دل چاہتا ہے لوگ مجھے پہچانیں۔ ملیں؟"

"میں بالکل بھی نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے پہچانیں...... میں بڑی اینٹی سوشل قسم کی بندی ہوں...... میرے میاں صاحب یا میری فیملی کسی سے میرا ذکر کریں تو میں ان سے ناراض ہوتی ہوں کہ آپ نے کیوں بتایا کہ یہ ڈرامہ میری بیوی نے یا میری بیٹی نے لکھا ہے...... کسی محفل میں میرے ڈرامے کی بات ہو رہی ہوتی ہے تو میں خاموش بیٹھی رہتی ہوں کہ کہیں انہیں پتا نہ چل جائے کہ میرے ڈرامے کا ذکر ہو رہا ہے۔ میں اپنے حوالے سے ہمیشہ پیچھے رہنا چاہتی ہوں...... فائزہ افتخار جو ماشاءاللہ بہت منجھی ہوئی اور بڑی رائٹر ہیں وہ میری بڑی بہن ہیں۔ میں پہلے بھی ان ہی کے نام سے پہچانی جاتی تھی اور آج بھی ان ہی کے نام سے پہچانی جاتی ہوں۔ میں [illegible] کی سسٹر ہوں تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ تو میری بہت پذیرائی ہوتی ہے ان کے حوالے سے......"

"لوگ رائٹر کے نام سے ڈرامہ دیکھتے ہیں یا بس ڈرامہ دیکھتے ہیں؟"

"میرا اپنا خیال یہ ہے کہ لوگ اب پہلے رائٹر کا نام پوچھتے ہیں اور پھر ڈرامہ دیکھتے ہیں...... ہر کوئی نہیں لیکن جو ڈراموں کی شدید جانتے ہیں جو پڑھے لکھے ناظرین ہیں انہیں اس بات سے دلچسپی ہوتی ہے کہ اسے کس نے لکھی ہے۔ ڈائریکٹر کون ہے۔ اس میں کام کرنے والے کون سے فنکار ہیں......"

"تھوڑی ادھر ادھر کی بھی باتیں ہو جائیں ساتھ ساتھ سگھڑ ہیں آپ؟"

"میں سگھڑ ہوں، مگر تھوڑی سست بھی ہوں، جو کہ ہر آرٹسٹ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سوچتا ہے، سین بناتا ہے۔ اسٹوری بناتا ہے۔ اور میرا سگھڑاپا یہ ہے کہ اگر مجھ پر کسی کام کی دھن سوار ہو جائے تو وہ کام خود ہی کروں گی اور اگر مجھ پر سستی سوار ہے تو کئی کئی مہینے کچھ نہیں کروں گی...... تو موڈی ہوں...... اور موڈی ہونا بھی آرٹسٹ کی شان ہے...... میں چلتی پھرتی آرٹسٹ ہوں اور میری شکل پر لکھا ہے کہ میں ایک رائٹر ہوں۔ بلکہ آرٹسٹ ہوں جس کا آرٹ کسی نہ کسی فیلڈ سے تعلق ہے...... میں کھانا بھی اچھا بنا لیتی ہوں...... لیکن مجھے کوکنگ سے کوئی شوق نہیں ہے...... ہاں جوش اور موڈ ہو تو پھر سارا دن کوکنگ کرتی ہوں۔ مجھے ٹریولنگ کا شوق ہے لیکن گوشہ نشینی زیادہ پسند ہے اور میں کئی کئی سال اور کئی کئی مہینے گھر سے نہیں نکلتی۔ شاپنگ کا شوق آجائے تو روز بازار جاؤں گی۔ کئی کئی سال شاپنگ خود سے کرنے کا خیال ہی نہیں آتا...... بہت ضرورت ہو تو پھر آن لائن منگوا لیتی ہوں...... اور ٹریولنگ ملک کے اندر کرنا پسند نہیں ہے بلکہ ملک سے باہر کرنا پسند ہے...... جب میں ملک سے باہر جاتی ہوں تو بہت ایکٹو ہو جاتی ہوں...... میں امریکہ، ملائیشیا، اور ترکی جا چکی ہوں...... مختلف ممالک جا کر ان کی تاریخی عمارات کو

دیکھنا، ان کی ثقافت کے بارے میں جاننا وہاں کے کھانوں کو ٹرائی کرنا۔ پسند ہے اور جو بھی کرتی ہوں اپنے موڈ کے مطابق کرتی ہوں میرا ہر کام میرے موڈ سے ریلیٹڈ ہے...... اگر میں نہیں لکھوں گی تو کئی کئی سال نہیں لکھوں گی اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ میری دو بیٹیاں ہیں تو میں زیادہ وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ میری ایک بیٹی نو سال اور ایک ابھی پانچ ماہ کی ہے۔ گھر کا پکا ہوا کھانا پسند کرتی ہوں۔ باہر کا کھانا بہت کم کھاتی ہوں لیکن جب کھاتی ہوں تو بہت شوق سے کھاتی ہوں۔"

"آپ نے کہا کہ ہم ساری بہنوں میں لکھنے کا کیڑا ہے تو کیا یہ سب کچھ گھر کے ماحول سے ملا؟ اور ڈرامہ رائٹنگ کی طرف کیسے آئیں؟"

"میں اپنی فیملی میں بڑوں کو ہمیشہ ادب کی کتابیں پڑھتے ہی دیکھا۔ شاعری کی کتابیں پڑھنے اور موویز کی باتیں کرتے دیکھا تو ماحول تو ادبی اور پڑھنے لکھنے والا تو بنا ہوا تھا...... اور خاص طور پر ہمارے ددھیال کا ماحول خاصا ادبی تھا۔ فائزہ افتخار نے ینگ ایج میں لکھنا شروع کر دیا۔ اور میں نے نہ کبھی ناول لکھا نہ ہی کبھی افسانہ۔ مجھے یاد ہے کہ فائزہ نے ایک کہانی لکھی اور میرے نام سے ایک پروڈکشن ہاؤس میں بھیج دی اور نمبر بھی میرا ہی دے دیا۔ اب پروڈکشن ہاؤس کال آ گئی کہ ہمیں کہانی اچھی لگی ہے اب آپ اقساط لکھ کر بھیج دیں۔ تب میں نے فائزہ کو فون کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا...... تو وہ ہنس پڑیں کہ جب تم اسکرین پلے میں میری مدد کرتی ہو تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم میں اسکرین پلے لکھنے کی صلاحیت ہے۔ جراثیم ہیں اس لیے تم ضرور ٹرائی کرو۔ تو میں نے تھوڑا غصے میں کہا کہ میں چار اقساط لکھ کر دے دوں گی اور اتنا گندہ لکھوں گی کہ پھر ان کی مجال نہیں ہو گی کہ وہ مجھے مزید لکھنے کے لیے کہیں۔ تو آپ یقین کریں کہ انہیں نہیں پتا کہ میں نے ان کی کہانی کو کس طرح انٹ شنٹ کر کے لکھا۔ میں نے لکھ کر بھیج دیا اور بھول گئی کہ کچھ بھیجا بھی تھا۔ مگر جناب ادھر سے تو کال آ گئی کہ ہمیں اقساط پسند آ گئی ہیں یہ آپ کا کنٹریکٹ ہے اس پر سائن کر دیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ افسانہ، ناول لکھنے کا میرا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں ہے لیکن ان ہی کو پڑھ کر بہت کچھ سیکھا ہے۔ جب سے پڑھنا لکھنا سیکھا ہے خواتین، شعاع اور کرن کو پڑھا ہے۔ یہ میگزین پھوپھیوں کے لیے آتا تھا اور ہم بھی پڑھ لیتے تھے جس پر ہمیں ڈانٹ پڑا کرتی تھی کہ ابھی تمہاری عمر نہیں ہے...... مگر سچ یہی ہے کہ ان ہی کو پڑھ کر لکھنے کا ہنر آیا اور آج ہم تین بہنیں ڈرامہ رائٹر ہیں۔ اور یہ سارا کریڈٹ آپ کے ڈائجسٹوں کو جاتا ہے اور رائٹرز کو جاتا ہے...... رضیہ بٹ، بشریٰ رحمٰن، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کو پڑھ کر بڑے ہوئے ہیں ہم۔ کردار نگاری، جذبات، رشتوں کے تانے بانے ان ہی ڈائجسٹوں سے سیکھا ہے۔ ہاں یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے کہ اب پرنٹ میڈیا کی وقعت کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن میں تو ابھی آن لائن پرنٹ میڈیا کے کالم اور پسندیدہ چیزیں پڑھتی ہوں اور میں ویڈیوز دیکھنے کے بجائے کالم پڑھنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ کیونکہ اخبار میں کالمز پڑھنے کی عادت بچپن سے ہی ہے۔"

"بیٹیوں کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

"میری کوشش ہوتی کہ میری بیٹیاں بھی بڑی ہو کر پرنٹ میڈیا کو فالو کریں۔ کتابوں کے ساتھ اپنا رابطہ ختم نہ کریں۔ ہمارے بچپن میں ہمارے گھر میں اخبار بہت آتے تھے۔ میگزین بہت آتے تھے۔ پڑھنا پڑھانا بہت ہوتا تھا۔ اور ہم سب بہنیں کسی نہ کسی حوالے سے لکھنے سے وابستہ ہیں...... اور مجھے فخر ہے کہ میرا بچپن خواتین، شعاع اور کرن پڑھتے ہوئے گزرا ہے۔

نادیہ اختر سے پوچھنے کے لیے بہت سے سوال تھے مگر جگہ کی قلت نے مزید سوالات کی اجازت نہیں دی...... سوا ای کو بہت جاہیے۔

"اور شکریہ نادیہ اختر کہ آپ نے ہمیں ٹائم دیا۔"

☆☆

میری بھی سنئے

شہزاد شیخ

شاہین رشید

1۔ "پورا نام؟"

"شہزاد شیخ ہی ہے آگے پیچھے اور کوئی نام نہیں ہے اور چونکہ راولپنڈی کے شیخ گھرانے سے تعلق ہے تو اس لیے شیخ کہلاتے ہیں۔ اور مجھے سب پیار سے شیزی، شیز یا پھر شہزادہی کہتے ہیں۔"

2۔ "پیدائش؟"

"پیدائش 1985 کو کراچی میں پیدا ہوا اور مہینہ اکتوبر کا ہے یعنی 15 اکتوبر۔"

3۔ "فیملی ممبر؟"

"سب کو پتا ہے پھر بھی لکھ لیجیے۔ والد مشہور و معروف شخصیت جاوید شیخ صاحب۔ والدہ زینت منگی صاحبہ۔ ایک ہی بہن ہے جو کہ مجھ سے دو سال چھوٹی ہے مومل شیخ اس کا نام ہے۔"

4۔ "تعلیم؟"

"ابتدائی تعلیم تو کراچی سٹی اسکول سے حاصل کی۔ اس کے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس منیجمنٹ سے کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کی اور پھر نیویارک چلا گیا جہاں فلم اکیڈمی سے اداکاری کا ایک سالہ کورس کیا۔ اور بس...... پھر فیلڈ میں آ گیا۔"

5۔ "کس کے کہنے پر فیلڈ میں آیا؟"

"کسی کے کہنے پر نہیں خاندانی جراثیم تھے۔ اداکاری الحمدللہ ورثے میں ملی ہے۔ والد، چچا ان سب کا عکس ہوں۔ والدہ بھی اس فیلڈ سے وابستہ رہ چکی ہیں۔"

6۔ "والدین میں کس کے قریب رہا؟"

"والدہ کے، والد کام کے سلسلے میں مصروف رہتے تھے تو چھٹیوں میں یا پھر ویسے ہی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی تو تربیت میں ماں کا ہاتھ ہے اور مالی سپورٹ والد صاحب نے بھرپور طریقے سے کی۔"

7۔ "فیلڈ میں پہلا قدم کب رکھا؟"

"2011 میں اور پہلا سیریل "ڈریمر" کیا اچھا رسپانس ملا تھا۔"

8۔ "آج تک خوف آتا ہے؟"

"کیمرے سے۔ مگر جب لال بتی آن ہو جاتی ہے تو پھر ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ حالانکہ لوگ لال بتی دیکھ کر زیادہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔"

9۔ "پہلی بار کیمرے کے سامنے کیا کیفیت تھی؟"

"اف! مت پوچھیں ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ماتھے پر پسینہ۔ بہت نروس تھا بہت بری حالت

تھی۔

10۔ "فیلڈ میں آکر کیا کھویا؟"

"اپنی آزادی ...... مگر پایا بہت کچھ ہے۔ عزت، دولت، شہرت اللہ نے سب کچھ عطا کیا الحمدللہ بس کبھی ہجوم میں جاؤ تو ذرا مشکل ہوتی ہے۔ شہرت بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

11۔ "والد کے حوالے سے میری دیرینہ خواہش ہے کہ؟"

"کہ ایک دن ایسا بھی آئے کہ والد صاحب فخر سے کہہ سکیں کہ "شہزاد شیخ" میرا بیٹا ہے۔"

12۔ "فیوچر میں اپنے آپ کو کہاں دیکھتا ہوں؟"

"بہت آگے ...... جہاں میرا نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جائے۔"

13۔ "مزاجاً کیسا ہوں؟"

"اس کے بارے میں تو قریبی لوگوں سے پوچھیں ویسے اپنے طور پر تو میں خاصا خوش مزاج ہوں۔"

14۔ "ٹی وی یا فلم، میرا انتخاب؟"

"فی الحال میں ٹی وی کے لیے زیادہ کام کرنا چاہتا ہوں ...... فلم میری دوسری ترجیح ہے۔"

15۔ "اگر اداکاری میں کامیاب نہ ہوتا تو؟"

"اداکاری میرا جنون ہے بہت محنت کی ہے۔ اور اگر کامیاب نہ ہوتا تو بھی شوبز میں ہی ہوتا مگر کسی اور شعبے میں۔"

16۔ "شادی؟"

"جی الحمدللہ شادی شدہ ہوں اور ماشاء اللہ دو بچے ہیں میرے۔ بیٹا اور بیٹی۔"

17۔ "شادی میں میری پسند کو کتنا عمل دخل تھا؟"

"سو فیصد میری بیگم "حنا" میری ہی پسند ہے اور میری پسند کو والدین نے بھی پسند کیا۔ الحمدللہ۔"

18۔ "پچھتاوا؟"

"بالکل بھی نہیں "حنا" میری بہت اچھی شریک سفر ہے۔ بہت اچھی دوست ہے۔"

19۔ "دونوں کتنے مزاج آشنا ہیں کتنے فیصد؟"

بہت زیادہ ...... فیصد کا اندازہ نہیں ہے۔"

20۔ "بیگم ہاؤس وائف یا ورکنگ وومن؟"

"ہاؤس وائف۔ پلس ورکنگ وومن۔ وہ پیشے کے اعتبار سے "وکیل" ہیں۔"

21۔ "شکی مزاج یا خوش مزاج؟"

"شکی مزاج تو بالکل نہیں۔ لیکن خوش مزاج بہت ہیں۔"

22۔ "حنا" ایک بات جو اکثر کہتی ہیں؟"

"کہ کام کو کام سمجھ کر ہی کیجیے گا۔ خاص طور پر خواتین کے ساتھ۔ رومینس کریں مگر صرف کردار کی حد تک۔"

23۔ "بیٹے کی پیدائش پر میرا ردعمل؟"

"مت پوچھیں۔ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے اولاد کائنات کا حسن ہے۔"

24۔ "سنجیدہ کردار کرنے کی وجہ؟"

"ایسا نہیں ہے۔ میں نے ہلکے پھلکے بھی رول کیے ہیں۔ بس جیسا رول آفر آجائے۔ زیادہ تر سنجیدہ نوعیت کے رولز آفر ہوتے ہیں تو بس پھر سنجیدہ ہی کرلیتا ہوں۔"

25۔ "ہر رول قبول کرلیتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔ ہر وہ رول لیتا ہوں جو مجھے خود کو اچھا لگتا ہے جس میں اداکاری کا مارجن زیادہ ہوتا ہے۔"

26۔ "زندگی سبق سکھاتی ہے؟"

"بہت ...... اگر کوئی سیکھنے والا ہو تو۔"

27۔ "میں نے زندگی سے کیا سیکھا؟"

"کہ آپ جو کچھ زندگی کو دیتے ہیں ایک وقت آتا ہے کہ زندگی آپ کو وہی چیز لوٹا دیتی ہے۔"

28۔ "اپنی زندگی سے مطمئن ہوں؟"

"اگر مطمئن ہوگیا تو جدوجہد ختم ہوجائے گی۔ خواہشات ماند پڑ جائیں گی۔ زندگی میں جمود طاری ہوجائے گا۔"

29۔ "زندگی میں جو چاہا ملا؟"

"ملا، مگر بہت جدوجہد کے بعد۔ تھالی میں رکھا ہوا کچھ بھی نہیں ملا۔ اور مزا بھی اسی چیز میں ہے جو محنت کے بعد اور بہت زیادہ جدوجہد کے بعد ملے۔"

30۔ "اپنی ایک عادت جو پسند ہے؟"

"منفی باتوں سے مثبت پہلو تلاش کرنا۔ کبھی کسی کے لیے غلط نہ سوچیں۔"

31۔ "وقت کی پابندی کا قائل ہوں؟"

"سو فیصد۔ بہت کوشش کرتا ہوں اور کامیاب بھی ہوتا ہوں وقت کی پابندی کرنے پر۔ روز بہت زیادہ معذرت کرتا ہوں۔

32۔ "سیٹ پر عموماً کب بہت غصہ آتا ہے؟"

"جب مجھ سمیت کوئی وقت پر نہ آئے۔"

33۔ "اپنے آپ پر کب بہت غصہ آتا ہے؟"

"نیند گہری ہے آنکھ جلدی نہیں کھلتی۔ ہمیشہ دیر سے اٹھتا ہوں۔ تب اپنے آپ سے شرمندگی بھی ہوتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔"

34۔ "کیا لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتا؟"

"سیل فون، والٹ اور خاص طور پر ماں کی دعا لیے بغیر نہیں نکلتا گھر سے۔"

35۔ "میں حیران ہوجاتا ہوں؟"

"جب کوئی میرے منہ پر جھوٹ بولتا ہے۔"

36۔ "تنگ آجاتا ہوں پرستاروں سے؟"

"ہرگز نہیں ...... مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب لوگ مجھے پہچان کر میرے قریب آتے ہیں۔ دعا سلام کرتے ہیں۔ تب اپنے اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اتنی عزت دی ہے۔"

37۔ "کس چیز کے بغیر زندگی نامکمل ہے؟"

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... فضا بتول

میک اپ .... روز بیوٹی پارلر

فوٹوگرافی .... موسیٰ رضا

"سیل فون کے بغیر۔ اب تو گزارا ہی نہیں ہے۔ فون کے بغیر۔"

38۔ "وہ دور بہت اچھا تھا؟"

قہقہہ...... "وہ دور جب موبائل فون نہیں تھا۔ سکون کی زندگی تھی۔ اب تو "نشے" کی طرح ہوگیا ہے سیل فون کہ یہ نہیں ہوگا تو زندگی ادھوری ہوگی۔"

39۔ "میرا یادگار کردار؟"

"اب تو خیر کافی ہوگئے ہیں۔ مگر پھر بھی ڈرامہ سیریل "می رقصم" میں میرا کردار بہت اچھا تھا۔ "ذیشان" تھا میرے کردار کا نام۔"

40۔ "کبھی کسی پڑوسی ملک سے بلاوہ آئے تو؟"

"تو ضرور جاؤں گا۔ قسمت آمانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

41۔ "رشتے داروں سے تعلقات؟"

"الحمدللہ بہت اچھے ہیں۔ سب پیار محبت سے رہتے ہیں۔"

42۔ "مجھے حسد ہوتا ہے؟"

"کسی سے نہیں۔ ہماری تربیت ہی ایسی نہیں ہے کہ ہم کسی سے حسد یا بغض وعداوت رکھیں۔"

43۔ "تنقید پر میرا ردعمل؟"

"کچھ نہیں۔ سنتا ہوں، صحیح ہو تو اپنی خامیاں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

44۔ "زندگی کا یادگار دن؟"

"شادی اور پھر بیٹے کی پیدائش۔"

45۔ "چھٹی کا دن کیسے گزارتا ہوں؟"

"اپنی فیملی کے ساتھ۔ یا تو گھر پر یا کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتا ہوں۔"

46۔ "کچن میں جاتا ہوں؟"

"جب بیگم کچن میں جاتی ہے تو اس کی مدد کے لیے چلا جاتا ہوں۔ ویسے اللہ کا شکر ہے کہ گھر میں کام کرنے والے ملازمین ہیں۔ وہ کچن بھی سنبھال لیتے ہیں ویسے میں خود آملیٹ اچھا بنالیتا ہوں۔"

47۔ "سوشل ہوں؟"

"نہیں...... مجھے تنہا رہنا اچھا لگتا ہے۔ ہجوم میں گھبراتا ہوں۔"

48۔ "مطالعہ کا شوق؟"

"بالکل ہے شاعری سے زیادہ لگاؤ ہے۔ غالب اور اقبال میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ اور ان کو اکثر پڑھتا ہوں۔ اور ویسے بھی کورس کی کتابوں میں انہیں بہت پڑھا ہے۔"

49۔ "کون کون سے گیمز پسند ہیں؟"

"کرکٹ اور فٹ بال کا بے حد شوقین ہوں۔ اور کرکٹ تو اکثر کھیلتا ہوں۔ اور فٹ بال میں مجھے کرسٹینا نورا اور رونالڈو پسند ہیں جبکہ کرکٹ میں شاہد آفریدی پسند ہیں۔"

50۔ "اگر شوبز چھوڑنا پڑے تو؟"

"کیوں بھئی کیوں چھوڑ دوں۔ یہ فیلڈ بہت وسیع ہے اسی میں رہ کر کچھ اور کرلوں گا۔"

☆☆

مقابل ہے آئینہ

نوشی مُغل

رِدا رہ

س۔ ''اصلی نام ہے، گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟''

ج۔ ''جی نام تو میرا نوشین فاطمہ ہے پر گھر والے نوشی کہتے ہیں۔ دادا (مرحوم) بھاگو (پنجابی نام ہے) اور دوستوں کا تو ناں ہی پوچھو بچپن کی دوستیں اب بھی پھینو (ہنسنا منع ہے) اور کچھ دوستیں کرشمش بھی بلاتی ہیں۔''

س۔ ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج۔ ''ہاہاہا آئینہ کہتا ہے کہ باجی ہفتے بعد منہ دھوتی ہو صابن سے، پھر بھی مراسیوں جیسی نہیں لگتیں کیا راز ہے؟''

س۔ ''حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟''

ج۔ ''پہلا خیال تو یہ آتا ہے کہ انا دا حسن قدرتی اے کہ فائزہ بیوٹی دا کمال اے (آ کھوں آ کھوں) ویسے ایک بات تو بتاؤں آپ سب کو معذرت کے ساتھ کہ کریموں والیاں لڑکیاں صرف منہ کا ہی خیال رکھتی ہیں (ہی ہی ہی)''

س۔ ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لیں تو؟''

ج۔ ''کوئی ہاتھ تو لگائے میرے بٹوے (ہی ہی ہی) کو۔ کیا ملے گا، بھلا لو کیا کا بٹنوں والا موبائل اور پرانے زمانے کی چھوٹی نمبروں والی ڈائری (آ ہم م م)''

س۔ ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج۔ ''بھوت بے چارے تو مجھ چڑیل سے ڈرتے ہوں گے۔ اکثر تو میں بھوت اور چڑیل بن کر ڈرا بھی دیتی ہوں سب کو۔ ایک دفعہ سارے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے ڈائن بن کر اماں جی کا تراہ نکال دیا، بس بہنوں پھر کیا ابو جی کا کیلن کا جوتا تھا میری کمر (کنڈتے) پہ۔ بھائیوں کا تو ہاسا نکل گیا اور یہ چڑیل بے چاری رونے لگ گئی۔ ہچی۔''

س۔ ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج۔ ''وہ مہمان جو اپنے ساتھ اتنا سارا فروٹ لاتے ہیں اور جاتے وقت پیسے دے کر جاتے ہیں۔ (ہی ہی ہی)۔''

س۔ ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج۔ ''کھانے میں بینگن، کدو اور ککڑیوں (مرغیوں) کے پائے پسند ہیں (سمجھ تو گئے ہونے اوسی)۔''

س۔ ''اگر آپ کو حکومت جائے تو؟''

ج۔ ''ہائے رے قسمت۔ حکومت تو دور کی بات کوئی مجھے دو آنے تک نہیں دیتا (ہیں جو نہیں اب

یہ تھے) اور باقی کرن بھی جائیں تو سب سے پہلے (کرن، شعاع، خواتین) کے پچھلے سالوں کے سارے رسالے اب گھر اسٹاک (اکٹھے) کرواؤں گی۔ (ٹھیک اے ناں)۔"

س۔ "آپ کے پسندیدہ شاعر؟"

ج۔ "ایمان انور (ہمسائیوں کی) اور میں بذات خود...... ہاں ہاں ٹھیک سنیا تسی۔ میں بھی اچھی شاعری کرتی ہوں تے فرسنو عرض ہے۔"

س۔ "تھوڑا سا پیار ہوا تھوڑا سا ہے باقی" واہ واہ"

بندہ پوچھے یہ پیار ہے یا مکان کی قسطیں
اور ہمارے محلے کا بشیر مراسی (ہی ہی ہی)

س۔ "مزاجاً لڑاکا ہیں؟"

ج۔ "الحمدللہ لڑاکا پن تو نہیں ہے مزاج میں اور دوسروں کو کسی حد تک بخش بھی دیتی ہوں لیکن جب ڈاکٹر بھائی (میرا اپنا بھائی ہے ماشاءاللہ) چھیڑتے ہیں تو بس پھر ہم دونوں کی چونچیں (بھئی منہ ساڈے) نہ بند ہوں (مذاق جو کردے آں) ویسے اگر کوئی سخت لہجے میں بات کرے یا ڈانٹے تو فوراً رونے لگ جاتی ہوں۔" (اکلوتی بہن ہونے کا فائدہ)"

س۔ "اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟"

ج۔ "اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو گھر والوں کو رات اندھیرے میں ڈرانے کا مزا کیسے آتا بھلا پر افسوس، اس اندھیرے کی جگہ جنریٹر اور یو پی ایس نے لے لی ہے۔"

س۔ "اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟"

ج۔ "ویسے تو میں دن کے 25 (پچیس) گھنٹے اللہ جی، کو مگر جب میرے پیسے گم ہو جائیں تو" اللہ جی بس ایک دفعہ پیسے مل جاون پھر کبھی چنری (دوپٹا) کے پلو میں نہ باندھوں گی۔" اور جب پاک انڈیا کا میچ ہو تو "اللہ، جی اگر پاکستان یہ میچ جیت گیا تو محلے کے بچوں کو میٹھا بانٹوں گی۔ پھر ماشاءاللہ اگلے دن بچوں میں میٹھا (چینی یہ بھی تو میٹھی ہے نا) بانٹا۔

اب تینوں جوس نا سمجھ لینا تسی سب۔"

س۔ "آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

ج۔ "افسوس کفایت شعار کا لفظ تو میری ڈکشنری میں نہیں ہے۔ ہاں فضول خرچ تو رج کے ہوں۔ بیٹھے بیٹھے پانچ سو کھا جاتی ہوں۔ مہینے کے شروع میں بابا سے لے لیے پھر ماما سے ٹھگے اور پھر بھائیوں سے (ہاہاہا) لیکن ہر ماہ اپنا صدقہ خود بھی دیتی ہوں اور ماما بھی کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجتیں۔"

س۔ "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں؟"

ج۔ "میری فرینڈز کہتی ہیں اس کے اندر میگنٹ ہے جو یہ ہر نئی کلاس فیلو کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ (ہاہاہا) میری کزن کی کزن کی کزن کو بھی میں نے دوست بنا لیا فرینکلی ہو جاتی ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے لگتا ہے کہ یہ سب میرے نام نوشین (شیریں، مٹھاس) کا ہی کمال ہے۔

س۔ "وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟"

ج۔ "دنیا والوں کی تو عادت ہے ہر وقت نکتہ چینی کی۔ کرتا پینٹ پہنو تو ہائے ہائے ایہہ کی پالیا (بھلا ان کو نظر نہیں آتا) جب ہمارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں تو ان کو کیا تکلیف ہے اونہہ۔ ویسے میں اتنی بھی فیشن ایبل نہیں ہوں۔ ہاں جب گرمیوں میں بازو فل فولڈ کر کے آم کھا (پینڈو طریقے سے) رہی ہوتی ہوں اور اوپر سے مہمان آجائیں تو شرمندہ ہو جاتی ہوں (آکھم م م م)۔"

س۔ "اگر آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟"

ج۔ "ہک ہاہ بہت لمبی کہانی ہے دوستوں مختصر یہ سنو کہ ایک دفعہ غلطی سے ایک کتا میرے پیچھے لگ گیا بھاگ بھاگ کر میں نے اس کو پورے شہر کا راؤنڈ لگوا دیا (ہاہاہا) بے چارے نے سارا شہر بھی دیکھ لیا اور اس کا وزن بھی دو پونڈ کم کر دیا میں نے

(ہاہاہا)۔"

س۔ "محبت آپ کی نظر میں؟"

ج۔ "میری نظر میں محبت اگر ماں سے کی جائے تو دعائیں ملتی ہیں۔ اور اگر ٹائم پاس لڑکوں سے کی جائے تو لتر پریڈ اور چھترول کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ (ہاہاہا)۔"

س۔ "آپ کن لوگوں کی احساس مند ہیں؟"

ج۔ "میں قائداعظم کی احسان مند ہوں کہ جنہوں نے ہمارا ملک ان نکموں (انگریزوں) سے آزاد کروایا اور احسان مند ہوں کرن اور خواتین کی۔ کرن کو تو میں پچھلے پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ کرن کا مجھے اتنا چسکا پڑ گیا ہے کہ اگر 16 تاریخ تک کرن نہ ملے تو جان جانے لگتی ہے (ہی ہی) اب الحمدللہ کوئی مسئلہ نہ ہوگا تھینک یو حمید بھائی۔"

س۔ "اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟"

ج۔ "اب کوئی خوشی نہیں ہوتی کیونکہ مجھے نظر جلدی لگ جاتی ہے اور اگر کوئی تعریف کرے اور ماشاءاللہ نہ بولے تو پھر چڑھ تپ جاتی ہے لیکن کنٹرول کرتی ہوں اور خود بھی ماشاءاللہ بول دیتی ہوں۔ ویسے اتنی وی سوہنی کوئی نئی میں (ہاہاہا)۔"

س۔ "اگر دوست ناراض ہو جائیں تو؟"

ج۔ "ہائے کی پوچھ لیا تسی، ہم چار فرینڈز کا گروپ ہے میں یعنی نوشین مغل، مریم، طوبیٰ اور محراب اور ہم میں کبھی نوبت ہی نہیں آئی ناراض ہونے کی۔ حریم جو کہ میری بچپن کی دوست ہے وہ بچپن میں کارڈ بنا کر دیتی اور سوری بھی لکھتی جو میں نے ابھی تک سنبھال کر رکھے ہیں اور اگر وہ ناراض ہو جاتی تو میں اس کے کان پکڑ لیتی اور کہتی ہونا ای راضی کہ نئیں (ہی ہی ہی)۔"

س۔ "حقیقی خوشی کب ملتی ہے؟"

ج۔ "سچی دساں، حقیقی خوشی تب ہی جب گھر میں ٹینڈے پکے ہوں اور ہمسائیوں کے گھر سے بریانی کی پلیٹ آ جائے آئے ہائے وارے نیارے ہو جاندے قسمے، میں تو پھر ٹوٹ پڑتی ہوں بریانی پر اور پھر پلیٹ فارغ کر کے ہی اٹھتی ہوں۔ ہاہاہا ہن تسی مینوں ندیدی نہ سمجھ لینا (ہاہاہا)۔"

س۔ "ستاروں پر یقین رکھتی ہوں؟"

ج۔ "ستاروں پر اس حد تک یقین ہے کہ جب آسمان کی طرف دیکھوں اور کوئی چمکتا دمکتا تارا مل جائے تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ وہ میرے دادا مرحوم یا میری مرحوم بہن ہے تو بس پھر ان سے گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہوں (اداسی)"

س۔ "ایک بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟"

ج۔ "آپی! سچی بتاؤں تو میری ذہن میں اب سے دو سال پہلے تک کوئی بات نہیں تھی مطلب دوسروں کی باتوں کو اگنور کرنا روتے کو ہنسانا اور سوتے کو اٹھانا (تنگ کرنا) یہ میرا کام تھا لیکن پتا نہیں کیوں لوگوں کو اس کڑی کی خوشی ہضم نہ ہوئی۔ وہ جیسے کہتے ہیں نہ کہ قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے، اسی طرح نہ چاہتے ہوئے بھی ٹینشن میرے دماغ میں ایسے رچ گئی ہے جیسے میں اس کا پہلا "عشق ہوں۔ کبھی موقع ملا تو بتاؤں گی سب کو۔"

س۔ "زندگی کے دشوار لمحات؟"

ج۔ "الحمدللہ ایسا کوئی لمحہ نہیں آیا۔ ایک واقعہ بتاؤں آج سے دو سال پہلے ہم نے اوپر نیا مکان ڈالا۔ اکیڈمی سے واپس آ کر سب سے اوپر والی چھت پر گئی۔ ہوش گم ہو گئے اور ٹھاہ نیچے گر گئی (ہاہاہا) جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ (پانچ ٹانکے سر پر اور تین گھٹنے پر لگے۔ معذرت کے ساتھ لاسٹ پہ آ کے اداس ہو گئی۔)"

س۔ "کوئی آخری بات؟"

ج۔ "اگر کوئی لڑکی کسی محفل کی رونق ہو یا وہ چہرے پر مسکراہٹ رکھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ غم اور دکھوں سے آزاد ہے تو کائنڈلی کسی کا دل نہ دکھاؤ اور اس سے حسد نہ کرو۔ اور کھاتے وقت مینوں (معصوم) کو یاد رکھنا (ہی ہی) تو سب بتانا کہ آپ کو کیسا لگا مجھ سے مل کر؟"

☆☆

ایمن رضا

تاش گھر

پچھلی اقساط کا خلاصہ:

چاند بی بی ایک عمر رسیدہ اور سر سے گنجی خاتون ہے۔ ۴۷ء کے بٹوارے میں چاند کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے۔ چاند کے ابو دین بابا، بھائی بستام، تین پھوپھیاں، ان کی چھ بیٹیاں اور گھر کا ملازم لڑکا رحبان...... اس خاندان کو حویلیاں شہر میں ایک "لکشمی حویلی" الاٹ ہوتی ہے۔ جس کا نام وہ بدل کر "دین حویلی" رکھ لیتے ہیں۔ ایک رات چاند کو حویلی کی دہلیز پر ایک بچی ٹوکری میں پڑی ہوئی ملتی ہے۔ دین بابا کی مخالفت کے باوجود چاند اپنے منگیتر التمش کی اجازت سے اس بچی کو گود لے لیتی ہے اور اس بچی کا نام صندل رکھتی ہے۔

رحبان یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند کی شادی بہت جلد التمش سے ہونے والی ہے دن بدن چاند کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن وہ چاند سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ چاند رحبان سے کہتی ہے کہ وہ صرف التمش سے محبت کرتی ہے۔ رحبان کے دل میں التمش کے لیے نفرت بڑھنے لگتی ہے۔ بستام کے مشورے پر رحبان، التمش کو قتل کر دیتا ہے اور دین بابا سے چاند کا ہاتھ مانگتا ہے۔ دین بابا کی التجاء پر چاند رحبان کے رشتے کو منظور کرتے ہوئے شادی کی رضامندی دے دیتی ہے۔ لیکن پھر کسی وجہ سے یہ شادی نہیں ہو پاتی......

۱۹۷۲ء...... اب بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور صندل سمیت گھر کی باقی لڑکیاں بھی جوان ہو چکی ہے۔ صندل ان سب میں سب سے زیادہ شرارتی ہے۔ عیدگاہ میں انھیں دو خواتین کو صندل کے بارے میں "ناجائز" کا لفظ بولتے ہوئے سنتی ہے تو اُسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

میرزاد اور زویا دونوں بہن بھائی ہیں۔ اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے زویا کو خویلیاں شہر میں اپنے بھائی کے ساتھ آنا پڑا ہے۔ ان کا قیام عارضی ہے۔ اس عارضی قیام میں میرزاد کی ملاقات صندل سے ہوتی ہے۔ صندل میرزاد کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتی ہے۔

ساتویں قسط

چاند آج بہت دنوں کے بعد کام والے کمرے میں آئی تھی۔ کچھ گزشتہ رمضان کی مصروفیت، پھر عید کی تیاری، اور پھر عید کے دنوں میں ہونے والے تھکن کو زائل کرنے میں نکلتے دن...... اوپر سے کاریگر بھی لمبی لمبی چھٹی پر تھے۔ کچھ بیوی بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو نکل گئے تھے اور کچھ میدانوں کی طرف...... عید کے
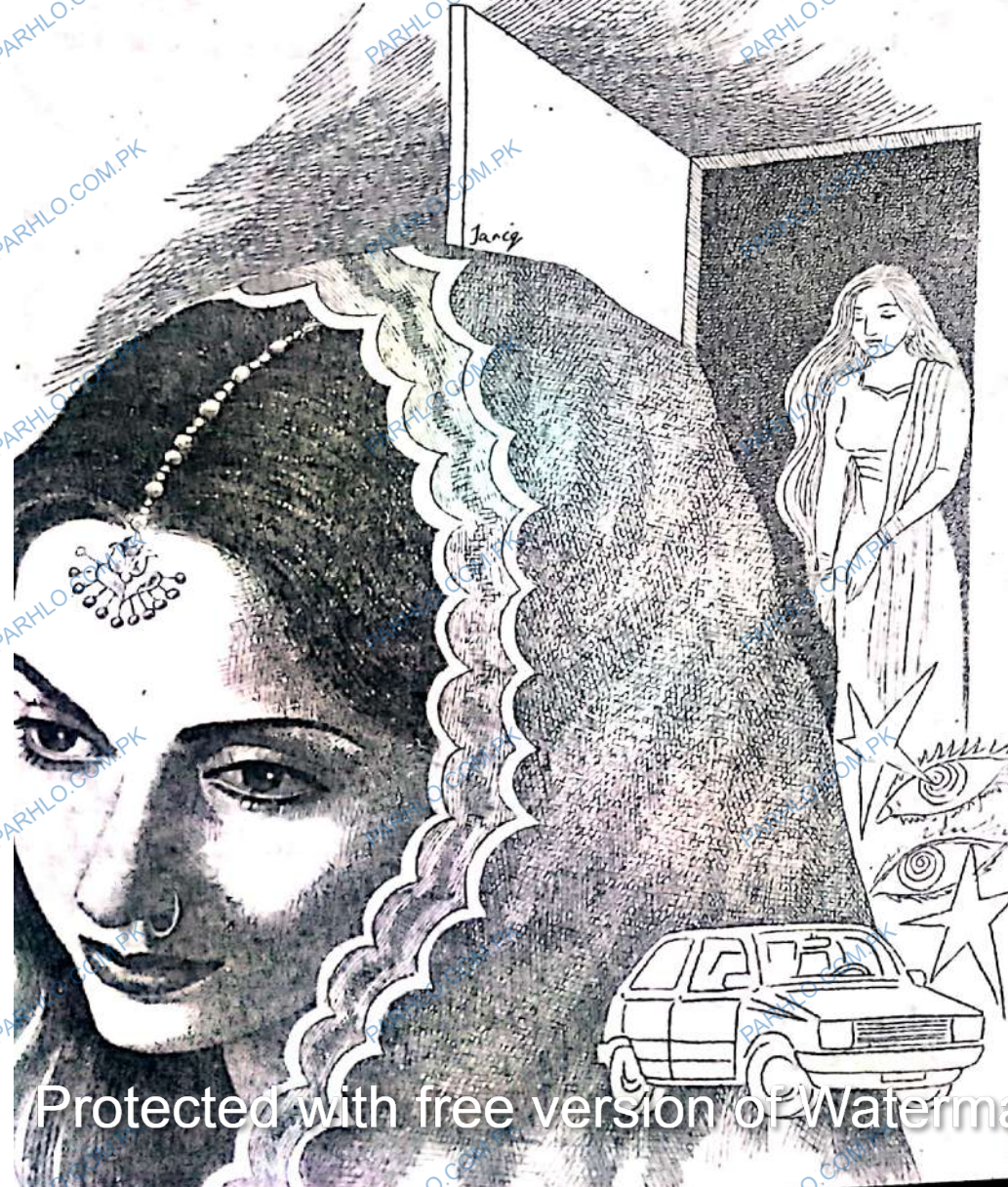
تقریباً دو ہفتے کے بعد کام پھر سے معمول پر آیا تھا۔ سارے چوکھٹوں پر بہت تیزی سے "آر" چل رہی تھی۔ کاریگر عورتیں اور مرد دل جمعی سے کام کرنے میں مصروف تھے۔ چاند سارے کام کا جائزہ لیتے ہوئے سب کا کام پرکھ رہی تھی۔ بستامی نے کہا تھا کہ مارکیٹ میں ہمارے کام کی ساکھ بہت گر چکی ہے۔ اس لیے ساکھ بحال کرنے کے لیے کام میں نفاست لانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اب چاند کام کی بہت باریک بینی سے پرکھ کر کے ہی اسے پاس کیا کرتی تھی۔

وہ سارے کام کا جائزہ لے رہی تھی جب اس کی نظریں کسی چیز پر جا کر رکی تھیں۔

"یہ...... یہ چمک کس چیز کی ہے۔" اس نے چوکھٹے پر کسے ہوئے کپڑے پر پڑے نگینوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اشارے پر چوکھٹے کے دائیں بائیں بیٹھے سب ہی کاریگروں نے کسے ہوئے کپڑے پر پڑے چمڑے کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھا، جس پر نگینے اور موتی پڑے ہوئے تھے اور کاریگر وہاں سے ہی موتی نگینے اٹھا اٹھا کر لباس پر جڑتے جاتے تھے۔

"اس بار مال بہت خراب آیا ہے۔ نگینے چھوٹے بڑے تھے۔ بہت سے نگینوں کے اندر تو سوراخ ہی نہیں تھے۔ وہ سب بیکار گئے ہیں۔" کاریگر نے بتایا تھا۔

چاند نے تو جیسے کاریگر کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس کی توجہ تو ان نگینوں کے درمیان پڑے ایک نگینے کی چمک نے اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔ جس کی چمک اسے نیم اندھیرے کمرے میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑ کر پرکھنے سے اسے پتا چلا تھا کہ اس نگینے کے اندر بھی سوراخ نہیں ہے۔ لیکن وہ بیکار نہیں تھا۔ نجانے کیوں چاند کو اس کی چمک کچھ اجنبی سی لگی۔ کچھ اچھوتی سی...... ایسی چمک باقی نگینوں کی نہیں ہوا کرتی تھی۔ اسے تو سالوں گزر چکے تھے یہ کام کرتے ہوئے۔ ہر طرح کے اور ہر رنگ کے نگینے، موتی اس نے دیکھے تھے۔ کسی کی بھی چمک ایسی نہیں تھی جو اس نگینے کی تھی۔

"نیا مال کہاں ہے۔؟"

"وہ کونے میں بوری میں پڑا ہے۔"

"بوری کھول کر یہاں پر الٹ دیں۔"

"جی بہتر......" کاریگر نے کہا اور پھر کونے میں پڑی بوری کو لا کر چاند امی کے سامنے قالین پر الٹ دیا۔ سارے نگینے قالین پر بکھر گئے تھے۔

کاریگر ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مال اس بار بہت خراب آیا تھا۔ دکان دار نے سچے نگینوں کے ساتھ خراب نگینے بھی تول دیے تھے۔ لیکن چاند فی الحال اس رخ پر نہیں سوچ رہی تھی۔ یہ باتیں معمول کی تھیں اور کام کا حصہ تھیں۔ ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ چاند کو تو اپنے ہاتھ میں پکڑے نگینے جیسے مزید نگینے نکل آنے کی امید تھی۔ اسی امید پر وہ سارے نگینوں کی پرکھ کر رہی تھی۔ محنت رنگ لائی تھی۔ ویسے ہی تین مزید نگینے اسے مل گئے تھے۔ سفید نگینے...... جو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے چاند کی مٹی سے بنے ہوں۔ یا جیسے بنانے والے نے انہیں چاند کی چودھویں کی روشنی ادھار لے کر بنایا ہو۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔؟" خاتون کاریگر نے پوچھا تھا۔

"مجھے یہ نگینے پسند آ رہے ہیں۔ میں انہیں انگوٹھیوں میں جڑواؤں گی۔"

"لیکن یہ تو بہت کم قیمت ہیں۔ اور مصنوعی بھی......"

"ہاں...... لیکن ان کی چمک بہت قیمتی ہے۔" چاند نے کہا تھا۔ ملازمہ مسکرا کر پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ چاروں سفید نگینے لے کر چاند کمرے سے باہر نکل رہی تھی جب بستامی سے اس کا سامنا

ہوا تھا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے چاند......" ہتھیلی پر پھیلے نگینوں کو دیکھتے ہوئے وہ خوش ہو رہی تھی جب بستامی کی وہاں نظر پڑی تھی۔ اس بارے میں بستامی کا پوچھنا بے اختیاری تھا۔

"یہ کچھ نگینے ہیں۔ مال میں سے ملے ہیں۔ مجھے اچھے لگے تو میں نے رکھ لیے......"

"تم ان بیکار نگینوں کا کیا کرو گی بھلا......"

"میں انہیں انگوٹھیوں میں جڑوانے کا سوچ رہی ہوں۔"

چاند کی بات پر بستامی نے کچھ غور طلب نظروں سے نگینوں کو دیکھا۔ ایسا کیا تھا ان میں کہ چاند انہیں سنبھالے سنبھالے پھر رہی تھی۔

چاند نے اپنی ہتھیلی بستامی کی نظروں کے سامنے کی۔ بستامی نے چار چمچماتے نگینوں کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کی چمک تو لاجواب تھی۔

"دکھاؤ ذرا مجھے......" بستامی نے چاروں نگینوں کو چاند کے ہاتھ سے لے کر اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر دیکھا۔ کچھ تو خاص تھا ان میں...... ان کی چمک چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ عام نہیں ہیں۔

"کیا تمہیں یہ چاندی کی انگوٹھیوں میں چاہییں۔؟"

"ہاں...... چاندی میں ہی اچھے لگیں گے۔ کیونکہ سفید ہیں۔ سونے میں تو اچھے نہیں لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں لائل پور جا رہا ہوں۔ میں تمہارا یہ کام بھی کرتا آؤں گا۔" بستامی نے خوش دلی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

بستامی نے چاروں نگینے اپنی جیب میں ڈال لیے تھے اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ چاند حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔ بستامی کے نرم رویے پر اسے حیرت ہوئی تھی کہ یہ کیوں آج اتنے مشفقانہ انداز میں پیش آیا ہے۔ بستامی کے چہرے پر مسکراہٹ آئے کتنا عرصہ گزر چکا تھا یہ خود اب چاند کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

"مجھے یہ نگینے نقلی نہیں لگتے بستامی......" روشن بیگم نے ان روشن نگینوں کو بغور پرکھتے ہوئے کہا۔ اس کی جہاندیدہ آنکھوں نے بھانپ لیا تھا کہ بستامی اس کے پاس کس قدر قیمتی مال لایا ہے۔

"تو پھر...... یہ کیا ہے۔؟"

"ہیرے...... اصلی ہیرے......" روشن بیگم نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید بڑا کرتے ہوئے بتایا۔ ان آنکھوں نے اصلی ہیرے بہت بار دیکھے ہوئے تھے۔ وہ تو اندھیرے میں بھی ہیروں کو پہچان سکتی تھی۔ یہ چاروں نگینے بھی اسے ہیرے ہی لگ رہے تھے جسے بستامی محض شک کی بنا پر اس کے پاس لے آیا تھا۔

"کیا سچ میں......؟" بستامی بھلا اس کی بات پر کیسے یقین کرتا۔

"ہاں...... مجھے شک ہے کہ یہ ہیرے ہیں۔ کہاں سے ملے تمہیں......؟" روشن بیگم کے کھنکتے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے زیور کنگن بھی کھنکے تھے۔

"بس مل گئے کہیں سے...... سمجھو راہ چلتے ملے ہیں۔"

"راہ چلتے ایسی چیز مل جائے تو وہ اشارہ ہے کہ اب زندگی بدلنے والی ہے۔" وہ مسکرائی۔ "اور اگر یہ ہیرے نکلے تو میں اپنا حصہ ضرور لوں گی۔" اور روشن بیگم کی ایک یہ خوبی تھی کہ بات تو ہر وقت پیسوں کی کرتی تھی لیکن کبھی لالچی نہ لگی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے پتا تو چلے کہ یہ اصلی ہیرے ہیں یا نہیں......"

"فکر مت کرو...... یہ ہیرے ہی ہیں۔ میری تیکھی آنکھوں نے ان کے اندر کی کنی کو دیکھ لیا ہے۔" روشن بیگم ہنستے ہوئے بولی۔

اتنے سالوں کے بعد بھی اس کی مسکراہٹ اور ہنسی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ یہ مسکراہٹ اور ہنسی ہی تو تھی جس نے سالوں گزر جانے اور عمر میں بہت آگے نکل جانے کے باوجود اس کا روپ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ بڑھاپے میں بھی روشن بیگم میں نوجوان لڑکیوں جیسی ادائیں تھیں۔ اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ یہ عورت اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ کھا چکی ہے۔

"لیکن میں تمہاری تسلی کے لیے سنار کو بلاتی ہوں۔ وہ بتادے گا ان کے بارے میں...... اور ان کی اصل قیمت بھی......"

"ہاں...... بلاؤ...... اگر یہ اصلی ہیں بھی تو ان کی قیمت کا تو پتا چلے۔"

"رحمو...... اوہ رحمو...... کہاں ہو تم......" روشن بیگم نے رحمو کو آواز دی تھی۔ اگلے ہی لمحے رحمو وہاں پر حاضر ہوا۔

"جی مالکن......"

"یہ نکڑ والی دکان سے بابا کریم کو بلا کر لاؤ...... انہیں کہ روشن بیگم نے بلایا ہے۔ سارے کام دھندے چھوڑ کر فوراً سے آئے۔"

"جی بہتر......"

"اور سنو...... اس سے کہنا اپنا عدسہ بھی ساتھ لیتا آئے۔ ہیروں کی پرکھ کرنی ہے۔"

"جی کہتا ہوں۔"

حکم سن کر رحمو وہاں سے چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی واپسی بابا کریم کے ساتھ ہوئی تھی۔ بستامی نے یہ اتنا سا وقت بہت مشکل سے گزارہ تھا۔ عمر رسیدہ بابا کریم بڑھاپے کے باعث کپکپاتے ہاتھوں اور کانپتے جسم کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ روشن بیگم نے نگینے ان کے سامنے کیے تھے۔ جسے بابا کریم اپنے موٹے عدسے سے بہت دیر تک دیکھتے رہے۔ وہ چاروں طرف سے ان کی جانچ کر رہے تھے۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ...... اور بستامی دل تھامے بیٹھا رہا تھا کہ نجانے بابا کریم کیا کہہ دیں۔ کہیں وہ یہ ناں کہہ دیں کہ یہ ہیرے نہیں بلکہ نگینے ہی ہیں۔ روشن بیگم نے اسے جو اُمید دلا دی تھی تو وہ چاہتا تھا کہ اب یہ اُمید پوری ہو جائے۔ چار ہیروں کے بدلے میں اسے ایک بڑی رقم ہاتھوں میں آتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"واہ...... بہت خوب......" بابا کریم نے بالآخر نعرہ لگاتے ہوئے بڑی دیر کے بعد کہا۔ بستامی نے ان کی طرف دیکھا۔

"کمال ہی ہو گیا۔"

"کیا ہوا ہے۔؟"

"زندہ کنی والا ہیرا ہے محترم......" بابا کریم نے کہا اور بستامی کی چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ روشن بیگم بھی مسکرائی۔

"یہاں تو مردہ کنی والا ہیرا بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔ آپ تو زندہ کنی والا لے آئے ہیں۔"

"کیا چاروں......؟" بستامی کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ بیٹھے بٹھائے اس کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔

"ٹھہریئے...... دیکھتا ہوں۔" وہ پھر سے عدسے کے ساتھ ہیروں کی پرکھ کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

"جی چاروں...... اصلی ہیرے ہیں۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ بہت نایاب ہیں۔ لیکن منڈی میں اچھی قیمت مل جائے گی ان کی......"

"اندازاً کتنی......؟"

"دو سے تین لاکھ تک تو مل ہی جائے گی۔"

"کیا......؟؟ دو تین لاکھ......؟؟؟" بستامی کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ چاند سے کیا چیز حاصل کر لی تھی اس نے......

"اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے۔"

"آپ کتنی دے سکتے ہیں۔؟" روشن بیگم اصل بات پر آئی تھی۔

"تین لاکھ......" بابا کریم نے کہا تھا۔ بستامی اور روشن بیگم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

"منظور ہے۔" بستامی نے آمادگی دے دی۔

"ٹھیک ہے۔ اپنا ملازم ساتھ بھیج دیجیے۔ میں دکان سے پیسے دے دیتا ہوں اس کو......" بابا کریم نے چاروں ہیرے اپنی قمیص کے نیچے شلوار کی جیب میں ڈال لیے تھے۔

"رحمو...... اور رحمو...... تم بابا کریم کے ساتھ جاؤ...... یہ تمہیں تین لاکھ کی رقم دیں گے وہ احتیاط کے ساتھ لے آؤ......"

"جی اچھا مالکن......"

رحمو اور بابا کریم کوٹھے سے نیچے اُتر گئے تھے۔ اور تب ہی بستامی اور روشن بیگم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے دونوں کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔ اور دونوں نجانے کتنی ہی دیر تک ہنستے رہے تھے۔

☆☆☆

کھڑکی کھلی تھی اور سیب کے باغ سے اس کے کچے اور پھلوں کی خوشبو کمرے میں اُتر آئی تھی۔ وہ تو بچپن سے ہی اس خوشبو کو محسوس کرتی چلی آرہی تھی۔ پھر بھی آج اسے بھی یہ خوشبو کہیں زیادہ لگی تھی۔ یا شاید اس خوشبو میں آج اس کا لہجہ گھلا ہوا تھا۔ اس پہاڑی شہزادے کا...... میرزاد کا......

"گلاب کے پھول کے بہت سے مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ سیج پر سجتا ہے۔ قبر پر چڑھتا ہے۔ یہ اظہار تعزیت بھی ہے۔ اظہار عیادت بھی اور اظہار تہنیت بھی...... جبکہ گلاب صرف زندہ لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے...... اظہار محبت......"

صندل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ کیوں کہا تھا۔ اُسے گلاب کی ایسی تعریف نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کم از کم ایک لڑکی کے سامنے تو ہرگز نہیں...... جو گلاب کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نازک جذبات رکھتی ہے۔

"اظہار محبت...... اظہار محبت...... اظہار محبت......" صندل کے دل و دماغ میں یہ ہی فقرہ گونجا جا رہا تھا۔ کاش وہ اس لفظ "اظہار محبت" کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیتا...... لیکن ایک دم سے کیسے اچانک...... ابھی تو ان کی محض دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ بھی واجبی سی...... اتنی کم مدتی ملاقاتوں کے بعد کوئی کسی لڑکی کے لیے محبت تھوڑی نہ محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن صندل نے تو پہلی ہی ملاقات میں اس کے لیے محسوس کر لی تھی۔ پھر اس نے کیوں نہیں کی۔

"رات کے اندھیرے میں کھڑکی سے باہر کیا دیکھ رہی ہو صندل......"

انشیں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میرزاد کو سوچتے ہوئے اپنے چہرے پر پھیلی

مسکراہٹ کو اس نے جلدی سے ختم کیا۔ لیکن افشیں جب ہلکے سے مسکرائی تو صندل کو احساس ہوا کہ وہ اس کے چہرے سے اپنے مطلب کا کچھ تاڑ چکی ہے۔

"سارا دن نظر نہیں آئیں آج تم...... کہاں گم رہی ہو۔"

"یہاں ہی تھی میں...... اپنے کمرے میں......"

"کمرے میں ایسا کیا خزانہ نکل آیا ہے جو تم آج کمرے میں ہی بند رہی ہو۔" افشیں نے ذو معنی انداز میں کہا۔

"بتاؤ...... کام کیا ہے۔؟" اس نے بات بدلی تھی۔

"نیچے بڑے کمرے میں آ جاؤ...... سب وہاں ہی ہیں۔ سردیاں آنے والی ہیں۔ لہٰذا اس کی تیاری کرنی ہے۔ مرونڈا بنانا ہے۔ چک بنانی ہے۔ پنیاں بنانی ہیں۔ اور بھی ہزار کام ہیں جو ایک دو روز میں مکمل ہوں گے۔"

"تم چلو...... میں آتی ہوں۔"

"میرے ساتھ چلنے میں کیا مسئلہ ہے تمہیں......" افشیں نے کہا تو صندل کو احساس ہو گیا کہ وہ ایسے جان نہیں چھوڑنے والی۔ دوپٹا پکڑ کر وہ فوراً سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"چلو...... مرو......"

دونوں نیچے بڑے کمرے میں پہنچیں تو وہاں سب پہلے سے ہی موجود تھے۔ حاجی بوا کمرے کے وسط میں بڑا چولہا رکھے اس میں پنیوں کے لیے چاشنی بنا رہی تھیں۔ کرن اور تعبیر باداموں کو توڑ کر ان کی گریاں الگ کر رہی تھیں۔ زارا کشمش صاف کر رہی تھی اور صاف کرنے سے زیادہ کھا رہی تھی۔ روشنائے اور سارا مونگ پھلیوں کو ہتھیلیوں پر مسل مسل کر ان کے چھلکے اُتار رہی تھیں۔ تہمینہ پھوپھو تھالیوں پر گھی لگا رہی تھیں۔ اور زہرہ اور شکیلہ پھوپھو چاولوں کو پیس رہی تھیں۔

سردیوں کی تیاری کی یہ روایت بہت پرانی تھی۔ سب حویلی کی خواتین یہ کام بہت دل سے کیا کرتی تھیں اور اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں۔ یہ کام ملازموں سے نہیں کروائے جاتے تھے۔ صندل اور افشیں بھی وہاں ہی بیٹھ گئی تھیں۔

"چاند کو نہیں بلایا تم نے افشیں......؟"

"بلایا تھا۔ انہوں نے کہا، انہیں نہیں آنا......"

افشیں نے چاند کا پیغام آگے پہنچا دیا تھا۔ جسے سن کر تہمینہ پھوپھو کو دُکھ ہوا تھا۔ چاند حویلی کی کسی خوشی میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ نجانے کیوں اس نے خود کو اتنا خاموش کر لیا تھا۔ کسی نے چاند کے وہاں نہ آنے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ چاند کا مزاج اچھے سے جانتے تھے۔

جلد ہی حاجی بوا نے چاشنی میں پسے ہوئے چاول ڈال دیے تھے۔ جس نے پورے کمرے میں ایک مدھر سے خوشبو کو پھیلا دیا تھا۔

اسی مدھر خوشبو میں صندل کو پھر سے میرزاد کا لہجہ یاد آیا تھا۔ کتنی خوب صورت سے بولتا تھا وہ...... کوئی اتنا خوبصورت کیسے لگ سکتا ہے۔ یا یہ صندل کی نظر تھی کہ اسے اس میں خوب صورتی خوب صورتی نظر آتی تھی۔

گڑ کی چاشنی میں چاول اچھے سے بھن گئے تو حاجی بوا نے اسے ایک بڑے سے تھال میں اُلٹ دیا تھا اور تہمینہ پھوپھو نے اس میں ڈھیروں خشک میوے ڈال دیے تھے۔

"چلو بھئی لڑکیوں شروع ہو جاؤ......"

"اور زارا تم...... پنیاں بنانی ہیں۔ کھانی نہیں ہیں۔ یاد رہے۔"

صندل نے کہا تو زارا نے منہ بنا کر اسے دیکھا تھا۔ دل تو اس کا کر رہا تھا کہ پنی چھوڑ آج صندل کو ہی کچا چبا جائے۔ جیسے اس کے دانت تھے اور جس قدر اس کا پیٹ تھا وہ ایسا کر بھی سکتی تھی۔

"اور سب نے ایک سائز کی بنانی ہیں۔ اپنے اپنے ہاتھوں کے حساب سے مت بنا دینا...... یہ دیکھو اتنی بنانی ہیں۔" تہمینہ پھوپھو نے ایک پنی بنا کر سب کو دکھائی تھی۔

"سیدھی طرح سے کہہ دیں ناں خالہ...... کہ زارا کی ناک کے سائز کی بنانی ہیں۔" افشیں نے اتنی معصومیت سے کہا تھا کہ سب ہی ہنسی تھیں۔

زارا کو بھی بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ لیکن چونکہ اپنی بے عزتی پر ہنسنا زیادہ بڑی بے عزتی تھی اس لیے وہ گردن نیچے کر کے منہ چھپا کر ہنسی تھی۔

سب پنیاں بنانے میں مصروف ہو گئی تھیں اور حاجی بوا نے بڑے کڑاہے میں اب کے چنے اور گندم ڈال لیا تھا۔ اور اسے بھوننے لگی تھیں۔ یہ مرونڈا بنانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

"آج بھی کوئی قصہ سناؤ بوا...... جیسے آپ نے پہلے سنایا تھا۔ صندل کو گود لینے والا......" کرن نے صندل کو دیکھتے ہوئے بوا سے کہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ پھر سے صندل کے حوالے سے ہی کچھ سنایا جائے۔

"آج تو میں تمہیں اس سے بھی بڑھ کر کچھ سناؤں گی۔ حویلی میں ہونے والا سب سے اہم واقعہ......" حاجی بوا مسکراتے ہوئے، خیالوں ہی خیالوں میں ماضی میں جاتے ہوئے بولی تھیں۔

"ایسا کیا ہوا......"

"چانداور رحبان کی شادی کا قصہ......" کڑاہی میں کرچھا چلاتے ہوئے حاجی بوا نے بم پھوڑا تھا۔

"کیا......" کام سے ہاتھ روک کر سب لڑکیاں مشترکہ چیخی تھیں۔ حاجی بوا کی بات پر انہیں شدید حیرت ہوئی تھی۔ جہاں لڑکیاں حیران تھیں وہی تہمینہ، زہرہ اور شکیلہ نے اچنبھے سے حاجی بوا کو دیکھا تھا۔

"کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں حاجی بوا......" تہمینہ پھوپھو نے آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے حاجی بوا کو کچھ بھی مزید بولنے سے منع کیا تھا۔ لیکن حاجی بوا منع ہونے والی کہاں تھیں۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا...... پھر کیا ہوا۔ کسی غیر سے تھوڑی نہ کر رہی ہوں بات......"

"یہ کب کا واقعہ ہے بوا......؟" صندل سب سے زیادہ حیرت زدہ تھی۔ چاند امی نے آج تک اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

"کوئی بیس سال ادھر کی بات ہے۔"

"کیا سچ میں رحبانی بابا اور چاند امی کی شادی ہوئی تھی۔؟"

"نہیں...... ہوئی نہیں تھی۔ بس...... بات چلی تھی۔"

"حاجی بوا چھوڑ و ان باتوں کو......" زہرہ پھوپھو نے ٹوکا تھا۔ "چاند کو پتا چلا کہ تم صندل سمیت سب کو یہ بات بتا چکی ہو تو وہ ناراض ہو گی۔"

"ارے نہیں ہوتی وہ ناراض...... میں تم سے زیادہ جانتی ہوں اسے......" حاجی بوا کسی کی ماننے والی ہی کہاں تھیں۔ اور اب تو لڑکیاں بھی سننے کے لیے اتاولی ہو گئی تھیں۔

"ہمیں ساری بات جاننا ہے اب......" لڑکیوں نے بے چینی سے کہا تھا۔ خاص کر کے صندل نے......

"تو بتاؤ حاجی بوا...... کیا ہوا تھا۔؟"

اور تہمینہ، زہرہ اور شکیلہ کی تنبیہی نظروں کے باوجود حاجی بوا نے بات سنانے کے لیے اپنا رخ لڑکیوں کی طرف کر لیا تھا۔

''التمش کے مرنے کے بعد چاند تو جیسے خود بھی مر کر رہ گئی تھی۔ بس جسم سے جان نہ نکلی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی...... التمش کو یاد کرتی رہتی۔ نہ کھانے پینے کا ہوش اور نہ لباس کی پروا...... دین بابا سے تو چاند کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ چاند کو دیکھ کر روتے رہتے تھے۔ گھر کے سارے افراد چاند کے حوالے سے فکرمند تھے۔ لیکن جو نقصان ہو چکا تھا اسے کسی طرح پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں ہی چاند کی منت سماجت کر کے اسے تھوڑا بہت کھانا کھلا دیا کرتی تھی۔ یا کچھ کچھ وہ رحبان کی بات مان لیا کرتی تھی۔ سچ یاد آیا۔ تب چاند اور رحبان کی بہت دوستی ہوا کرتی تھی۔ چاند ہر کام رحبان کے ساتھ ہی کیا کرتی تھی۔ اور رحبان بھی چاند کے بنا کچھ نہیں کرتا تھا۔ جو چاند نے کہہ دیا وہ ہی اس کے لیے پتھر پر لکیر ہو گیا۔''

''لیکن اب تو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ چاند امی کی کبھی رحبانی بابا سے دوستی رہی ہے۔ وہ تو ان سے بے حد کم بات چیت کرتی ہیں۔ بہت ہی کم...... صرف ضرورت کی بات چیت......''

صندل کے لیے ماضی کی ہر بات کسی اچنبھے سے کم نہیں تھی۔ چاند امی نے اسے ماضی کے بارے میں کبھی اتنا تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔ وہ سوائے التمش بابا کے اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ماں نے کتنے بڑے بڑے غم دیکھے ہیں۔

''بس وقت وقت کی بات ہے ناں بیٹا...... کبھی دوستی کبھی دشمنی...... کبھی تشنگی کبھی تیرگی......''

''شعر و شاعری بند کرو بوا...... بتاؤ کہ پھر کیا ہوا......؟''

''پھر دین بابا نے سوچا کہ رحبان اور چاند کی شادی کر دیتے ہیں۔ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔ حویلی میں سب کو معلوم تھا کہ چاند شادی کے لیے نہیں مانے گی۔ کیونکہ وہ التمش کے نام کی بیوہ رہنے کی قسم کھا چکی تھی۔ لیکن وہ رحبان سے شادی کرنے کے لیے مان گئی۔ دین بابا نے اسے راضی کر لیا۔''

''ہائے اللہ! شادی کے لیے راضی ہو گئیں پھر بھی شادی نہیں ہو سکی۔''

زارا اپنے منہ میں بڑی سی پنی ڈالتے ہوئے بولی۔ جو ڈکار کی صورت اس کے حلق کے نیچے اتری تھی۔ لڑکیاں کہانی سننے میں اتنی مگن تھیں کہ زارا کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہی تھیں۔

''پھر دونوں کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ ایک بار پھر سے حویلی میں چاند کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چاند بھی بہت خوش اور رحبان کی خوشی کے تو کیا ہی کہنے۔ لڑکیوں سے زیادہ شرماتا تھا تب...... بات بات پر منہ لال ہو جاتا تھا اس کا...... کیوں تہمینہ...... یاد ہے تمہیں وہ دن......''

''جی......'' تہمینہ نے ہلکے سے کہا تھا۔ انہیں حاجی بوا کا لڑکیوں کو یہ سب بتانا پسند نہیں آ رہا تھا۔

''پھر بارات کا دن آ پہنچا۔ نکاح کا وقت ہو گیا۔ سب مہمان بھی آ گئے۔ چاند دلہن بن گئی اور رحبان دلہا بن گیا۔ لیکن......''

''لیکن کیا......''

''لیکن اسی وقت دین بابا کی موت ہو گئی اور یہ شادی نہ ہو سکی۔''

''دین بابا کی موت کیسے ہو گئی......؟'' صندل نے بے اختیار ہو کر پوچھا تھا۔ حاجی بوا لمحے بھر کو گڑبڑا گئی تھیں۔

''کیسے ہوئی تھی کیا مطلب...... جیسے موت ہوتی ہے۔ سانس بند اور زندگی ختم...... موت وقت تھوڑی نہ دیکھتی ہے۔'' حاجی بوا نے جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے بات بنائی تھی۔

''لیکن پھر موت کے سوگ کے بعد بھی یہ شادی کیوں نہ ہو سکی۔؟''

''پھر چاند نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔''

''کیوں......؟'' ساری لڑکیوں نے پھر سے حیرت سے پوچھا تھا۔ ساری بات سننے کے باوجود بھی

انہیں جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ حاجی بوا کیا بتا رہی تھیں انہیں اور کیا چھپا رہی تھیں۔

''پتا نہیں کیوں...... بہت پوچھا چاند سے...... بہت سمجھایا بھی...... لیکن چاند نے یہی کہہ دیا کہ اب بس وہ التمش کے نام پر ہی زندگی گزارے گی۔'' حاجی بوا نے پھر سے پانی پیا تھا اور پھر چاند کی بات کو ٹالتے ہوئے بات بنائی تھی۔ صندل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ اس کی ماں نے کتنے دکھ دیکھے تھے چھوٹی سی عمر میں......

''چلو لڑکیوں...... بنیاں بن گئی ہیں تو اب کچک کی تیاری کرو......'' تہمینہ نے بات بدلنے کی غرض سے زوردار آواز میں کہا تھا۔ لڑکیاں ماضی کی اداسی سے واپس آتے ہوئے کچھ ایسی چپ چپ تھیں کہ ان کی ہاں بھی نہیں کہہ سکی تھیں۔

ماضی...... جو ہمیشہ سے ہی دردناک رہا ہے۔ اداس اور دکھ بھرا......

''میں ضرور پتا کر کے چھوڑوں گی کہ چاند امی نے رحبانی بابا سے شادی کیوں نہیں کی تھی۔'' تھال کے اوپر سفید کپڑا ڈال کر انہیں ڈھکتے ہوئے صندل نے دل ہی دل میں تہیہ کیا تھا۔

☆☆☆

سرخ حویلی میں صبح بہت جوبن سے نمودار ہوتی تھی۔ حویلی سب سے اونچے ٹیلے پر تعمیر تھی۔ اس لیے بنا کسی سائے کے سورج اپنی کمال روشنی سے حویلی کو منور کیا کرتا تھا۔ حویلی کے وسط کا صحن اس قدر بڑا تھا کہ دھوپ وہاں سے دالانوں اور ہر ہر کمرے میں بڑی فیاضی سے گزرتی تھی۔ چاند کو صبح کا یہ منظر بہت پسند تھا۔ وہ دالان میں بیٹھ جایا کرتی تھی اور دھوپ کے کم سے زیادہ ہوتے سفر کو دیکھا کرتی تھی۔ اسے ویسے بھی صبح جلدی اٹھ جانے کی عادت تھی۔ وہ صبح ہی صبح اٹھ کر اپنے کام کا آغاز کر دیا کرتی تھی۔

آج بھی وہ دالان میں بیٹھی اوپر آسمان کو دیکھ رہی تھی جب حویلی کا چھوٹا دروازہ کھلا تھا اور بستامی اور رحبانی اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں کل لائلپور گئے تھے۔ ان کی واپسی آج صبح ہوئی تھی۔

رحبانی تو چاند پر ایک غلط نظر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا جب کہ بستامی چلتا ہوا چاند کے پاس آیا تھا۔

''چاند......''

''جی بھائی......''

''یہ لو تمہاری چاندی انگوٹھیاں......'' بستامی نے کہتے ہوئے اپنی جیب میں سے چار انگوٹھیوں کی مخملی ڈبیہ نکال کر چاند کے سامنے کی تھیں۔

''میں نے انہیں سفید سونے میں جڑوا دیا ہے۔ چاندی کو تو اب کوئی پسند نہیں کرتا......''

''شکریہ بھائی......'' چاند امی نے کہتے ہوئے جلدی سے انگوٹھیاں پکڑ کر انہیں دیکھا تھا۔ بستامی مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ چاند نے انگوٹھیاں دیکھی تھیں اور نجانے کیوں اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ وہ نگینے جو بہت زیادہ چمک دے رہے تھے۔ انگوٹھیوں میں جڑ کر کچھ پھیکے پھیکے سے لگنے لگے تھے۔ چاند نے انہیں دوپٹے کے پلو سے رگڑا تھا۔ لیکن بات نہیں بنی تھی۔ انگوٹھیوں میں جڑتے ہی نگینوں کی چمک جیسے ماند پڑ گئی تھی۔

''یہ کیسے عجیب بے رنگ سے دکھنے لگے ہیں۔'' انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ہی نگینے ہیں جو اس نے کام والے کمرے میں دیکھے تھے اور انہیں دیکھ کر وہ دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ یہ تو بہت مصنوعی لگ رہے تھے۔

بے چاری چاند امی نہیں جانتی تھی کہ جنہیں وہ نگینے سمجھ رہی تھی وہ بھی کنی کے ہیرے تھے جنہیں بستامی نے

بیچ کر رقم اپنی جیب میں ڈال لی تھی اور اسے جھوٹے نگینوں کی چار انگوٹھیاں لا دی تھیں۔

کشمکش کی سی حالت میں وہ کمرے میں آئی تھی۔ اس نے چاروں انگوٹھیاں چاروں بڑی لڑکیوں کے لیے بنوائی تھیں۔ لیکن انگوٹھیاں بن کر اتنی کم قیمت کی لگ رہی تھی کہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ ان میں سے کسی کو بھی نہیں دے گی۔ اس کا دل بجھ گیا تھا اس لیے وہ اس نے بنا صندل کو دکھائے اپنی الماری میں رکھ لی تھیں۔

''چاند امی......'' صندل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کو پکارا تھا۔

''ہاں...... بولو میری جان......'' الماری بند کر کے وہ پلٹی تھی۔

''میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ آپ کے ہاتھوں کا مساج کروانا ہے۔''

''کیوں نہیں میری جان...... ابھی کر دیتی ہوں اپنی بیٹی کو...... بیٹھو......'' چاند کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور اسے نیچے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ صندل نیچے بیٹھ گئی تھی۔ سر پر خوشبو والا تیل ڈالتے ہوئے چاند ہلکے ہاتھوں سے اس کے سر کی مالش کرنے لگی تھی۔ صندل نے چند لمحے سوچ بچار کی تھی۔ پھر اصل بات پر آئی تھی جو کرنے کے لیے وہ کل سے پر تول رہی تھی۔

''چاند امی...... کیا میں گھر میں کسی کو بلا سکتی ہوں۔؟''

''کس کو بلانا ہے تمہیں......؟''

''اپنی دوست کو......''

''کون سی دوست......''

''زویا...... وہ آگے جا کر سفید رنگ کی کوٹھی ہے اس کی...... جہاں سے میں آپ کے لیے پھول توڑ کر لاتی رہی ہوں۔''

''کیا وہ اکیلی آئے گی۔؟''

''نہیں...... وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئے گی۔''

صندل کی بات پر اس کے سر پر مالش کرتے چاند کے ہاتھ رک گئے تھے۔

''اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ وہ یہاں بس اپنے بھائی کے ساتھ ہی رہ رہی ہے۔''

''تو دراصل تمہیں سر میں درد نہیں تھا۔ تم نے یہ بات کرنے کے لیے ماحول کو خوش گوار بنایا ہے۔''

چاند کی بات پر صندل بے اختیار ہو کر ہنس پڑی تھی۔

''آپ نے میری چوری پکڑ لی ہے۔''

''ظاہر ہے۔ اولاد ہو تم میری...... مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتی ہو تم...... تمہیں کوکھ سے پیدا نہیں کیا میں نے...... لیکن وجود میں اُتارا ضرور ہے۔''

''تو پھر میں انہیں کس دن بلاؤں۔؟''

''جس دن تمہارا دل کرے۔''

''کل......؟'' وہ اپنی بے چینی چھپا نہیں سکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' چاند نے مسکراتے ہوئے رضامندی دے دی تھی اور وہ پھر سے رخ بدل کر اپنے سر کی مالش کروانے لگی تھی۔ اور سوچنے لگی تھی کہ کل وہ میرزاد اور زویا کے استقبال کے لیے کیا کیا کرے گی۔ کیا کیا کھانے پکائے گی۔ دوسری طرف چاند صندل کی بات پر بے چین ہو چکی تھی۔ جسے انہوں نے فی الحال صندل پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ کل نئے مہمانوں سے مل کر ہی کچھ فیصلہ کر سکتی تھی۔

''کل حاجی بوا نے بتایا کہ آپ کی شادی ایک بار حبانی بابا سے بھی ہونے جا رہی تھی۔'' صندل کی بات پر چاند کے ہاتھ ایک بار پھر سے رُک گئے تھے۔

''حاجی بوا کو تو میں پوچھتی ہوں۔ نجانے کیا کیا بتاتی رہتی ہیں تم لڑکیوں کو......''

''اب تو وہ بتا چکی ہیں ہمیں......''

''اچھی بات ہے۔''

چاند کا مزید اس موضوع پر بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کپڑے سے اپنے ہاتھ صاف کرنے لگی تھی۔

''یہ شادی کیوں نہیں ہو سکی تھی چاند امی......''

''حاجی بوا نے تمہیں کیا بتایا ہے۔؟''

''انہوں نے تو کچھ بتایا ہی نہیں......''

''پھر مجھ سے بھی مت پوچھو......''

''لیکن......''

''بس صندل......'' چاند نے اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے اسے مزید بولنے سے منع کیا تھا۔

''دوبارہ پھر کبھی اس موضوع پر بات مت کرنا......''

اور صندل نے چاند کا اتنا سخت انداز زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا پھیلنا لازمی تھا۔ چاند کو بھی احساس ہوا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی سختی سے پیش آئی ہے۔ شرمندگی چھپانے کے لیے وہ جلدی سے کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اور صندل کو احساس ہوا تھا کہ اس بات میں یقیناً کوئی راز ہے۔ کوئی بہت ہی بڑا راز...... جس نے اس کی ماں کی زندگی برباد کر دی ہے۔ اور جس کا پتا اب اس نے لگا کر ہی چھوڑنا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ)

جویریہ مریم

زندگی زندہ دلی کا نام ہے

اس نے گھر میں قدم رکھا تو معمول کے برعکس ہر طرف خاموشی تھی۔

”ہیں؟...... سب کدھر غائب ہیں۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہتا دادو کے کمرے کی طرف بڑھا تھا جو بھائیں، بھائیں کر رہا تھا۔

”رمشا!“ باہر نکل کر اس نے بلند آواز میں رمشا کو پکارا تھا۔

”کیا آفت آ گئی ہے؟“ وہ اوپر کے پورشن سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

”یہاں نیچے کے پورشن سے ساری آفتیں کہاں غائب ہیں؟ نہ دادو، نہ تائی اماں اور نہ ہی وہ سب سے بڑی آفت زوہا۔ تایا تو ابھی نکلتے دیکھے ہیں خیر میں نے اس ویران کدے سے۔“ اس نے پیٹ پہ ہاتھ پھیرتے جھنجلا کر استفسار کیا تھا۔

”دادو اور تائی اماں بڑی پھوپھو کی طرف گئی ہیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔ یعنی بڑی پھوپھو کی۔ اور زوہا تو ابھی دس منٹ پہلے اوپر سے نیچے آئی ہے، اپنے روم میں ہوگی۔ اور ویسے بھی تم دونوں کی تو لاسٹ منتھ جو پانی پت کی لڑائی ہوئی تھی، میرے خیال میں اس کے بعد سے بول چال بند ہے۔ تمہارے آفس سے واپسی کا ٹائم تھا، یہ اسی لیے زوہا نیچے آئی تھی جناب!“ رمشا نے مسکراتے ہوئے جتایا تھا۔

”کھانا کیا بنایا ہے؟ کسی دال کا نام لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

وہ انگلی اٹھا کر بولا تو رمشا کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ اور اس کی ہنسی کی آواز سن کر ہی زوہا کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ عثمان نے جھٹ سے پلٹ کر دیکھا تو زوہا نے چہرے پہ گمبھیر سنجیدگی طاری کر لی۔

”جناب! آج امی جان نے ابو جان کی فرمائش پر چنے کی دال پکائی ہے۔“ رمشا نے ہنسی روک کر بتایا تو وہ کھا جانے والی نظروں سے رمشا کو گھور کے رہ گیا تھا۔

”اور ہمارے کچن میں کسی کے جہنم نما پیٹ کی آگ سرد کرنے کے لیے کھانا فالتو نہیں ہے۔“ زوہا جھٹ سے بولی تھی۔

عثمان بے بسی کے عالم میں اپنے پیٹ کو تھامے حالت رکوع میں جانے کو تھا۔ تب ہی تایا کی آمد ہوئی تھی وہاں، اور عثمان کے چہرے پر امید کے جگنو چمکنے لگے تھے۔

”میرا خیال ہے۔ پہلے کھانا کھا لیا جائے پھر جا کر دوستوں کی بیٹھک میں بیٹھوں گا۔“ تایا اسے دیکھ کر بشاشت سے مسکرائے تھے۔ عثمان کی تو جیسے عید ہو گئی تھی۔

”جی، جی...... بالکل...... تایا جان...... میرا بھی یہی خیال ہے۔“

رمشا اپنی مسکراہٹ دباتی اوپر کے پورشن میں چلی گئی تھی اور زوہا خون کے گھونٹ بھرتی کچن میں۔ اور عثمان ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کی دعا بلند آواز میں پڑھتا ٹیبل پہ آ گیا تھا۔

”مجھے پتا تھا کہ تمہارے ہاں چنے کی دال پکی ہے اور اماں جان اور تمہاری تائی کی غیر موجودگی میں زوہا تمہیں کچن میں جھانکنے بھی نہیں دے گی۔ اس لیے ترس آ گیا تم پر۔“ تایا نے سرگوشی میں بتایا تو کھسیا سا گیا تھا وہ۔

زوہا نے کوفتوں کا ڈونگا ٹیبل پر پٹخنے کے انداز میں رکھا تھا۔ اور اسے کن انکھیوں سے گھورتی پانی لینے چلی گئی۔

وہ ڈھٹائی سے مسکرا کر خوشبو اپنی اندر اتارتا رغبت سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ تایا مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

”وہ...... رمشا! اس ماہ کا کرن پڑھ لیا ہے تم نے؟“ وہ شعاع ہاتھ میں لیے دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھتی لاؤنج کے صوفے میں دھنسی رمشا کے سر پر جا پہنچی تھی۔ رمشا جو کرن رسالے میں مکمل غرق ہوئی بری طرح چونکی تھی اس کی آواز سن کر۔

”آں...... کیا کہا...... میں ام طیفور کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ سنائی ہی نہ دی تمہاری کوئی بات۔“

عثمان جو ان رسالوں کے سخت خلاف تھا بھنا گیا ان دونوں کی دیوانگی دیکھ کر۔

”زوہا! یہ تم نے کس فضول چیز کے شوق میں ڈال دیا ہے اپنے ساتھ رمشا کو بھی۔ دماغ خراب کرنے کے علاوہ کوئی اور دوسرا فائدہ نہیں ہے ان ڈائجسٹوں کا۔ برائے مہربانی آئندہ رمشا کو مت دینا یہ پڑھنے کے لیے۔ تم خود تو انتہا کی ضدی ہو مانو گی نہیں۔“

زوہا نے ہکا بکا ہو کر عثمان کی طرف دیکھا تھا۔ رمشا شرم سار سی ہو گئی تھی۔

”کیا فرمایا محترم! میں نے لگایا رمشا کو رسالے پڑھنے پر؟ اتنی معصوم اور بھولی نہیں ہے تمہاری بہن۔ مجھ سے بھی پہلے سے چاٹ رہی ہے یہ ان رسالوں کو...... اور فضول چیز کسے کہا ہے تم نے؟ ہاں بولو...... فضول ہو گے تم اور تمہاری فلمیں اور ڈرامے جن میں فضول قسم کے کپڑے پہنتی لڑکیاں ناچتی ہیں۔ اور بڑے شوق سے دیکھتے ہو تم مرد انہیں۔ ہمارے رسالے تو سو درجہ بہتر ہیں اس گھٹیا چکا چوند سے۔“

وہ تو پھٹ ہی پڑی تھی اور عثمان سرخ چہرے سے اسے گھور رہا تھا۔

”بڑی لمبی زبان ہو گئی ہے تمہاری۔“

رمشا بے بسی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری زبان سے تو کم ہی ہے۔ سچی بات کہی ہے میں نے، تمہاری طرح بغیر سوچے سمجھے بے تکی نہیں ہانکی۔“

وہ ہلکا سا چلائی تھی۔ تب ہی چچی آ گئی تھیں وہاں۔

”تم دنوں کا پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔ کبھی تو سکون سے رہ لیا کرو تم دونوں۔“

”آپ کا بیٹا نہیں سکون سے رہنے دیتا چچی، بلاوجہ میرے معاملات میں ٹانگ لڑاتا ہے۔“ وہ رو پڑی تھی۔

عثمان نے لب بھینچ کر اسے روتے دیکھا اور پیر پٹختا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چچی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

”تم کیوں پروا کرتی ہو۔ ایسے ہی چھیڑتا ہے

بس۔"

"چھیڑتا نہیں ہے، میری سلی کہتا ہے یہ۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اسے، بات بے بات انسلٹ کرتا ہے۔ میں بتا رہی ہوں۔ میں اب اسے ڈھیٹ بندے سے کلام نہیں کروں گی اور نہ ہی اپنے کچن پہ دھاوا بولنے دوں گی۔ میرے ہاتھوں کے بنے کھانوں کو تو ایسے حق سے کھاتا ہے جیسے...... جیسے......" اسے مزید کوئی بات نہ سوجھی تو دانت کچکچا کے رہ گئی تھی۔

"جیسے کیا...... کیسے جیسے؟ دروازے سے لگا عثمان دروازہ کھول کر نمودار ہوا تھا، مسکراتا ہوا۔

زوہا نے منہ پھیر لیا تھا اس کی طرف سے اور دھپ دھپ سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی تھی۔

اس کے بعد وہ اپنی بات پر قائم رہی تھی کہ اس سے کلام نہیں کیا تھا۔ مگر کچن پہ دھاوا بولنے سے اسے روک نہ سکی تھی۔ دادو اور امی آ جاتی تھیں بیچ میں۔

"آئے، ہائے...... زوہا اچھا بھلا پتا ہے تمہیں بچہ بے چارہ دالیں نہیں کھاتا اور اوپر والے نگوڑ مارے ہر دوسرے دن دالیں پکائے رکھتے ہیں۔ اپنی پسند کو وہ دیکھتے ہیں میرے بچے کی ناپسند کو نہیں دیکھتے، بچہ ہمارے ہاں رنگا رنگ کھانے، کھانے کو آتا ہے تو تم جلاد بن جاتی ہو بچے کی جان کو۔"

وہ دادو اور امی کے منہ سے یہ سب سن کر کلس کے رہ جاتی تھی۔

☆☆☆

وہ چائے کا کپ لیے ابھی بیڈ پر ٹکی ہی تھی کہ اس کے سیل فون کی بپ بج اٹھی۔ اس نے دیکھا تو عثمان کا میسج تھا۔

میں ہجر ہوں شہر ملال کا میری تنہائیوں کو نہال کر

کبھی بھیج اپنی نوازشیں کسی جام ابر میں ڈھال کر

مجھے خار خار مسافتوں کی ستم گری نے تھکا دیا

مجھے منزلوں کا سراغ دے میرے حوصلوں کو بحال کر

وہ کئی لمحوں تک تو اسکرین پر چمکتے اشعار کو دیکھتی رہی پھر تن فن کرتی اس کے سر پر جا پہنچی تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے یہ؟"

وہ کچن میں اسٹول پہ بیٹھا تھا، سیب میں دانت گاڑے۔ اسے آندھی طوفان کی طرح آتے دیکھ کر چونک سا گیا۔

"محترمہ! یہ بکواس نہیں، صلح نامہ ہے۔ بہت رہ لیے ہم ناراض ایک دوسرے سے۔ بس اب اور نہیں۔ چار دن کی زندگی ہے۔ اسے بھی لڑائی جھگڑوں میں گزار دیں۔ فائدہ کچھ ایسا کرنے کا؟"

اس کی لن ترانی سن کر وہ اسے خون خوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

"لڑائی جھگڑے بلکہ بے تکی بکواس ہمیشہ تمہاری طرف سے ہوتی ہے۔ میں تو ٹھیک سے آج تک تم سے بدلہ بھی نہیں لے پائی، اور تم سارا ملبہ مجھ پہ ڈال رہے ہو؟"

عثمان بے ساختہ ہنسا تھا۔

"میں نے ملبہ تم پر نہیں ہم دونوں پہ ہی آدھا، آدھا ڈالا ہے۔ غور کرو ذرا اس پر جو میں نے ابھی کہا ہے۔"

"مجھے ضرورت نہیں ہے کسی فضولیات پر غور کرنے کی اور تم آئندہ اپنی حد میں رہنا۔ اگر اب مجھے کوئی ایسا ویسا میسج موصول ہوا ناں۔ تو اچھا نہیں ہوگا تمہارے حق میں۔" وہ غرائی تھی۔

"میں اپنی حد میں ہی ہوں مس زوہا اور ایسے ویسے میسج سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اتنا اچھا، رومانٹک میں نے میسج کیا ہے کہ شاید تمہارا دل پسیج جائے۔ ہمارے کچن میں آج پھر دال رونقیں بکھیر رہی ہے اور تم نے مٹر قیمہ اپنے کمرے میں چھپایا ہوا ہے، میں نے خود نے اپنی گنہگار آنکھوں سے تمہیں مٹر قیمے کا ڈونگا کچن سے اپنے روم میں منتقل کرتے دیکھا تھا۔ اور دادو سے کہہ دیا کہ بس اتنا ہی تھا جو سب نے کھا لیا ہے۔ غضب خدا کا کیا ظلم کا بازار گرم کیا جا رہا ہے یہ نیچے والے پورشن میں۔ اور کسی کو کانوں، کان خبر نہیں ہے۔"

زوہا کو ہنسی تو بہت آئی پر وہ ضبط کر گئی۔

"اور اب تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔ اور یہ اتنا اچھا اور رومانٹک میسج ناں اپنی کسی ہونے والی کو کرو۔ سمجھے؟"

عثمان اس کی بات سن کر بشاشت سے مسکرایا تھا۔

"اسے ہی تو کیا تھا یار!"

"کیا، کیا...... کہا ہے تم نے۔" وہ بھپر گئی تھی۔

"میں نے کیا ہے کہ میں نے اتنا اچھا اور رومانٹک میسج اپنی ہونے والی کو ہی کیا تھا ابھی کچھ دیر پہلے۔" اس نے بڑے سکون اور دیدہ دلیری سے اسے بتایا تھا۔

وہ سرخ چہرے سے پتھر ہوئی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتا چپکے سے اس کی سائڈ سے نکل گیا تھا کہ کہیں جھپٹ ہی نہ پڑے وہ طیش میں آ کر۔

☆☆☆

"کل جو تم نے بکواس کی تھی ناں، اگر وہ کسی اور کے سامنے کر دی تو اچھا نہیں ہوگا۔ سمایا کیسے ہے یہ خناس تمہارے دماغ میں؟" وہ جیسے ہی آفس سے واپس آیا زوہا نے اسے گیٹ پر ہی جا لیا تھا۔

"یار! کیا بتاؤں۔ مجھے تو خود پتا نہیں چل سکا یہ کیسے سمایا میرے دماغ میں، کیا بنا ہے یہ میرے ساتھ، مجھ بھوکا دیکھنے کی تمنائی لڑکی پر یہ دل کیسے لٹو ہو گیا۔" بڑا غیر سنجیدہ سا لب و لہجہ تھا۔ زوہا جل کر خاک ہو گئی۔

"میں سب کو بتا دوں گی گھر میں کہ تمہارے دماغ میں کیا فتور پیدا ہو گیا ہے۔" جلے سے لہجے میں دھمکایا تھا۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ان سب نے مل کر ہی ڈالا ہے میرے دماغ میں یہ فتور۔ پلان بنا رہے تھے تمہیں میرے پلے سے باندھنے کے، میں نے چھپ کر سن لیا اور فتور آ گیا میرے دماغ میں۔"

"ہیں؟" وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ "تم جیسے باگڑ بلے سے میں تو کبھی شادی نہ کروں۔"

"ایک دنیا مرتی ہے مجھ پر، ناشکری لڑکی! اور ایک تم ہو دستیاب ہو رہا ہوں اور......"

"اندھی ہوگی وہ دنیا، میں اندھی نہیں ہوں۔" وہ دانت پیس کر کہتی پلٹ گئی تھی۔

وہ ہشاش بشاش سا کچن میں گھس گیا تھا۔ جہاں قورمے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اسے بھوک سے بے حال کر دیا تھا۔ اور وہ دھاوا بول چکا تھا۔ زوہا حالت صدمے میں تھی اسے روک بھی نہ سکی۔

☆☆☆

"سنو رمشا! میں تو تم سے کہا کرتی تھی کہ یہ عثمان کبھی مجھے اچھا لگ ہی نہیں سکتا۔ بس بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا رہی ہوں اور...... اب...... ایک دن ہوا ہے ہمارے شادی کو...... اور پتا نہیں کیوں مجھے یہ اچھا لگنے لگا ہے یار...... اور میں تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کیا کرتی تھی اور...... اب پتا نہیں کیوں...... مجھے اس سے شرم آ رہی ہے اور اس کی طرف دیکھا بھی نہیں جا رہا۔" ویسے کی دلہن بنی وہ اسٹیج پہ بیٹھی رمشا کے کان میں منمنا رہی تھی۔

اسٹیج کی طرف آتا عثمان اسے دیکھ کر بڑے دل سے مسکرایا تھا۔ وہ فوراً نظریں جھکا گئی تھی۔

"میں نہیں کہتی تھی تم سے کہ نکاح کے بولوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ بس وہ طاقت تم پہ اثر کر کے محبت میں بدل گئی ہے اور کچھ نہیں ہے۔ پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔"

رمشا نے ہنستے ہوئے بے فکری سے کہا تھا اور اس کے پہلو سے اٹھ گئی۔ جہاں عثمان بیٹھ گیا تھا۔ بڑے طمطراق سے۔

"سنو! یقین کرو پورے تین دن ہو گئے ہیں۔ کھانا کھائے، بھوک ہی ختم ہو گئی ہے یار!...... چار چفیرے خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں کھانوں کی اور میری بھوک چمک کے نہیں دے رہی۔ تم سے شادی کی خوشی میں لگتا ہے کھانے کی حاجت ہی ختم ہو گئی ہے۔ بے فکر رہو۔ رنگا، رنگ کھانوں کے لیے بالکل نہیں ستاؤں گا۔ دال بھی چلا کرے گی اب تو۔"

عثمان نے مسکراتے ہوئے سرگوشی تو زوہا نے اپنی ہنسی بڑی مشکل سے کنٹرول کی تھی۔ بس ایک شرمیلی سی مسکان کھیل کے رہ گئی تھی اس کے لبوں پہ جسے دیکھ کر عثمان سرشار ہو گیا تھا۔

☆☆

مکمل ناول

آسیہ رئیس خان

آخری بار گیٹ کو سیاہ اور سنہری اسی نے پینٹ کیا تھا اور اس وقت بدرنگ سا گیٹ کھولتے ہوئے اِیاس کو لگا وہ بھی اس سے شکایت کر رہا ہے۔

"دیکھو! تمہارے بعد کسی نے میری طرف توجہ ہی نہیں دی۔"

"شکایتیں!" اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے دل نے جیسے سسکی لی۔ وہ خود کو ان کے لیے تیار کر چکا تھا۔

اونچی دیواروں سے گھرے صحن کا نقشہ بھی اس کے دل کی طرح بدلا اور اجڑا تھا۔ نیم کا سایہ دار پیڑ اپنی جگہ تھا مگر اس کے نیچے نہ اماں کی آرام کرسی تھی نہ ہی اس کے تنے سے لپٹے منی پلانٹ کے چوڑے پتے تھے۔ احاطے کی دیوار سے لگی کیاریاں خالی تھیں۔ وہاں کے گلاب، موتیا، جوہی، چمیلی، جاسوتی کے پودے، گملے اور بیلیں ندارد تھیں۔ بس گیٹ کے دائیں طرف والا ایک لیموں کا درخت بچا تھا۔ اس کی بائیک اب بھی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ گیٹ کی آواز پر جن کی طرح نمودار ہونے والا سنان ہی باہر آیا نہ اُسوہ نظر آئی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ رات میں اکثر چھت پر ہوتی تھی۔

"ماموں چار دفعہ تمہارا پوچھ چکے ہیں اور حسان بھائی بائیک پر تمہارے پیچھے بیٹھی 'نمونی' کو بھی دیکھ چکے ہیں۔"

اس کے دیر سے آنے پر وہ چشمہ ناک پر جماتے ہوئے، دبی آواز اور ملامتی لہجے میں ہمیشہ آنے والے طوفان سے پہلے اسے آگاہ کرتی تھی۔

"جانے کس شہر میں...... کس کے ساتھ ہوگی!"

کچھ تصور اور حقیقتیں یکساں محال ہوتی ہیں۔ اُسوہ کے ساتھ کسی اور کا نام اس سے سوچا بھی نہیں جاتا تھا۔

دونوں بیگ گھسیٹتے ہوئے وہ صحن عبور کر کے ہال کے دروازے تک آیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ براؤن اور کریم قالین کی رنگت ماند پڑ گئی تھی، ایل شیپ گہرے مرون صوفے کی جگہ بدل گئی تھی، اب وہ ٹی وی یونٹ کے بالکل سامنے تھا۔ اس پر پڑے کشن کور اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ سامنے رکھے کافی ٹیبل پر صحن میں کھلے پھول سے سجا کوئی گلدان نہیں تھا۔ اس پر ہمیشہ بچھا رہنے والا اماں کی کشیدہ کاری کا تاریخی نمونہ غائب تھا۔ میز پر صرف اخبار رکھا تھا۔ کمرے میں بھی کوئی اِن ڈور پودا نہ تھا۔ پاپا کی کتابوں کی الماری اور صوفے کے ساتھ کھڑا رہنے والا لمبا سا آرائشی گلدان اپنی جگہ موجود تھے۔ دیوار پر آیت الکرسی کی فریم کے علاوہ دو قدرتی مناظر کی تصویریں ٹنگی تھیں۔

"یہ عجیب ٹرینڈ ہے، اچھی بھلی صاف شفاف دیوار کو لے کے فریموں سے بھر دو، اس سے کمرا چھوٹا لگتا ہے مجھے تو۔ میرا بس چلے تو گھڑی کے علاوہ دیوار پر کچھ نہ ٹانگوں۔"

یہ آوازیں واپسی کی مرہونِ منت نہ تھیں۔ میلوں کے فاصلے پر بھی گزرے تین برسوں سے یہ اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ہر یاد پر حیران ہو رہا تھا کہ اسے سب کچھ اس قدر تفصیل سے یاد تھا۔ اس نے تو کبھی گھر پر اتنی باریک بینی سے توجہ نہیں دی تھی۔

"تمہیں یاد ہیں کہ یہ سب اُسوہ سے جڑے تھے۔" اندر سے آواز آئی۔

"ہا...... آں......!" اپنے کمرے سے ہال میں آرے سنان نے اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں دو تین بار میچ کر کھولیں۔ سنجیدہ چہرہ، پرسوچ آنکھیں، ہلکی داڑھی اور ذرا سے بڑھے وزن کے ساتھ بدلا بدلا سا وہ اس کا ضدی بھائی ہی تھا۔ جب تسلی ہو گئی کہ واقعی وہی سامنے کھڑا ہے، وہ زور سے چلایا۔

"اماں ممی......"

"کیا ہوا؟" کرتی پڑتی شگفتہ بیگم نمودار ہوئیں۔ ہونق بنے سنان کی نظروں کا تعاقب کیا اور ان پر شادیٔ مرگ طاری ہو گیا۔

"اِیاس......" فرطِ مسرت سے کانپتی آواز میں پکارتے ہوئے انہوں نے دوڑ کر بیٹے کو گلے لگایا۔

"اِیاس!" تین برس سے ترس رہی پیاسی ممتا پر ٹھنڈے میٹھے دیدار اور لمس کی پھوہاریں پڑنے لگیں۔

وہ رو رہی تھیں۔ "کتنا ترسایا، کتنا تڑپایا ہمیں۔"
"سوری ممی!" ایاس نے جھک کر ان کے شانے پر ٹھوڑی ٹکا دی۔ صحرا کا مسافر تو وہ بھی تھا۔
"اماں!" بِسنان نے ایک بار پھر آواز لگائی۔
اسے انہیں لینے خود ان کے کمرے میں جانا چاہیے تھا مگر اس کے قدم منجمد ہو گئے تھے۔ اسے ایک ساتھ بہت سی باتیں اور کئی منظر یاد آرہے تھے اور سب کا مرکز اُسوہ تھی۔ سامنے موجود بدلے ایاس کو دیکھتے ہی اس پر منکشف ہوا تھا کہ جو بات وہ اس سے پہلے جان گیا تھا وقت گزر جانے کے بعد اسے بھی اس کا ادراک ہو گیا ہے اور یہ سچ اسے خوش نہیں کر سکا کہ اُسوہ اب پہلے والی اُسوہ نہیں تھی۔ اس کے بھائی نے دیر کر دی تھی۔
"آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا قیامت آگئی ہے جو تو اتنا......"
دور سے ہی کہتی آرہیں اماں کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ شگفتہ بیٹے سے الگ ہوئیں۔ ایک اور شادی مرگ کی کیفیت۔ اس خوشی پر وہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہوتیں اس سے پہلے ایاس نے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا۔ وہ زور سے روتے ہوئے اس سے لپٹ گئیں۔
"اتنے دن بعد آج بسنت پھولی ہے اس گھر میں۔" کچھ دیر بعد انہوں نے سنبھل کر کہا۔
اماں!" ایاس ہلکے سے ہنسا۔ "بہت مِس کیے آپ کے یہ محاورے۔
اسے خود سے دور کر کے انہوں نے اس کا چہرہ تھاما۔
"تو آیا کیوں نہیں جلدی، ایسا کوئی کرتا ہے؟ وعدہ کر اب کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔"
وہ شرمندہ تھا، پچھتا رہا تھا، سب سے معافی مانگنے کے لیے بے قرار تھا مگر اس وقت اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔ اس کی کیفیت بھی ان کی سی تھی لیکن وہ اپنی دادی اور ماں کی طرح اعلانیہ رو بھی نہیں سکتا تھا۔
خاموش وعدے پر ہی مطمئن ہو گئے۔
"اماں! یہ انت بھلا تو سب بھلا ہے یا لوٹ کے بدھو گھر کو آئے؟" پائل ابھی آئی تھی اور اسے دیکھ کر دروازے میں کھڑے کھڑے ہی اس نے سوال داغا۔ "یا آپ آئے بہار آئی؟"
"ارے، واہ تم تو پکی شاگرد ہو گئیں اماں کی!" ایاس نے کہا۔
"آپ نے داڑھی کیوں رکھ لی؟ کوئی عربی بھی ساتھ ہے؟ مجھے انہیں نزدیک سے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔" اس کی بات پر سب ہنس پڑے۔
بِسنان باپ کو میسج کر چکا تھا۔ وہ بھاگتے دوڑتے گھر پہنچے تب وہ اماں اور شگفتہ کے بیچ صوفے پر بیٹھا تھا، انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ باپ کے جھکے کندھے اور بالوں سے جھلکتی سفیدی دیکھ کر وہ پھر ندامت کے گہرے کنویں میں جا گرا۔ وہ سب کا مجرم تھا مگر سب سے زیادہ اعجاز اور اُسوہ کا۔
جب انہوں نے آگے بڑھ کے اسے گلے لگایا تو اس کے سوچے اور بار بار مشق کیے سارے جملے یونہی رہ گئے۔
"اتنی دیر لگا دی بیٹا۔" انہوں نے نمناک آواز میں کہا۔ اور جب سے ضبط کر رہا ایاس سب کے سامنے چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اسے تو ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگنی تھی، اپنے لیے سزا سننا تھی لیکن انہوں نے ایک لفظ کہے بغیر اسے گلے لگا لیا تھا۔
باپ کے سنجیدہ مزاج اور رعب نے ان کے مابین ہمیشہ فاصلہ اور جھجک قائم رکھی تھی، اور گھر چھوڑ کر جاتے ہوئے اس کے دل میں باپ کے لیے صرف شکایتیں تھیں۔ مگر اس وقت باپ کے گلے لگے ایاس کو ان کی محبت اور اپنی خطاؤں کا احساس تھا۔ ان کے اس برتاؤ نے اس کا افسوس بڑھا دیا تھا۔ وہ باپ سے لپٹا رو رہا تھا اور باقی سب بھی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔

☆☆☆

آنکھوں کے اندھے اور نام نین سُکھ!" اسے دیکھتے ہی اماں نے گھورتے ہوئے ناگواری سے کہا۔
"اب کیا ہوا؟" اس نے پہلے چشمہ ناک پر درست کیا پھر سر جھکا کر اپنے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے اس طنز کی وجہ سمجھنا چاہی۔
"اُسوہ نام اس لیے رکھا تھا تیری ماں نے کہ اُسوہ حسنہ والی ہوگی بیٹی اور تو یہ......" انہوں نے اس کے پیر کی سمت اشارہ کیا۔ "ٹخنوں کی نمائش کر رہی ہے۔"
"اماں!" اس نے ٹھنک کر احتجاج کیا۔ "ٹخنوں تک ہے اس سے اوپر نہیں اور یہ دیکھیں۔" اس نے بیگ کی سائیڈ پاکٹ سے اینکل لینتھ والی جرابیں نکالیں۔ "ابھی انہیں پہننا ہیں، ان کے بنا گھر سے نکلتی ہوں میں؟"
"ارے، یہ نگوڑے کپڑے پہنتی ہی کیوں ہے؟"
اس کے شلوار قمیص نہ پہننے پر وہ ہمیشہ نالاں رہتی تھیں۔ گھر سے باہر جینز، جیگنگ اور ٹراؤزر پر کرتیاں اور گھر میں گھٹنے تک آتے ٹی شرٹ اور پاجامے کا معمول انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ پیروں میں بھی وہ اسنیکرز اور لوفرز پہنتی تھی۔ اب بھی بلیو جینز پر گلابی سفید کرتا اور سفید دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ بال پیچھے اسکرنچی میں قید تھے، ہاتھ کے انگوٹھوں میں دو رنگز پھنسی تھیں اور کلائی پر بقول اماں پہاڑ سائز کی گھڑی تھی۔ میک اپ سے تو اس کی دشمنی تھی۔
اس نے اپنا بیگ فرش پر کرسی سے ٹکایا اور فون، رومال میز پر رکھ کر جرابیں پہننے لگی۔
"ممی!" ایاس اپنے کمرے سے ہی بولتا آرہا تھا۔ "ناشتا ریڈی ہے تو ٹھیک ورنہ میں چلا۔" ٹی شرٹ گلے سے نیچے کھینچتے ہوئے وہ ہال میں داخل ہوا۔
"اولاد ہے یا دشمن!" شگفتہ دو پلیٹیں ہاتھوں میں لیے باورچی خانے سے باہر نکلیں۔ "دھمکی کے بنا بات ہی نہیں کرتی۔"
"ممی!" دودھ کا مگ واپس میز پر رکھتے ہوئے بِسنان نے احتجاج بلند کیا۔ صرف ایک اولاد، باقی دو کبھی دھمکی نہیں دیتیں۔"
"بڑے بھائی بڑی والی دھمکی دے چکے چھوٹے۔" اس نے اُسوہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اطلاع دی۔
بِسنان نے چونک کر ماں کو دیکھا جو گزشتہ شب حسان کی گفتگو یاد آتے ہی لب بھینچ کر چپ ہو گئی تھیں۔ آملیٹ اور روٹی والی پلیٹ اُسوہ کے آگے اور ابلے انڈے اور اسموتھی ایاس کے سامنے رکھ کر وہ پلٹ گئیں۔
"اماں! آپ کو بتایا نہیں ممی نے؟" چمچے سے ابلے انڈے کی زردی نکال کر اُسوہ کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے اس نے دادی سے پوچھا۔
"ایاس کے بچے!" شگفتہ نے واپس دروازے میں آکر دانت پیسے۔
"آنٹی جی!" باورچی خانے سے اماں کی چائے کا پیالہ لیے پائل نمودار ہوئی۔ "کس سے چھپا رہی ہے آپ؟ آپ کی ساس نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہے۔" اماں کے محاورے اور مثل اسے ہی سب سے زیادہ یاد تھے۔ "انہیں پتا ہے بڑے بھیا کو کوئی لڑکی پسند ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہے۔" اس کے حلق سے ہے، تھی، گئی، آئی وغیرہ کے ساتھ نون غنہ کبھی نہیں نکلتا تھا۔ وہ چائے کا پیالہ ان کے آگے رکھ کر چلی گئی۔
"حسان پہلے میرے پاس ہی آیا تھا کہ پاپا ممی سے آپ بات کریں، میں نے کہا خود بات کرو۔" انہوں نے پیالہ اٹھاتے ہوئے شگفتہ کی سمت دیکھے بنا سکون سے کہا۔
شگفتہ ہنستے مسکراتے زندگی گزارنے پر یقین رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے گھر کا ماحول بھی ایسا ہی رکھا تھا۔ ساس نے ابتدائی دنوں میں روایتی رنگ دکھائے بھی تو انہوں نے روایتی بہو کا

جولا نہیں پہنا۔ آخر ساس بھی تھک ہار کر رام ہو گئی تھیں اور عرصے سے بڑے بیٹوں کو چھوڑ کر تو اسی کے ساتھ مستقل ان کے پاس رہتی تھیں۔ مگر اب بھی ان کے اندر کبھی کبھی پرانی روایتی ساس انگڑائیاں لیا کرتی تھی اور وہ انہیں ایسے دھچکے دیتیں کہ شگفتہ کچھ پل کو گم جاتی تھیں۔

"اچھا کیا۔" اب بھی وہ سنبھل کر پلٹ گئیں۔

"میں نے تبھی کہہ دیا مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اپنے پاپا سے خود کہو۔"

"ویسے حسان بھائی لگتے تو نہیں ایسے کہ خود لڑکی پسند کرلے گے یا کوئی لڑکی انہیں پسند کرے گی، وہ تو بات بھی دن کی چار گن کے کرتے ہے اور جواب تو بنا بولے ہی دے دیتے ہے۔" پائل پھر نمودار ہوئی۔

"بہرا سو گہرا!! اتنا خوبرو ہے میرا پوتا اسے کون ناپسند کرسکتا ہے۔" اماں کو پائل کا تجزیہ ایک آنکھ نہ بھایا۔

"واہ! کیا لبرل فیملی ہے۔" ایاس نے خالی گلاس میز پر رکھا اور اُسوہ کا رومال اٹھا کر منہ صاف کیا۔

"تمہاری گرل فرینڈز کا بار اٹھانے اتنی لبرل پھر بھی نہیں۔" اُسوہ نے دانت پیستے ہوئے اسے گھورا۔ اس کی آواز اتنی تھی کہ اماں نہ سن سکیں۔

"سب کو تھوڑی نہ گھر لاتا ہے۔" اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ "ویسے وہ میری گرل فرینڈز نہیں فرینڈز ہیں۔" اس نے رومال فون کے قریب سابقہ جگہ پر بڑے سلیقے اور احتیاط سے رکھا۔

"آپ سیں اپنا کمر بند نے! زور سے بولا کرو۔" وہ دونوں جب کھسر پسر کرتے اماں کا یہ جملہ لازمی ہوتا تھا۔

"کچھ نہیں اماں! اس نے میرا رومال خراب کر دیا۔ یہ آج والی کو دے دینا۔" اُسوہ نے رومال چٹکی میں پکڑ کر اس کے سامنے رکھا اور ٹشو باکس سے تین چار ٹشو ایک ساتھ کھینچ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو بِسنان!" بیگ شانے پر لٹکا کر اس نے بِسنان کو مخاطب کیا۔ ان دونوں کا کالج ایک ہی تھا۔

"ناشتا تو پورا کرلو۔" اماں نے ٹوکا۔

"دیر ہو رہی ہے، رکشا میں کھالوں گی۔" اُسوہ نے آملیٹ اور روٹی پر رکھ کر رول بنایا اور ایک ٹشو نکال کر اس میں لپیٹ لیا۔

"اللہ حافظ مامی، اللہ حافظ اماں۔"

"فی امان اللہ۔" شگفتہ باہر آئیں۔ "سنبھل کے جاؤ۔"

بِسنان بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ شگفتہ نے آگے آ کر نئی شرٹ کی کالر ٹھیک کی اور بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"اس جنگل میں کنگھا برش کچھ تو پھرا لیا کرو۔"

"ٹھیک ہی تو ہے ممی۔" بِسنان نے انگلیوں سے بال پھر سے بکھرا لیے۔ وہ مزید کچھ کہتیں اس سے پہلے وہ باہر نکل گئی۔ لب سختی سے بند کیے وہ گھبرائی سے سر سرا کر اوپر آنے کی کوشش کرتی ایک چیز کو اندر ہی دبا رہی تھی۔

وہ دونوں گیٹ سے نکل کر گلی میں ہی تھے جب پیچھے سے ایاس بائیک پر آیا۔

"رکشا نہیں ملا؟" اس نے رفتار کم کی۔

"شیئرنگ رکشا یہاں نہیں مین روڈ پر ملتا ہے۔" بِسنان نے جتایا۔

"چلو، چھوڑ دوں تم دونوں کو۔" دونوں نے ایسی کڑی نظریں اس کے چہرے پر گاڑیں مانو وہ انہیں کسی گناہ کی دعوت دے رہا ہو۔

"تمہاری بائیک کی پچھلی سیٹ ہمارے شایانِ شان نہیں۔" اُسوہ نے چشمہ ناک پر درست کرتے ہوئے مسکرا کر طنز کیا۔

"جاؤ، کوئی بے چاری لیٹ نہ ہو جائے۔" سنان نے دوسرا آئینہ دکھایا۔

"بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔" اس نے تاسف سے سر ہلایا اور فر سے بائیک بھگا لے گیا۔

شروعات یہاں سے ہوئی تھی کہ حسان نے چار دن لگاتار اس کی بائیک کے پیچھے لڑکی کو دیکھا۔ پانچویں دن حسان نے اماں اور شگفتہ کے سامنے استفسار کیا اور اس نے سہولت سے تفصیل بیان کی۔

"ٹیوزڈے کو لیزا تھی، وینسڈے کو زائرہ، تھرس ڈے شاید روبی تھی اور جمعہ کو مسکان کو لفٹ دی تھی۔"

"اس نے سب کے کھلے منہ اور پھٹی آنکھیں دیکھیں ہی نہیں۔

"باپ نہ ماری پِدڑی بیٹا تیر انداز، ہونہہ!" سب سے پہلے اماں ہوش میں آئیں اور عادتاً لاڈلے پوتے کی کرتوت کو ایک 'ہونہہ' میں اڑانے کی کوشش کی۔

"آپ کہیں ممی کو مینڈکی تو نہیں کہہ رہیں؟"

"شگفتہ نے اس کی پیٹھ پر ایک زور کا ہتھڑ لگایا۔"

"تمہاری بائیک پر روز نئی لڑکی کیوں ہوتی ہے، یہ بتاؤ؟"

"مطلب آپ چاہتی ہیں ایک ہی لڑکی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں، پچھلی سیٹ خالی رہے۔"

"آپ سب جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ کالج جاتے ہوئے راستے میں بس یا رکشا کا ویٹ کرتا کالج یا کلاس کا کوئی شناسا چہرہ مل جائے تو اسے بٹھا لیتا ہوں۔"

"تمہارے شناسا سارے چہرے زنانہ کیوں ہیں؟" اُسوہ نے تیکھا سوال کیا۔

"ایسا تو نہیں ہے، ہاں لیکن یہ سوچنے والی بات ہے مجھے روز 'زنانیاں' ہی کیوں روکتی ہیں؟"

"سدھر جاؤ۔ تمہارے پاپا کو خبر ہوئی تو خیر نہیں، انہیں یہ حرکتیں پسند نہیں۔" شگفتہ نے سنجیدہ مزاج شوہر کے متعلق سچ ہی کہا۔

"پاپا کو خدمتِ خلق، سوشل ورک پسند نہیں؟"

وہ بڑی معصومیت سے حیران ہوا۔

"جس میں ایک جوان لڑکے کے ساتھ کئی لڑکیاں شامل ہوں، ایسا سوشل ورک نہیں پسند، نہ انہیں نہ ہمیں۔"

"اب کوئی ہاتھ لہرا کر لفٹ مانگے تو کیا میں زن سے آگے بڑھ جاؤں؟ آپ سب مجھے بداخلاقی کا درس دے رہے ہیں۔" اس نے ان سب کو شرم دلانی چاہی۔

"اب زیادہ شور نہ ڈالو تم سب۔ ویسے ہی دنیا میں بد اچھا بدنام برا کا اصول رائج ہے۔" اماں نے بھی مشرقی دادی کا کردار نبھاتے ہوئے سب نظر انداز کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ "ایسی باتیں تو اڑی اڑی طاق پر بیٹھی، خواہ مخواہ بدنام ہو جائے گا ایاس۔"

اس دن کے بعد سے اعجاز کے علاوہ سب اس کے 'سوشل ورک' سے باخبر تھے اور وہ بھی ایسی ویسی کوئی بات نہیں کہتا مزید شیر ہو گیا تھا۔ اس کی زبان صرف باپ کے سامنے قابو میں رہتی تھی۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آئی تو اماں فون پر بات ختم کر رہی تھیں۔

"دکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں!" فون رکھ کر وہ بڑبڑائیں۔

"اب کس نے کیا کر دیا؟"

"تیری ماں نے پائی پائی جوڑی، قربانی دی، من مارا اور اس گھر میں چھ مہینے بھی نہ رہ سکی۔" وہ سمجھ گئی، دوسری طرف یقیناً تبسم تھیں۔ "اور ذاتی مکان کا سارا عیش و آرام اس کی سوکن کے حصے میں آیا۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے کام کی بات پوچھی۔ تبسم یونہی فون نہیں کرتی تھیں۔

"تیرا باپ نکلا ہے وہاں سے۔" دادی کا موڈ آف تھا۔

ایسے موقعوں پر وہ سمجھ نہیں پاتی تھی انہیں اپنی بیٹی کی جواں مرگی کا دکھ زیادہ ہوتا ہے یا داماد کو اپنی دوسری بیوی بچوں کے ساتھ خوش دیکھنے حالاں کہ وہ خود ضد کر کے بچپن میں ہی اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ اس کے باوجود ابو اس سے غافل نہیں تھے۔

اُسوہ نے کان پر ہاتھ رکھ لیے۔
"یہ داستانِ محبت اس کے لیے بچا کے رکھو، میرے کانوں کو گناہ گار نہ کرو۔" اس نے ہاتھ ہٹائے اور اِیاس نے بری طرح گھورا۔"
"بہت بے مروت ہو۔"
"ہوں، تم اس بات کا خیال رکھا کرو۔"
"وہ فائنل میں ہے میرا بھی لاسٹ سمسٹر ہے، تم صرف یہ پتا لگاؤ خدانا خواستہ وہ کہیں انگیج تو نہیں پھر ہم دونوں ممی سے بات کریں گے۔"
"تم اتنی جلدی شادی کرلو گے؟" اسے اس کی محبت پر ذرہ برابر یقین نہیں تھا مگر اتنی جلد بازی پر وہ حیران ہوئی۔
"کیوں، نہ کروں؟"
"تمہیں آئے دن کوئی نہ کوئی لڑکی پسند آجاتی ہے، ایسے میں۔"
"اُسوہ!" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "کالج اور کلاس کی لڑکیوں کو لفٹ دینا یا تھوڑا بہت فلرٹ کرنا الگ ہے اور واقعی محبت ہونا الگ۔ یہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔"
"پہلی اور آخری دونوں سے اختلاف ہے مجھے۔ ویسے اگر وہ انگیج ہوئی تو؟ اتنی خوب صورت لڑکیوں پر سب کی نظریں ہوتی ہیں، لڑکوں کی بھی اور ان کی اماؤں کی بھی۔"
"تو پھر میرے ساتھ مل کر اس کی انگیجمنٹ توڑنا۔" وہ کھڑا ہوگیا۔
"ہیرو ہو یا ولن، طے کرلو پہلے۔"
"اسے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ بن سکتا ہوں، ولن کیا۔"
"بس بس......" اس نے ہاتھ اٹھا کے روکا۔ "مجھے ہضم نہیں ہو رہے تم، واٹ شامٹ نہ ہو جائے۔"
اِیاس کا دل کیا اٹھا کے نیچے پھینک دے اسے۔ "تمہیں محبت ہوگی تب بدلہ لوں گا۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا کے کہا۔

"تمہیں یقین ہے ابھی تک ہوئی نہیں؟" وہ انگوٹھے کی رِنگ گھماتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔
"ہوتی تو میرا مذاق نہیں اڑاتیں۔" اس نے منہ پھلایا۔
"میں کیسے ساری انفارمیشن حاصل کروں؟ ایک فنکشن ہونا تھا ہوگیا، اب ایسا کوئی موقع کہاں سے نکالوں؟" اس نے بات بدل دی۔
"ممی یا اماں کو کسی بہانے شمیلہ بھابھی کے گھر لے جاؤ اور ان سے ہی پوچھ لو۔"
"اِیاس!" نیچے سے سِنان نے آواز دی۔ وہ دو سال چھوٹا تھا مگر اسے نام سے بلاتا تھا۔
"پاپا بلا رہے ہیں۔ چلو۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ "اس وقت پاپا جی کو ناراض نہیں کرسکتا۔"
"تم جاؤ میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔"
"جلدی آنا۔" وہ نیچے اترا تو وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔ خالی الذہن سی آسمان پر جگمگاتے پورے چاند اور تاروں کو تکتے ہوئے پھر گہرائی سے کوئی احساس اوپر آنے کو سر سرا رہا تھا مگر وہ کسی مغرور شہزادی کی طرح تغافل کے پنجوں سے ان آوارہ احساسات کو کچلنے پر ملکہ حاصل کرچکی تھی۔

☆☆☆

شادی میں زیادہ دن نہیں تھے اور اس سے پہلے اِیاس، سنان اور اُسوہ تینوں کے امتحان بھی تھے۔ وہ شگفتہ کے ساتھ ایک بار جا کر اتنا کنفرم کرآئی تھی کہ اصفیاء کی منگنی نہیں ہوئی ہے نہ کہیں رشتہ طے ہوا ہے۔ اِیاس نے اسے اس کا فون نمبر حاصل کرنے کہا اور اُسوہ نے بے دردی سے اس کی فرمائش ٹھکرادی۔ اس کا خیال تھا شادی تک اِیاس کو کوئی بھی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنی چاہیے جس سے شمیلہ کے گھر والوں کے سامنے انہیں شرمندگی ہو۔
"یعنی شادی کے بعد شرمندہ کرسکتا ہوں؟"
"تم باز آنے سے تو رہے اس لیے کم سے کم حسان بھائی کی نیا تو پار لگ جانے دو۔ ویسے بھی تم اپنی سریس پہلی اور آخری محبت کے لیے سنجیدہ ہو تو سمسٹر کلیئر کرکے کیمپس پلیسمنٹ حاصل کرنے پر توجہ دو۔" اس نے اپنے رِنگ والے پاؤچ سے نئی رنگ نکال کر انگوٹھے میں ڈالتے ہوئے اسے مشورہ دیا جو اس کے دل کو لگ بھی گیا۔
سب سے پہلے اُسوہ کے امتحان ختم ہوئے تھے اور شگفتہ اسی انتظار میں تھیں۔ روز بازاروں کے چکر لگنے لگے۔ حسان مزاج اور عادات میں باپ پر گیا تھا۔ شگفتہ کی شگفتہ مزاجی اِیاس اور سِنان میں ہی آئی تھی۔ اُسوہ کے ساتھ ان کا رویہ سہیلی جیسا تھا۔ شادی کے لیے اپنے جوڑے، جیولری، میک اپ، مہندی سب کچھ ان دونوں نے یوں کیا تھا جیسے ہم عمر ہوں۔
شادی بھی ہوگئی اور شمیلہ گھر آگئی۔ سارے ہنگاموں میں اُسوہ کے ساتھ ساتھ سِنان بھی اِیاس کی اصفیاء میں دلچسپی جان گیا تھا۔ وہ دونوں ہی سارا وقت اس کی نگاہیں کھینچ کر رکھتے تھے۔ تینوں اس بات سے انجان تھے کہ ان کی کھسر پسر اور نگاہوں کے تبادلے اصفیاء کو بھی باخبر کر گئے ہیں۔

☆☆☆

"ممی!"
اِیاس کی پرجوش آواز پر اُسوہ اور سنان نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آج شمیلہ کی خالہ کے یہاں ان سب کی دعوت تھی۔
"یہ لیں۔" اس نے چار خوبصورت بوکے میز پر رکھے۔ اُسوہ نے مسکراہٹ چھپانے منہ پھیر لیا اور شگفتہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔"
"یہ کیا لے آئے؟"
"میزبانوں کے لیے پھول۔" اس کی باچھوں کے لیے آج چہرہ کم پڑ رہا تھا۔
"تمہیں مٹھائی لینے بھیجا تھا۔"
"آں......؟"
"ہاں۔"
"البیلی نے پکائی کھیر دودھ کی جگہ ڈالا پنیر۔" اماں کا ہر وقت طنز حاضر تھا۔ کبھی ایسے کام نہ کرنے والا آج ماں کی ایک آواز پر بازار جو دوڑا تھا۔
"مجھے اتنا سمجھ آیا کہ اماں نے ابھی ابھی اِیاس کو البیلی کہا۔" سِنان بھی صورت حال سے محظوظ ہو رہا تھا۔
"مجھے تو لگ رہا ہے جیسے حسان بھائی کے سسرال نہیں اِیاس بھائی کے سسرال جا رہے ہیں سب۔" باورچی خانے میں جھاڑو لگا رہی پائل دور کی کوڑی لائی۔
"دیکھیے تو وہ کتنے زیادہ تیار ہے۔" وہ جھاڑو والا ہاتھ کمر پر رکھے دروازے میں کھڑی تھی۔
"زیادہ تیار سے کیا مراد ہے پائل جی؟ میک اپ کیا ہے یا پارلر سے ریڈی ہوکے آیا ہوں؟"
"مردوں کے بھی پارلر ہوتے ہے، جا کے بھی آئے ہوگے۔" وہ شانے اچکاتے ہوئے واپس اندر چلی گئی۔
سِنان کو زور سے ہنسی آگئی۔ اِیاس اسے گھورنے لگا۔
"بے وقوف! وہ بھی چار چار اٹھا لائے اور مٹھائی کا ایک ڈبا نہیں۔" شگفتہ وہیں اٹکی تھیں۔
"چھوڑیں مامی۔" اُسوہ نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ "مٹھائی سب ہی لے جاتے ہیں، یہ پھول زیادہ خوب صورت اور خاص ہیں۔" تبھی حسان اور شمیلہ کمرے میں داخل ہوئے۔
"تیار ہیں سب؟" حسان نے پوچھا۔
"بس پانچ منٹ حسان بھائی۔" اُسوہ نے آئی لائنر کی شیشی اٹھا کر شگفتہ کو کرسی پر بٹھایا۔
"آپ تینوں ہال میں ویٹ کریں۔" شمیلہ نے حسان کے ساتھ ساتھ سنان اور اِیاس کو بھی مخاطب کیا۔
"یہ بھی لے جاؤ۔" شگفتہ نے میز پر رکھے گل دستوں کی سمت انگلی اٹھائی۔
"یہ کیا؟" حسان نے ایک گل دستہ ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"بچوں، وقوں کے لیے پھول؟" بسان نے کہا اور ایاس بنا کچھ کہے دو بوتے اٹھا کر چلا گیا۔ وہ دونوں بھی سعادت مندی سے پل میں پیچھے گئے۔

بیٹھ جاؤ۔" اماں نے شمیلہ سے کہا۔ اسوہ شگفتہ کی بند آنکھوں پر لائنر لگانے کے بعد پھونکیں مار رہی تھی۔

"بھی ہماری بھابھی کے ساتھ سنگھار کر رہی ہیں۔" اماں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اماں!" شگفتہ نے بند آنکھوں کے ساتھ احتجاج کیا۔ "لائنر، لپ اسٹک کو سولہ سنگھار تو نہ کہیں۔"

"جی! آپ یہ لپ اسٹک لگائیں، میں گجرا وغیرہ بھول گئی لے کر آتی ہوں۔" شگفتہ کے کمرے کا اے سی کام نہیں کر رہا تھا اس لیے وہ کھانے کی میز پر سب پھیلائے ادھر موجود تھیں۔

"آنکھیں کھولوں؟"

"کھول دیں۔" اس نے اندر مڑتے ہوئے کہا۔

شگفتہ نے تھجے سے آئینے میں دیکھ کر اسوہ کی نکالی لپ اسٹک لگائی تب تک وہ دوڑی واپس آئی۔ ان کے جوڑے کے گرد موتیا کا گجرا لپیٹا۔ تب تک شگفتہ سامنے رکھے جیولری باکس سے اس کے کپڑوں کے مطابق آکسیڈائزڈ بریسلیٹ اور ایئر رنگز نکال چکی تھیں۔

"پھر لوالائنر نہیں لگانا؟"

"نہیں! اپ بام لگایا ہے بس۔" اس نے بریسلیٹ ہاتھ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ شگفتہ نے سب سمیٹا اور اٹھا کر کمرے میں رکھنے چلی گئیں۔

"چلیں اماں! بھابھی۔" اس نے کان میں ایئر رنگز پہنتے ہوئے ان دونوں سے کہا جو خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"چلو۔" اماں ان سب ظاہری عادی تھیں۔

"چلیں بھابھی۔" اس نے مڑ کر اسے آواز [illegible] آ جائیں گی۔" [illegible] وہ ان کے

لے رکی ہے۔ شمیلہ اس کے پیچھے ہولی۔

ایاس کی صلاحیتوں کا لائیو مظاہرہ بسان اور اسوہ نے کئی بار دیکھا۔ اس نے اصفیاء سے بے تکلف مذاکرات کے بعد اس کا فون نمبر بھی حاصل کر لیا تھا۔

وہاں سے واپسی پر وہ کپڑے تبدیل کر کے اس ڈھونڈتی چھت پر آئی۔

"کر دیا پروپوز؟" وہ چھت کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا فون اسکرول کر رہا تھا۔

"واہ! مجھے جلد باز کہنے والی کو پہلی ملاقات میں ہی پروپوزل چاہیے۔"

"تم جیسے دل پھینک قسم سے تو مجھے پہلی ملاقات بھی کسی چاہیے۔" اس نے منہ چڑایا۔

"تمہارے نامہ اعمال میں گناہ لکھنے والے فرشتوں کی ڈائریاں مجھ پر لگائے جھوٹے الزاموں سے ہی بھری ہوں گی۔"

"اور تمہاری ایسے مکرنے والے جھوٹ سے۔ اتنی دیر اصفیاء کے ساتھ کیا بات کی پھر؟"

"بس ادھر ادھر کی، فوراً حال دل تو نہیں سنا سکتا نا۔"

"اگلی ملاقات کی راہیں تو ہموار کر لی ہوں گی؟" جواب میں ایک اترائی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"چہ! لڑکی اور محبت کے چکر میں اچھے خاصے ہوش ہوگئے ہو۔" اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"تم اور جیلس؟"

"حق ہا۔"

تب ہی بسان دھپ دھپ کرتا اوپر آیا۔

"میرا تو ویٹ کیا ہوتا۔" اس نے اسوہ سے شکایت کی۔

"سوری، صبر نہیں ہو رہا تھا۔"

"پھر کب جا رہے ہو 'فرسٹ ڈیٹ' پر؟" بسان نے سیدھے پتے کی بات پوچھی۔

[illegible] وہ

سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ "ہمارے گھر میں 'ڈیٹس' ڈسکس ہو رہی ہیں۔"

"کل۔" ایاس نے اس کا ڈرامہ نظر انداز کیا۔

"ہا..." اسوہ مارے حیرت کے پوری اس کی سمت گھوم گئی۔ "یہ تو تم سے زیادہ جلد باز نکلی۔"

"مابدولت کا چارم ہے۔" اس نے فرضی کالر کھڑے کیے۔

"اندھوں اور بے وقوفوں کی کمی نہیں دنیا میں۔" بسان نے کہا۔

"تم بھی جیلس؟"

"حق ہا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"تمہیں بتا دوں تاکہ تم دونوں بھی میرے پیچھے وہاں پہنچ جاؤ، بالکل نہیں۔"

"الحمدللہ، اس گھر میں اندھوں اور بے وقوفوں کی شدید کمی ہے۔" بسان نے تشکرانہ لہجے میں کہا اور اسوہ نے تائید میں سر ہلایا۔

"تم دونوں اوپر ہو؟" نیچے سے شمیلہ کی آواز آئی۔ ایاس اور اسوہ آگے کی دیوار تک آئے جہاں سے نیچے شمیلہ نظر آ رہی تھی۔

"جی۔" ایاس نے کہا۔

"کیا کر رہے ہو وہاں اندھیرے میں؟"

"کچھ خاص نہیں، یونہی باتیں کر رہے ہیں۔"

بسان بھی ان کے برابر آ کر کھڑا ہوا۔

"آپ بھی آ جائیں۔" اسوہ نے دعوت دی۔

"نہیں، انکل تمہارا پوچھ رہے ہیں۔" اس نے ایاس سے کہا۔

"اچھا، ان سے کہیں آ رہا ہوں۔" ایاس نے کہا اور وہ اندر چلی گئی۔

"پاپا نے بھی آج ڈیٹ رکھ لی۔" بسان مسکرایا۔

"اس ڈیٹ سے پسینے چھوٹتے ہیں میرے۔" اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا۔

"اصفیاء نے تمہاری شکایت تو نہیں کر دی؟" اسوہ نے ڈرایا۔

"شبھ شبھ بولو۔" وہ سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

اس کی درگت دیکھنے کے لالچ میں وہ دونوں بھی اس کے پیچھے نیچے آئے مگر اعجاز نے اسے امتحان اور امتحانوں کے بعد کا منصوبہ پوچھنے بلایا تھا۔ اس کا ایم بی اے کا آخری سمسٹر تھا۔

☆☆☆

وہ کچھ دن بڑا خوش سا ہواؤں میں اڑتا رہا۔ اصفیاء سے ملاقات کے بعد فون پر ان کا مسلسل رابطہ تھا۔

آج اصفیاء ان کے گھر آئی تھی۔ ساتھ شمیلہ کی بہن بھی تھی۔ اصفیاء نے آنے کا ایاس کو بتایا اور اس نے ان دونوں کو اور وہ تینوں ہی کلاس اور کام چھوڑ کر مختلف بہانے بنا کر دوپہر کے کھانے پر گھر میں موجود تھے۔ کھانے سے ذرا پہلے شگفتہ کو اپنی نبیلی کے یہاں بریانی اور کھیر بھیجنے کا خیال آیا۔

"ایاس یہ زہرہ کے یہاں دے آؤ۔" انہوں نے ہاٹ پاٹ اور سرو ویئر کا ڈبہ تھیلی میں ڈال کر میز پر رکھا۔

"میں؟" اس نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"بائیک تمہاری ہی ہے، جلدی کرو۔" وہ واپس باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"بسان تم دے آؤ۔" اس نے چھوٹے کو حکم دیا۔

"تمہاری بائیک کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم نہیں توڑ سکتا۔" اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"بائیک سے کون جانے کو کہہ رہا، شہر کے رکشا تمہارے اور اسوہ کے دم سے چل رہے ہیں۔"

"ممی!" اس نے آواز لگائی۔ "میں نہیں جا رہا بسان سے کہیں۔"

"وہ بائیک سے نہیں جائے گا، اس لیے تم

جاؤ۔"
"اسے بھی بائیک دلا دیں۔"
"ابھی آرڈر کرتی ہوں، تب تک یہ پہنچا کے آؤ۔"
"پلیز ممی! میں نہیں۔"
"کھانے کو بسم اللہ کھانے کو استغفر اللہ۔" گھر والوں اور مہمانوں سے پہلے ہی کھیر سے انصاف کر رہے ہسنان کو پیچھے سے دادی نے دھموکا جڑا اور میز سے ریموٹ اٹھا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے ریموٹ سے ٹی وی چلایا۔
"اماں کبھی مجھ سے محبت کا ثبوت بھی دیں گی، میں یہ حسرت لے کر ہی مروں گا۔" ہسنان نے زمانے بھر کی مایوسی چہرے پر سجاتے ہوئے پیالی میں بچی کھیر چمچہ میں بھر کر منہ میں ڈالی اور کھڑا ہو گیا۔
"ویسے اِیاس سے پوچھیں وہ آج اس وقت گھر میں کیوں موجود ہے۔" تھیلی اٹھا کر باہر نکلنے سے قبل اس نے ماں اور دادی کو مشکوک کرنے کی کوشش کی۔
"طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اس لیے جلد آ گیا۔" اس نے فوراً جواز پیش کیا۔
"تو یہاں کیا کر رہے ہو؟" باورچی خانے سے نکل کر مہمانوں والے ڈنر سیٹ کی پلیٹیں میز پر رکھتے ہوئے اُسوہ نے کہا۔ "کمرے میں جا کر آرام کرو، آپ ہی کہیں اماں۔" اِیاس نے بری طرح اسے گھورا۔
"ابھی یہاں سب کھانے کو جمع ہوں گے، جا آرام کر۔" اماں کا مشورہ حسب امید تھا۔
"میں اب ٹھیک ہوں۔" اس نے چہرے پر بشاشت سجاتے ہوئے گویا ثبوت بھی دیا۔
"یہاں زنانیوں کے بیچ کیا کرنا، کمرے میں آرام کر۔" اُسوہ نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔
"مجھے بھوک لگی ہے اسی لیے تو بیٹھا ہوں یہاں۔"
"اول طعام بعدہ کلام۔ تو اتنی دیر سے منہ میں دہی جمائے کیوں بیٹھا ہے، کھانا مانگ لیتا۔" انہوں نے اُسوہ کو دیکھا۔ "اسے کھانا دو پہلے۔"
"جی اماں۔" اس نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔
"اماں! سب کے ساتھ ہی کھاؤں گا اب۔" اس نے تیزی سے کہا مانو اُسوہ چھری گھما کر کھانے کی پلیٹ اس کے سامنے رکھنے والی ہو۔
"الٹی سمجھے نہ سیدھی۔" اماں نے بے زار ہو کر توجہ ٹی وی کی سمت مرکوز کر دی۔ اسی وقت شمیلہ اصفیاء اور اپنی بہن کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔
"ہم بھی کچھ مدد کریں۔" اصفیاء نے اُسوہ سے پوچھا۔
"دیگچی، پیالے اور پلیٹیں آپ نے ہی خالی کرنے ہیں اتنی مدد کافی ہو گی، بیٹھیں آپ سب۔" شمیلہ ان دونوں کو بٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ساری خواتین میں واحد مرد اِیاس تھا۔ آج وہ اُسوہ کے بازو والی کرسی پر بیٹھا تھا کیوں کہ سامنے والی کرسی پر اصفیاء تھی۔ باتوں کے درمیان معمول کی طرح بریانی سے آلو اور کھیر سے کشمش، بادام کے تبادلے کو مہمان دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

ابھی وہ پہلی خبر سے ہی سنبھلی نہیں تھی کہ اس کی دوسری بات پر کرسی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔
"پورے پاگل ہو گئے ہو، کیا بول رہے ہو یہ بھی نہیں سمجھ میں آ رہا تمہیں۔"
"میں اسے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے میں ہیلپ کروں گا۔" اِیاس نے رک رک کر ایک ایک لفظ واضح انداز میں دہرایا۔
"اِیاس!" جتنا وہ سنجیدہ تھا اُسوہ اب اتنی جھنجلائی تھی۔
"یار! اس نے مجھ سے کچھ مانگا ہے اور میں۔"
"بڑے دل والا فلمی مجنوں بننے کی ضرورت نہیں۔" اس نے بات مکمل نہیں ہونے دی۔ "بالکل ہی پٹری سے اتر گئے ہو۔" اس کا انداز اِیاس کو اچھا نہیں لگا۔
"تم کو کبھی یقین ہی نہیں آیا کہ میں واقعی اس سے محبت کرتا ہوں۔" اس کے بدلے انداز پر وہ سنبھل کر چپ ہی رہی۔
"تمہیں یہ مذاق اور فلرٹ ہی لگا اور اب بھی اسے ایسے ہی ٹریٹ کر رہی ہو۔"
"میں نے جو بھی سمجھا ہو مگر تم جو کہہ رہے ہو وہ ناقابل قبول بلکہ نہایت فضول ہے۔"
"تمہارے لیے ہو گا، میرے لیے نہیں۔"
"تمہیں یہ صحیح لگ رہا ہے؟"
"غلط کیا ہے؟ تین سال سے وہ کسی سے محبت کرتی ہے، گھر والوں سے کہا، وہ راضی نہیں۔ اس کی جاب ہو گئی ہے اس لیے اب وہ گھر سے بھاگ کر شادی کر رہے ہیں، اس نے دوست سمجھ کر مجھ سے مدد مانگی ہے۔"
"دوست...... ؟ مت ماری گئی ہے تمہاری اِیاس۔ اتنے دنوں سے وہ تمہارے ساتھ کیا کر رہی تھی؟ اسے تمہاری فیلنگز کا پورا احساس ہے اور یہ جان کر ہی اس نے تمہیں یوں ٹریپ کیا ہے تا کہ ایک گدھے عاشق کو یوز کرے اور......"
"تم بہت غلط سوچ رہی ہو اُسوہ، وہ ایسی نہیں ہے۔" اس کے لہجے اور جملے پر اُسوہ کا دل کیا اچھی طرح کوٹ ڈالے اسے۔
"تم بے وقوف تو تھے ہی اب اندھے بہرے بلکہ گدھے ہو گئے ہو پورے۔" اس نے دانت پیسے۔
"کچھ بھی کہو میں نے ڈیسائیڈ کر لیا ہے اس کی ہیلپ کروں گا۔" وہ جس کرسی سے اٹھی تھی وہ اس پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں اِیاس کے کمرے میں تھے۔
"یہ خاندان کا مسئلہ ہے اِیاس۔" کچھ دیر اسے گھورنے کے بعد اس نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کتنے مسائل ہو جائیں گے تمہیں اندازہ نہیں ہے، سب سے اہم بات ماموں جان کو خبر ہوئی تو...... ؟ جان سے مار دیں گے تمہیں۔"
"کسی کو خبر نہیں ہو گی۔"
"کیسے نہیں ہو گی؟ میں ابھی جا کر انہیں بتا دوں تو؟"
"تم ایسا کبھی نہیں کرو گی۔" اس کے لہجے کا یقین ہی تو اس کا غرور تھا مگر اس وقت وہ اس یقین پر تلملا کر رہ گئی۔
"میں تمہیں کسی حال میں یہ بے وقوفی نہیں کرنے دوں گی۔ ٹانگیں نہ توڑ دوں تمہاری؟"
"مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں، میں گھر سے بھاگ کر شادی کرنے میں اس کی مدد کروں گا یہ طے ہے اور تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔" دونوں کے لہجے پر یقین تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کو آر پار والی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔
"گدھے ہو تم، انتہائی نالائق گدھے!" اُسوہ نے ہر لفظ چبا چبا کر کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا مگر پہلی بار اِیاس کو اس کی پروا نہیں تھی۔ ساری دنیا میں اس کے لیے اس وقت محبوب کی خواہش، اس کی التجا، اس کی پکار کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا۔
ہسنان کے فائنل ایگزامز چل رہے تھے، وہ بمشکل کھانے کے لیے کمرے سے باہر نکلتا۔ کبھی کبھی کھانا بھی شگفتہ کو کمرے میں پہنچانا پڑتا تھا۔ اُسوہ اس نازک وقت میں اسے اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتی تھی۔ اِیاس کو سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش الٹے گھڑے پر پانی ثابت ہو رہی تھی۔ کئی بار خیال آیا شمیلہ سے بات کرے لیکن اگلے پل خود ہی اس خیال کی پرزور نفی بھی کرتی۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا وہ ان دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی ہے۔ ان دونوں کی بات میں ہسنان کے علاوہ کوئی تیسرا ممکن ہی نہ تھا۔
ہسنان کے امتحان ختم ہوئے تو اِیاس کے شروع ہو گئے۔ اس دوران اُسوہ ہسنان کو اس کے ارادوں کی خبر کر چکی تھی۔ آخری پرچے کے دن وہ دونوں اس کا

انتظار ہی کرتے رہے۔ رات میں اماں نے پوچھا تو اس نے جھوٹ کہا، وہ گھر آ کر کب کا سو چکا اور بائیک اس کا کوئی دوست لے کر گیا ہے۔ چوں کہ آخری پرچا تھا اس لیے سب نے یقین بھی کر لیا۔

رات تین بجے آہستہ سے گیٹ کھول کر وہ اندر آیا تو سامنے اُسوہ زینے پر بیٹھی تھی۔ وہ بھی ادھر ہی آ کر نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اُسوہ جواب سننے سے اتنا ڈر رہی تھی کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ اتنی دیر کہاں تھے؟ جیسے سوال ہی نہیں کیے۔ وہ کچھ دیر ہی انتظار کر سکا۔

"اب پوچھو بھی۔"

"ایاس!" اس کے دھیمے لہجے میں افسوس اور غصہ تھا۔

اس نے تھکا تھکا چہرہ پیچھے موڑا اور سرخ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی شکستہ حالت دیکھ کر اسے ترس آ گیا۔ اس کی خبر لینے کے سارے ارادے دم توڑ گئے۔

"جو کرنا تھا تم کر چکے، اب دعا کرو آگے کوئی پرابلم نہ ہو۔"

"کسی نے پوچھا نہیں میرا؟"

"تم جلدی آ کر کمرے میں سو رہے ہو۔"

"تھینک یو۔"

"کھانا کھایا؟"

"نہیں۔"

"چلو۔" وہ کھڑی ہوئی۔ "پہلے کھانا کھاؤ پھر سونا۔"

"اس وقت کھانا؟ رہنے دو۔" وہ آگے بڑھ گئی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔

"اگر تم ماتم منانے کا سوچ رہے ہو تو قسم سے میں ابھی تمہیں مار ڈالوں گی۔" اس نے پلٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ "دیوداس بننے کا ارادہ وہیں سیڑھی پر چھوڑ کر کچن میں آؤ۔"

"بندہ اپنی مرضی سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بڑبڑایا۔

"وہ کر چکے تم اور اس معاملے میں اس سے زیادہ اپنی مرضی کی تمہیں اجازت نہیں۔" اس نے تیقن سے کہا اور دبے پاؤں اندر چلی گئی۔ ایاس کھڑا ہوا تو اس کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ تھی۔

بنا آواز پیدا کیے اس نے کھانا گرم کیا اور میز پر اس کے سامنے رکھا۔ کھانا دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کس قدر بھوک لگی تھی۔ اس نے خاموشی سے کھانا ختم کیا تب تک وہ اندر چائے بنا رہی تھی۔

"کہاں گئے وہ دونوں؟" مگ اسے تھما کر سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا مگ اٹھایا۔

"تمہیں جتنا کم علم ہو اتنا اچھا۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے انکار میں سر ہلانے کے بعد کہا۔"

"تمہیں شک ہے کہ میں ـــــ"

"نہیں اُسوہ۔" اس نے تیزی سے جملہ قطع کیا۔ "لیکن بہتر یہی ہے کہ تم لاعلم رہو۔"

"اتنا تو بتا دو نکاح کر کے گئے یا بعد میں کریں گے؟"

"وہ ہو گیا ہے۔"

"تم دونوں کیا اس وقت سحری کر رہے ہو؟" عقب سے اچانک شمیلہ کی آواز پر دونوں نے پیچھے دیکھا۔ شمیلہ ہاتھ میں خالی بوتل لیے کھڑی تھی۔ وہ پانی لینے آئی تھی۔

"مجھے بہت بھوک لگی تھی۔" ایاس نے اطمینان سے کہا جب کہ وہ اس آمد پر گھبرا گئی تھی۔

"اُسوہ کو میسج کیا تو وہ جاگ رہی تھی۔" اس کی جھوٹی پلیٹ اب بھی میز پر تھی۔

"اچھا۔" وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

"ریلیکس۔" ایاس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"چائے کے بعد نیند کہاں آئے گی۔" وہ بوتل بھر کر باہر آئی۔

"میں تو سوؤں گی بھابھی، ایاس کا پتا نہیں۔" اس نے مگ میز پر رکھ کر ایاس کے آگے سے پلیٹ اٹھائی۔

"ایاس کی نیند تو پوری ہو گئی ہو گی۔" کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"یار یہ ـــــ" اسے فوراً درست لفظ نہیں سوجھا۔

"نیوایڈ یقین کوٹینشن والا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے، غلط نہ سوچو۔" وہ برتن لے اندر چلی گئی۔

اُسوہ اتنی دیر جاگی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔ یہی حال ایاس کا بھی تھا۔

صبح گیارہ بجے تک دونوں کمروں سے نہیں نکلے تو شگفتہ کو فکر ہونے لگی۔

"شام سے سویا ہے ابھی تک اٹھا کیوں نہیں اور اُسوہ اتنی دیر تک کبھی نہیں سوئی۔"

"رات تین ساڑھے تین بجے دونوں ڈائننگ روم میں تھے۔" شمیلہ نے کہا۔ "ایاس اس وقت کھانا کھا رہا تھا۔"

"اچھا، اسی لیے۔" انہیں اطمینان ہوا۔ "رات میں کھانے کے لیے اسے جگایا ہو گا۔"

اُسوہ جانتی تھی یہ بات زیادہ دیر راز نہیں رہ سکے گی۔ اس کا خوف یہ تھا کہ اس میں ایاس کے کردار سے پردہ نہ اٹھ جائے۔ وہ دوپہر میں جاگا اور ناشتا کر کے بائیک لے کر پھر چلا گیا تھا۔

دوپہر میں شمیلہ فون آنے پر سب کے درمیان سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی تو اسے یقین تھا اصفیاء کی ہی خبر ہو گی۔ اس کے بعد سے شمیلہ بہت خاموش اور فکر مندی فون میں ہی مصروف تھی۔

☆☆☆

اگلے دن وہی ہوا جس کا اسے دھڑکا لگا تھا۔ اپنے معمول کے وقت سے بہت بعد میں اعجاز گھر آئے تو انتہائی غصے میں تھے۔

"ایاس کہاں ہے؟" آتے ہی آفس بیگ صوفے پر پھینک کر انہوں نے غضب ناک لہجے میں شگفتہ سے دریافت کیا۔

"کیا ہوا؟ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟ وہ کہیں باہر گیا ہے۔" شوہر کو کم ہی انہوں نے اس قدر برہم دیکھا تھا۔

"فون کرواے۔" انہوں نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے ہی وہ اسے میسج ٹائپ کر چکی تھیں۔

"بات کیا ہے وہ تو بتائیں؟"

"کیوں اتنا آگ بگولا ہو رہے ہو؟" اماں نے بھی حصہ کیا۔

اعجاز ہونٹ بھینچ کر ضبط کر رہے تھے۔

انہوں نے جیب سے فون نکالا اور خود ہی کال ملائی۔ تبھی باہر اس کی بائیک کا ہارن بجا۔ اُسوہ باہر بھاگی۔ گیٹ کھولا، وہ بائیک اندر لے آیا۔

"شاید ماموں کو پتا چل گیا۔" اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے سرگوشی کی۔"

"ہیں ـــــ؟" بائیک اسٹینڈ پر لگا کر اترتے ہوئے وہ چونکا۔

"ایاس!" اندر سے اعجاز کی پکار پر اُسوہ کا رونا ہی باقی تھا۔ گھر میں سب سے زیادہ مشفق اور نرم رویہ ان کا اسی کے ساتھ تھا پھر بھی اسے ان کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔

"ایاس!" دوسری پکار میں اشتعال کے ساتھ بے صبری اور جھنجلاہٹ بھی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت وہاں کمیلہ اور حسان بھی موجود تھے۔

"جی پاپا۔" وہ ان کے سامنے جا کر رکا۔

"یہ تربیت تھی ہماری؟" ان کی سرد آواز گونجی۔ "ذرا خیال نہیں آیا تمہیں؟"

"میں نے کیا کیا؟" اس نے معصومیت سے الٹا سوال داغا۔ اُسوہ کا دل کیا کیلی پیتی سے اسے کہے، قبول کر لو، بنومت۔

"ساری عمر کی جمع پونجی، میرا اثاثہ عزت ہی تھی جو آج تمہاری وجہ سے ـــــ"

"کیا کیا اس نے؟" شوہر کی آواز کی شکستگی شگفتہ کو پہلے ہی توڑ گئی۔ کانپتے دل کے ساتھ انہوں نے فوراً وجہ جاننا چاہی۔"

"اصغر صاحب، شمیلہ کے خالو کی بیٹی نے گھر

چھوڑ کر، والدین کے خلاف جا کر، اپنی پسند سے شادی کرلی ہے......" ایاس نے لب سختی سے بند کیے۔ "اور یہ ممکن ہوا ہے ہمارے بیٹے کی مدد سے۔"
وہ ایاس کو دیکھ رہے تھے جس کی نظریں جھکی تھیں۔
"کک...... کیا کہہ رہے ہیں؟" انہوں نے شوہر اور پھر بہو کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اصفیاء کل رات گھر سے بھاگ گئی ہے۔"
شمیلہ نے کہا۔
"ان سب میں ایاس...... یہ کیسے شامل ہو سکتا ہے؟ آپ سے کس نے کہا یہ سب؟ ضرور کوئی غلط......"
"شگفتہ! یہ سوال اہم نہیں پہلے اس سے پوچھو کہاں گئے ہیں وہ، باقی سوال جواب بعد میں ہوں گے۔"
"میں بلائی احمق لے دوڑی صحنک!" اماں ماتھے پر ہتھیلی مار کر بڑبڑاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ "دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت کیا تھی؟"
"تم انہیں پہلے سے جانتے تھے؟ حسان کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں، یہ الوالو کیسے ہو سکتا ہے مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آرہا۔"
"کہاں گئے ہیں وہ؟" اعجاز نے سوال دوہرایا۔ ایاس لب بھینچے کھڑا تھا۔
"پہلے اس سے پوچھیں تو یہ واقعی الوالو ہے بھی یا نہیں، آپ یونہی......"
"اس کی خاموشی تمہیں سمجھ میں نہیں آرہی؟"
ان کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔
"ارے!" اماں اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھیں۔ "جوان اولاد سے یوں سختی نہیں کی جاتی نرمی سے بات کرو۔ ایاس باپ جو پوچھ رہا ہے اس کا جواب دے۔" وہ خاموش ہی رہا۔
"ایاس......؟" شگفتہ نے بے یقینی اور دکھ سے اسے دیکھا۔
"میں نے ان کی مدد کی ہے اور......"
"میں وہ سب بعد میں پوچھوں گا۔" اعجاز کا سرد لہجہ ان کے غصے کا مظہر تھا۔
"وہ کہاں ہیں اس وقت یہ بتاؤ۔" ایاس نے پھر سر جھکا لیا۔
"ان کا نکاح ہو چکا ہے اس لیے اب وہ کہیں بھی......"
"ایڈریس؟" ان کا لہجہ حکمیہ تھا۔
اصفیاء کے والد کے فون نے جہاں انہیں بیٹے کے کارنامے پر شرمندہ کیا تھا وہاں باپ کی بے بسی، لاچاری، بے قراری، فکرمندی اور عزت مٹی ہونے کی ندامت نے انہیں جھنجوڑ دیا تھا۔ اس طرح کے معاملات میں عموماً جو ہوتا ہے ان کا ردعمل اس سے مختلف تھا۔ انہوں نے غصے میں الزام تراشی، دھمکی اور گالیاں نہیں دی تھیں بلکہ کہا تھا کہ جو ہونا تھا ہو گیا اب وہ بیٹی کو واپس گھر لا کر رخصت کرنے کو تیار ہیں۔ بڑی لجاجت سے انہوں نے کہا تھا۔ اگر ایاس انہیں بتا دے وہ کہاں گئے ہیں تو وہ اسے لے آئیں گے اور مٹی ہو رہی عزت کسی طرح سنبھل جائے گی۔
"میں وہ نہیں بتا سکتا۔"
"ایاس!" شگفتہ کو اب غصہ آگیا۔ "تم پہلے ہی بہت بڑی حماقت کر چکے ہو، اب معاملہ اور نہ بگاڑو، جو پوچھ رہے ہیں وہ بتاؤ۔" وہ ہنوز چپ تھا۔
"ایاس!" شگفتہ نے تنبیہی انداز میں پکارا۔
"سوری ممی لیکن میں......"
"وہ کہاں ہیں یہ بتاؤ یا ابھی اسی وقت گھر سے نکل جاؤ۔" سب نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔ طیش میں آپے سے باہر ہونا یا انتہائی قدم اٹھانا، یہ اعجاز کا مزاج نہیں تھا۔
"ایاس بیٹا! ہمارے بزرگ کہتے تھے آبرو جگ میں رہے تو بادشاہی جایئے، اسی لیے اصفیاء کا باپ اور اعجاز دونوں تم سے پوچھ رہے ہیں، ضد نہ کرو بتا دو۔" اماں نے اس کے قریب آکر کہا۔
"میں نہیں بتا سکتا اماں۔" اس کی وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔
"تو ابھی اسی وقت نکل جاؤ گھر سے۔" اعجاز نے بے حد سرد لہجے میں دروازے کی سمت اشارہ کیا۔ "اور آئندہ صورت مت دکھانا اپنی۔" اور وہ بیچ میں پیچھے سب کو آوازیں دیتا چھوڑ کر دھپ دھپ کرتا دروازے اور پھر گیٹ سے باہر چلا گیا۔
"جوان اولاد کو یوں بارہ بجے گھر سے باہر نہیں کرتے۔" انہوں نے بیٹے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔ "تم اب بات نہ کرنا اس سے وہ گھر آجائے تو میں پوچھتی ہوں، بتا دے گا۔"
"اس کرتوت کے بعد بتائے گا تو ہی گھر میں جگہ ہے ورنہ کوئی اس کی طرف داری اور ہمدردی نہ کرے۔"
اعجاز دوٹوک کہہ کر وہاں سے چلے گئے۔ باقی سب نے سر پکڑ لیا۔ سب اس کے چوری اور اوپر سے سینہ زوری والے رویے پر نالاں تھے۔ اماں کی بڑبڑاہٹیں جاری تھیں۔
"بی بی خطا کرے باندی پکڑی جائے!" وہ ان دادیوں نانیوں میں سے تھیں جن کے لیے پوتا پوتی نواسا نواسی کی کوئی غلطی غلطی نہیں ہوتی بلکہ ان سے فقط معصوم نادانیاں سرزد ہوتی ہیں جنہیں درگزر کرنا بڑوں کا فرض اولین ہوتا ہے۔
☆☆☆
امید کے مطابق رات ڈھائی بجے وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اسے سیڑھی پر دیکھ کر اس کی طرف آنے کے بجائے وہ ہال میں چلا گیا۔ اسوہ اٹھ کر اس کے پیچھے آئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بیگ میں کپڑے ڈالنے لگا۔
"کہاں تھے ابھی تک اور یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے پہلے دروازہ بند کیا تاکہ کسی کو ان کی آواز سنائی نہ دے پھر اس کے پاس آکر پوچھا۔ ایاس نے کچھ نہیں کہا اور کپڑوں کے بعد اپنی اسناد والی فائل بیگ میں رکھی۔
"ایاس! مجھے کیوں غصہ دکھا رہے ہو؟"
"کس نے کہا یہاں آؤ؟ جاکر سب کی طرح آرام سے سو جاؤ۔"
"کیا کر رہے ہو تم؟" اس نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے بٹھانا چاہا۔ (بمشکل اس کو بٹھایا)
"پاپا کا حکم مان رہا ہوں۔"
"وہ غصے میں بول رہے تھے ماموں نے اور تم......"
"میں ان کی بات نہیں مان سکتا۔"
"ایاس!" اس نے بڑے رسان سے کہا۔
"بات مت بڑھاؤ پلیز۔ ماموں جان جو کہہ رہے ہیں وہ بتا دو، ویسے بھی نکاح تو ہو چکا ہے ان کا۔"
"میں نے وعدہ کیا ہے کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"
"اگر کسی کو علم نہیں ہوتا تو الگ بات تھی لیکن اب تو سب جان گئے ہیں ناں، ایسے میں تم کیوں اسے انا کا مسئلہ بنا رہے ہو؟"
"اسے مسئلہ گھر والے بنا رہے ہیں، وہ بالغ لڑکی اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکی، اب اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔" اس کی بات پر اسوہ کا پھر اسے پیٹنے کا دل کیا مگر فی الحال اسے معاملہ سنبھالنا تھا۔
"تم بالکل بے وقوفوں والی بات کر رہے ہو۔ یہ کوئی عام معاملہ نہیں ہے اور اگر تم نے اس کی مدد نہیں کی ہوتی تو اس گھر اور ہم سب کا اس سے کوئی لینا دینا بھی نہیں تھا، اب ساری دنیا جانتی ہے کہ اسے گھر سے بھگانے میں تمہارا ہاتھ ہے، ماموں جان کو کتنی سبکی کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کا تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے، تم نے سنا نا اس کے والدین بھی اب انہیں قبول کرنے کو تیار ہیں پھر تم کیوں اس بات پر اڑے ہو؟"
"میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔"
"پورا کر دیا نا۔ اب گھر والوں کی سن لو۔"
"اس نے کہا ہے وہ کہاں ہیں یہ کسی کو نہ بتاؤں، کچھ دن بعد وہ خود گھر والوں سے کانٹیکٹ کرے گی۔ اسے کوئی ڈر ہوگا بھی کہا نا، کیا پتا گھر والے انہیں زبردستی الگ کر دیں۔"

"اس نے کہا ہے اور اتنی دیر سے میں جو بکواس کر رہی ہوں، ماموں جان جو کہہ رہے تھے وہ سنائی نہیں دے رہا تمہیں؟" ایاس خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

"چار دن کی محبت ہم سب سے اہم ہو گئی تمہارے لیے۔" اس کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔

"میری فیلنگز کی یہ انسلٹ ہی مجھے بہت غصہ دلا رہی ہے۔"

"اوہ شٹ اپ ایاس!" اس کی برداشت جواب دے گئی۔

"گیٹ آؤٹ!" اس نے جس طرح جھنجلا کر اور چڑ کر کہا، ایاس کو بھی غصہ آ گیا۔ کوئی اس کی کمٹمنٹ اور احساسات سمجھ ہی نہیں رہا تھا مگر کم سے کم اُسوہ کو تو سمجھنا ہی چاہیے تھے۔

"مرو تم۔" اس نے پلنگ پر رکھے اس کے بیگ کا ڈھکن ہاتھ مار کر گرایا۔ "جو کرنا ہے کرو مگر یہ لکھ کے اپنی جیب میں رکھ لو، جب پچھتاؤ گے تو میرے پاس مت آنا۔" اس کا لہجہ جلالی تھا اور آنسو گالوں پر پھسل رہے تھے۔ وہ باہر نکل گئی۔

"نہیں آؤں گا۔" اس کے پیچھے اس کی آواز ابھری تھی۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس وقت کے اٹھائے جو ایاس کو سمجھا کر روک سکے۔ شگفتہ کو اٹھانے جاتی تو اعجاز نے بھی جاگ جانا تھا۔ اماں کو اٹھاتی تو ذرا دیر میں وہ سارے گھر کو جگا دیتیں۔ ان دونوں کے علاوہ وہ کسی اور کی بات سننے والا نہیں تھا۔ اعجاز اور اس کے آمنے سامنے آنے سے اس وقت کسی بہتری کی توقع نہیں تھی۔ کمرے میں آ کر اس چوکشن میں اپنے جذبات کے اُبال پر اس نے خود کو لتاڑا۔ یہ وقت حالات مزید نہ بگڑے، یہ دیکھنے کا تھا۔

"کہاں جائے گا دو دن دوستوں کے ساتھ گھوم کر اسے واپس یہیں آنا ہے۔" آخر اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔

"یوں بھی اس کے امتحان ختم ہوئے ہیں اس لیے ہو سکتا ہے تھوڑی تفریح کا پلان اس نے پہلے ہی بنا رکھا ہو اور اب اسے گھر چھوڑنے کی دھمکی کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔"

یہ خیال اسے تھوڑا پرسکون کر گیا۔ کچھ دیر اپنے کمرے میں بے قراری سے ٹہلنے کے بعد دماغ ٹھنڈا ہوا تو اس سے بات کرنے اور سمجھا کر قائل کرنے کے لیے وہ پھر اس کے کمرے میں آئی۔ کمرا خالی تھا۔ اس نے صحن میں جا کر دیکھا، بائیک وہیں کھڑی تھی مگر ایاس جا چکا تھا۔ واپس کمرے میں آ کر اس نے فون لگایا۔ دو رنگ کے بعد ہی ایاس نے کال منقطع کر دی۔

"مرو!" غصے میں اس نے فون پلنگ پر پھینکا۔

اس وقت اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا آنے والا وقت سب کی زندگیاں بدل دینے والا ہے، خاص طور پر اس کی زندگی۔

اگلی صبح ایاس کے گھر چھوڑ جانے کی خبر پر سب نے وہ ہی سوچا جو اُسوہ خیال تھا کہ چند دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کر وہ لوٹ کر گھر ہی آئے گا، مگر اس کی اس حرکت نے اعجاز کا غصہ اور بڑھا دیا تھا۔ انہوں نے اعلان کر دیا اسے گھر میں آنے نہ دیا جائے۔ سب ہی اسے فون کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ کسی کا فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ ہفتہ بھر بعد بھی اس کی یہ ہی روش برقرار رہی تو شگفتہ فکر مند ہوئیں۔ سنان اس کے جن دوستوں کو جانتا تھا اسے ان کے گھر دوڑایا گیا۔ کسی کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا تب سب کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔

شگفتہ اس کے پاس آئیں تو وہ جھوٹ نہ کہہ سکی۔

"تمہیں پہلے سے علم تھا وہ اس کی مدد کرے گا؟" ان کے لہجے کی بے یقینی اسے اور شرمندہ کر گئی۔

"اس نے مجھے اور سنان کو بتایا تھا۔" اس نے آہستہ سے دہرایا۔

"اُسوہ! اُسوہ! تم نے گھر میں کسی کو کیوں نہیں بتایا؟ کم سے کم مجھے تو بتاتیں، تمہیں خیال نہیں آیا اسے

اس بے وقوفی اس نادانی سے کسی بھی حال میں روکنا ضروری ہے اور اس کے لیے جو ہو سکتا ہے وہ کرنا چاہیے، ہماری ان سے رشتہ داری ہے، تعلقات خراب ہوں گے، بدنامی اور شرمندگی الگ۔ تمہیں اپنے ماموں کا بھی خیال نہیں آیا؟"

"مامی......" پہلی بار اس کی ہنس مکھ ممانی غصے میں تھیں۔

"تم ایسی نا سمجھ تو نہیں ہو جو اس معاملے کی نزاکت نہ سمجھ سکو۔ اصفیاء غلطی کرنے جا رہی ہے یہ معلوم ہو جانے پر اول تو اس کے ماں باپ کو خبر کرنا ضروری تھا دوسرا ایاس کو کسی قیمت پر اس میں انوالو نہیں ہونا چاہیے تھا، تمہیں گھر میں کسی کو بتانے کا خیال کیوں نہیں آیا...... سب کچھ رک سکتا تھا اگر...... یا اللہ......" انہوں نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے۔

"مامی......" اسے رونا آ گیا۔ "ہم نے ایاس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، اتنی جلدی وہ یہ سب کر لے گا ہم بھی نہیں جانتے تھے۔"

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، مجھے تو یقین نہیں آ رہا تم نے جانتے ہوئے یہ ہونے دیا۔ کسی کا نہیں مگر اپنے ماموں کی عزت اور رتبے کا ہی خیال کیا ہوتا...... بہت مایوس کیا تم نے مجھے۔" اچانک اسے مامی کی آنکھوں اور لہجے میں اجنبیت محسوس ہوئی۔ وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں اور اُسوہ بے جان سی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اسے بس رونا آ رہا تھا۔ پہلی بار تھا اس کی خوش مزاج اور شگفتہ سی مامی تھی۔ ناراض تھیں، وہ اس سے بات نہیں کر رہی تھیں اور اسے انہیں مخاطب کرتے بھی رونا آ رہا تھا۔

ان دونوں کے بیچ کا یہ الجھاؤ اور تناؤ کسی سے چھپ نہیں سکا۔ ایاس اور اس کی دوستی کی روشنی میں شمیلہ سب سے پہلے اس کی تہہ تک پہنچی تھی۔

"تم جانتی تھیں ایاس اس کی ہیلپ کر رہا ہے؟" شمیلہ کا سوال اماں کو پسند نہیں آیا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں، بس ایاس گھر آ جائے یہ دعا کرو۔"

تب ہی سنان نے آ کر اپنی کرسی سنبھالی۔ شگفتہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا ناشتا لینے اندر چلی گئیں۔

"امتحان ختم ہو گئے، تو اب کہاں جا رہا ہے؟" اماں نے موضوع بدلا اور شمیلہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ اسے ان دونوں پر غصہ تھا مگر گھر میں کوئی اسے نکالنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اسے بھی اُسوہ زیادہ قصوروار لگ رہی تھی۔

"نیکسٹ سمسٹر کے پروجیکٹ کا بہت کام ہے۔" وہ بھی آج کل سنجیدہ تھا۔

اُسوہ نے اپنی چائے ختم کی اور کپ اور پراٹھے کی پلیٹ اٹھا کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ شگفتہ سنان کے لیے آملیٹ بنا چکی تھیں۔ ہاٹ پاٹ سے پراٹھا نکال کر پلیٹ میں رکھا اور چلی گئیں۔

"کل کی طرح رات مت کر دینا، جلدی آنا۔" ادھر وہ اس سے کہہ رہی تھیں۔ "کلاسس نہیں ہیں تو کینٹین بھی بند ہو گی، ٹفن دے دوں؟"

"نہیں، کالج کے باہر اسٹالز ہیں کافی۔"

اس کے اندر کبھی کبھی سر ابھارتا بدگمانی کا بچھو آج ڈنک مار ہی گیا۔ "سنان کو بھی تو علم تھا۔" دل میں آئے اس خیال کے بعد وہ دھواں اٹھا کہ سارے منظر سیاہ ہوتے چلے گئے۔ "ایک سی خطا پر سزا بس ایک کو اور اس کی وجہ......"

اندر جو اُسوہ گئی تھی وہ باورچی خانے سے باہر نہیں آئی۔

جلتی پر تیل ڈالنے والا کام دونوں بڑی ممانیوں نے اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ انہیں ہمیشہ سے شگفتہ کی خوش مزاجی دکھاوا لگتی تھی اور اُسوہ اور ان کا رشتہ دنیا کی واہ واہ سمیٹنے والا فریب۔ ساس نے بھی نواسی کے ساتھ ان کے پاس نہ رہنے کی وجہ ساری دنیا کو بتا رکھی تھیں۔ شگفتہ کی تعریف نہ کرتے ہوئے بھی وہ اس طرح ان کے نمبر بڑھاتی تھیں۔ شگفتہ جو ساری تعریفیں اور رشک سمیٹتی آئی تھیں یہ ان کے حساب برابر کرنے کا وقت تھا۔

جلد ہی جو نہیں جانتے تھے انہیں بھی خبر ہوگئی اور اصفیاء سے زیادہ قصوروار اِیاس اور احسان فراموش اُسوہ اس خبر کی شہہ سرخی تھے۔ جو ماموں کو اس ہزیمت سے بچا سکتی تھی مگر اتنی مہربانیوں کے بعد بھی اس نے ماموں کی نیک نامی کی پروا نہیں کی۔ غیر پر جان لٹا دو وہ اپنا نہیں بنتا، خون آخر خون ہوتا ہے، سگا باپ ہوتا تو ایسا کرتی؟ نانی نے سر چڑھا رکھا ہے، اسے اپنے علاوہ کسی کی پروا نہیں، ایسے اور اسی معنی جیسے جملے اس کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ اس طرح وہ سب کو بتا رہی تھیں کہ دیکھا اسی لیے ہم نے اسے اپنے پاس نہیں رکھا تھا، ہم دور اندیش تھیں۔ پہلی بار ہوا تھا کہ شگفتہ نے اُسوہ کا دفاع نہیں کیا تھا۔ آپ بھلے سگے سوتیلے اور اپنے پرائے کا فرق بھول جائیں مگر دنیا نہیں بھولتی۔ یہ آپ کو بار بار یاد دلاتی رہتی ہے۔ اسے بھی اب فرق نظر آنے لگا تھا۔

اسی دوران اس کے ابو ملنے آئے اور گھر کا کھنچا کھنچا تناؤ بھرا ماحول انہوں نے بھی محسوس کیا۔ چوں کہ وہ فارغ تھی سو کچھ دن کے لیے اسے ساتھ چلنے کو کہا اور وہ بھی تیار ہوگئی۔ شگفتہ نے اسے روکا نہ ہی اماں نے۔ اُسوہ کی خاموشی اور بہو کی سرد مہری وہ بھی دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یہ مناسب لگا کے کچھ دن کے لیے وہ یہاں سے دور چلی جائے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا اس کا جانا کچھ دن کا نہیں ہوگا۔

گھر میں اس کا صرف سِنان سے رابطہ تھا۔ اسی نے بتایا کہ اِیاس ملک سے باہر چلا گیا ہے اور یہ بات اس کے کسی دوست سے پتا چلی ہے۔ یہ سن کر شگفتہ نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور اعجاز اس کی ہٹ دھرمی اور ضد پر مزید نالاں ہوگئے تھے۔ اس کا بھی غصہ اور بڑھ گیا۔ وہ اسے کہاں ہو؟ کیسے ہو؟ کچھ تو پھوٹو! کچھ زیادہ نہیں ہوگیا یہ؟ جیسے ایک سطری میسج کرتی رہتی تھی۔ مگر ادھر بلیو ٹک کے بعد وہی خاموشی تھی۔ اس کی کوئی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اسے کیوں نخرے دکھا رہا تھا۔ غصہ تو اسے ہونا چاہیے،

اِیاس کا غصہ تو بنتا ہی نہیں تھا۔ اِیاس کے چلے جانے کا سننے کے بعد کئی بار اس کا دل کیا کہ شگفتہ سے بات کرے لیکن پھر 'انہوں نے بھی تو ایک کال نہیں کی۔' کا پرچم لہراتی انا اسے روک دیتی۔

تبسم اور چھوٹی رقیہ کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن بڑی فاطمہ اس کے ساتھ لیے دیے ہی رہتی تھی۔ اسے باپ کی محبت میں یہ شراکت دور سے تو گوارا تھی لیکن اپنے ہی گھر میں نہیں۔ ویسے بھی وہ بہت زیادہ پڑھاکو تھی۔ انجینئرنگ کے انٹرنس کی تیاری کر رہی تھی اس لیے زیادہ وقت اسکول اور کوچنگ کے بعد اپنے کمرے میں پڑھتے ہوئے گزارتی تھی۔ انہی دنوں اس کے ابو کے اسکول میں ٹیچر کی ضرورت تھی۔ اس کا بی ایڈ کا رزلٹ تب ہی آیا تھا۔ خود کو مصروف رکھنے اور واپس نہ جانے کا بہانہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ جب اس نے اماں کو فون پر بتایا کہ اس نے اسکول میں نوکری کر لی ہے، وہ اگلے ہی دن سِنان کے ساتھ وہاں پہنچ گئیں۔

"سوت نہ کپاس جولاہے سے لٹھم لٹھا!" انہیں شگفتہ اور اس کی اتنی طویل سرد جنگ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ان کے مطابق دونوں خواہ مخواہ اینٹھ رہی تھیں۔

" تو کس لیے یہاں آن پڑی ہے، تجھے کیا ضرورت ہے نوکری کی؟ تو کچھ دن رہنے کے لیے آئی تھی ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ابھی بیگ باندھ اور چل میرے ساتھ۔"

" میں یہاں کسی وجہ سے یا ناراضی سے نہیں ہوں اماں۔ بی ایڈ اسی لیے تو کیا تھا کہ مجھے ٹیچر بننا تھا۔ نوکریاں اتنی آسانی سے نہیں ملتیں، قسمت سے یہاں موقع ملا ہے تو کچھ دن کرنے دیں، جب مناسب ہوگا یہاں سے ٹرانسفر کروا لوں گی۔" انہیں مطمئن کرنا بہت ضروری تھا۔ کچھ اس کے ابو نے سمجھایا اور کچھ اس نے کوشش کی۔ بالآخر وہ مان گئیں مگر سِنان بہلنے والا نہیں تھا۔

تم مامی سے زیادہ ناراض ہو یا اِیاس سے؟"

"مامی سے کیوں ناراض ہوں گی میں؟ ناراض تو وہ مجھ سے ہیں اور کیا اِیاس پر مجھے غصہ نہیں ہونا چاہیے؟ کتنے میسج کیے میں نے اسے، دیکھ لیتا ہے مگر جواب تک نہیں دیتا وہ گدھا۔" سِنان نے اسے نہیں بتایا کہ وہ اس سے رابطے میں ہے۔ یہ بات اس کا دل توڑ دیتی۔

سب کو یہی لگا تھا کچھ دن کا شوق ہے وہ زیادہ دن نہ نوکری کرے گی نہ وہاں رکے گی مگر اس نے سب کو غلط ثابت کر دیا۔ چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اس کے ابو کی طبیعت بگڑ گئی۔ کئی سارے ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر نے کہا انہیں دل کی بیماری ہے۔ سب گھبرا گئے۔ انہیں بڑے آپریشن کی ضرورت تھی۔ ایسے وقت میں تین بیٹیوں کے باپ کی پریشانی دور کرنے اور فکریں بانٹنے کے لیے چاچا نے اس کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ دے دیا۔ وہ تو اس خبر پر ہکا بکا رہ گئی۔ بھائی کی یقین دہانی اور میٹھی باتوں سے اس کے ابو بھی راضی ہونے لگے تھے۔ اس نے انا کی کڑے تیور نظر انداز کرتے ہوئے اِیاس کو میسج کیا۔

ابو میری شادی طے کر رہے ہیں۔" اس نے دیکھ لیا تھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ اُسوہ بے یقین سی اسکرین دیکھتی رہی۔

"وہ اس پر بھی چپ ہے۔" اس کی لاتعلقی نے دل میں خنجر گھونپا تھا۔ سب لہولہو تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ ہو رہا تھا اور اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ ہر پانچ منٹ بعد چیٹ اوپن کر کے دیکھتی رہی مانو زندگی کی ڈور دوسری طرف کے جواب سے جڑی ہو۔

رات میں اس نے پھر میسج کیا۔

"اِیاس! اگر تم اب بھی خاموش رہے تو یہ سمجھنا میں مر گئی ہوں۔"

ساری رات جاگتے اور روتے ہوئے وہ فون تھامے بیٹھی رہی مگر وہ پتھر ہو گیا تھا۔ محبت تو اس نے خود سے بھی راز رکھی تھی مگر ان کی دوستی پر تو اسے ہی نہیں سارے زمانے کو ناز تھا اور یہ تعلق بھی اتنا بودا ثابت ہوا تھا۔ شگفتہ کے رویے نے جو پہلی ضرب لگائی تھی اگر وہ ناکافی تھی تو بقیہ کمی اِیاس کی زباں بندی نے پوری کر دی۔

اس گھر میں میرے جذبات اور احساسات یک طرفہ ہی تھے۔ اسے یقین ہوگیا۔

رشتے کی خبر اماں کو ہوئی تو وہ بوکھلا گئیں۔ اسے تو ہمیشہ اعجاز کے گھر رہنا تھا۔ اعجاز کے غصہ کے مدنظر ان سے بات نہ کر کے انہوں نے بیٹی کے ساتھ ریاض سے بات کی۔

"اماں! وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے، وہ کسی کو فون تک نہیں کرتا، اسے اپنے کیے کا افسوس نہیں ہے۔ اس نے جو کیا سو کیا مگر اس کے بعد گھر اور پھر ملک چھوڑنا اور رابطہ نہ رکھنا بہت غیر ذمہ دار رویہ ہے۔ اعجاز بھائی اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس معاملے نے اس کا ضدی اور من مرضی کرنے والا مزاج بھی واضح کر دیا ہے۔ پہلے میرے دل میں بھی یہی خیال تھا کہ اُسوہ وہاں بہت اچھی طرح سیٹل ہے تو اعجاز بھائی اسے اپنی بہو بنا لیں گے، آپ کی بھی یہ خواہش ہوگی مگر اب اپنی صحت اور اِیاس کو دیکھتے ہوئے مجھے اس خیال پر قائم رہنا فضول لگ رہا ہے۔ آپ سب کی نیت اور محبت پر مجھے شک نہیں مگر اس کا واحد سگا رشتہ میں ہوں اور اپنی زندگی میں اس کی شادی اور محفوظ مستقبل کا انتظام کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میری آنکھ بند ہونے کے بعد کیا ہوگا میں نہیں جانتا۔ یہ دنیا ہے یہاں پلک جھپکتے ہی سب کچھ بدل جاتا ہے، ایسے میں اپنے بھتیجے کا موزوں رشتہ میں کسی پرانے خواب کی وجہ سے ٹال نہیں سکتا، خواب بھی وہ جس کے اب پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

اماں نے پھر بھی اپنی سی کوشش کی تھی اور ان دونوں کی باتیں سنتی اُسوہ ست قدموں سے لوٹ گئی۔ پہلے ہی صرف اماں کو وہاں دیکھ کر ایک اور شکوہ اس کے دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

"مامی نہیں آئیں۔"

سنان کو خبر ہوئی تو اس نے اسے میسج کیا۔

یہ کیا سن رہا ہوں میں، تم نے شادی کے لیے ہاں کردی؟
نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔
اور سنان کو ایاس پر بہت غصہ آیا۔ اس نے اسے میسج کیا۔
"اُسوہ کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی ہے۔"
"مجھے وہاں کی کسی خبر میں کوئی دلچسپی نہیں۔"
اس کے جواب نے سنان کو آگ ہی لگادی۔ اس نے کئی ماہ تک پھر اسے کوئی میسج نہیں کیا۔
ریاض کے آپریشن سے پہلے اس کا نکاح ہوگیا رخصتی ان کے ٹھیک ہونے کے بعد تھی۔ اعجاز اور شگفتہ نے مہمانوں کی طرح شرکت کی۔ اماں سارا وقت آنکھیں صاف کرتی رہیں۔ کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ جو کبھی سوچا بھی نہ تھا وہ سب دیکھنا پڑ رہا تھا۔ ایک لاابالی لڑکے کی نادانی نے سب بکھیر دیا تھا۔ اُسوہ کو کچھ محسوس نہیں ہورہا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح احکام بجالانے کا کام کررہی تھی۔ اسے یقین تھا ساری زندگی اب اسی برف کی سل کو ڈھونا ہے۔ سنان نے اسے دولہا دلہن کی تصویر ضرور بھیجی تھی۔
آپریشن کی نوبت ہی نہیں آئی اس سے پہلے ہی ریاض کو قضا نے آن دبوچا۔ دو دن پہلے خوشی میں شرکت کرنے والے واپس ایک ماتم میں شریک ہونے لوٹے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر شگفتہ کے اندر اس کا سارا درد اپنے اندر اتار لینے کی خواہش ابھری تھی۔ اماں اور اعجاز سے گلے مل کے پھوٹ پھوٹ کر رونے والی اُسوہ جب ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہی بازو میں بیٹھی تبسم کے سینے میں سر چھپا کے رونے لگی تو شگفتہ کے اندر جنگل کی آگ کی طرح حسرت پھیل گئی۔ اس کے سر سے ہاتھ سمیٹتے ہوئے شگفتہ کا دل بھی سکڑا تھا۔ یہاں ایک ہی میت کا سوگ نہیں تھا۔ اتنی تیزی سے حالات اور تعلقات کی اکویشن بدلی تھی کہ سبھی حیران تھے۔ دونوں گھروں میں اداسی کا ڈیرا تھا۔ اماں اس کے پاس رکی تھیں۔ ایک طوفان آکے گزر گیا اور اس کے بعد سب کو سگا سوتیلا نظر آنے لگا۔
"اس کا کیا سوچا ہے؟" کمرے سے باہر نکل کر جاتے ہوئے تبسم کی بڑی بہن کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔
"کس کا؟ اُسوہ کا کہہ رہی ہیں؟"
"ہاں، میں نے دیکھا فاطمہ کا موڈ اسے دیکھ کر خراب ہوجاتا ہے، یہ سوتیلی بہن اب ہمیشہ......"
"آپا! وہ بھی اس گھر کی بیٹی ہے، اس کی تنخواہ نے سنبھالا ہے سب کچھ ورنہ میں فاطمہ کی کالج اور ہاسٹل کی فیس دینے کے قابل نہیں ہوں، آپ بھی سگے سوتیلے جیسا ذکر فاطمہ اور رقیہ کے سامنے نہ کیا کریں، اس طرح ان کے ذہن میں بھی یہ فرق جگہ بنا لے گا۔"
"پھر بھی تمہیں اپنی بیٹیوں کا سوچنا ہے، آخر وہ ہے تو......"
"ریاض کو تینوں بیٹیاں ایک سی عزیز تھیں، ان جیسی محبت شاید میں اُسوہ کو نہ دے سکوں مگر میں حشر میں ان کے سامنے شرمندہ بھی نہیں ہونا چاہتی۔"
"تم فاطمہ کا بھی تو سوچو پتا نہیں تم نے غور کیوں نہیں کیا مگر میں نے دیکھا ہے، اس کے کمانے اور یہاں رہنے کی جب سب تعریفیں کرتے ہیں تو فاطمہ چپ ہوجاتی ہے، کل ہی اس کی پھوپھو کہہ رہی تھی باپ کی جگہ اُسوہ نے سب سنبھال لیا تب تم نے دیکھا نہیں وہ کیسے اٹھ کر چلی گئی تھی۔"
"تو آپا آپ اسے سمجھائیں اور بار بار یہ ذکر نہ کریں۔"
وہ ست قدم اٹھاتی کمرے میں آگئی۔ وہ جانتی تھی کوئی احساس جب کنڈلی مار کر اندر بیٹھ جائے تو بار بار پھن اٹھاتا رہتا ہے۔ اس کے ڈسنے سے بچنا مسلسل مسافت ہے وہ بھی تنہا۔ اس کے تجربے نے تو اسے ایک زہریلی منزل پر لاکھڑا کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کے ابو کی پیاری بیٹی، اس کی سوتیلی بہن کسی ایسی منزل تک پہنچے۔ وہ خوش دل اور ہنس مکھ مامی کو آئیڈیلائز کرنے والی اُسوہ سے سنجیدہ اُسوہ میں ڈھلتی گئی۔
اماں سنان کے ہمراہ اس سے ملنے آتی رہتیں۔ شگفتہ اسے فون کرتیں تو آپ کیسی ہیں کہ بعد اس کے پاس صرف ان کی باتوں کے جواب ہوتے تھے۔ وہ اپنی شاپنگ اور دوسرے معمولات کی تصاویر واٹس ایپ کرتیں تو وہ ہارٹ والا ری ایکٹ کردیتی۔ ایاس کے بعد وہاں بھی سب بدل گیا تھا۔ اس حادثے نے شمیلہ اور گھر والوں کے تعلقات میں بھی دراڑ ڈال دی تھی۔ وہ اور حسان حیدر آباد چلے گئے تھے۔ ان کا دو سال کا بیٹا تھا۔ سنان برسر روزگار ہوگیا تھا۔ اعجاز ریٹائر ہوگئے تھے۔ اس دوران خاص موقعوں پر وہ تبسم کے ساتھ کچھ گھنٹوں کے لیے آئی تھی۔ سنان کا کئی بار دل کرتا کہ وہ اسے بتائے کہ ایاس کہاں ہے، کیا کررہا ہے مگر وہ جانتا تھا وہ اسے چھوڑ کر بھائی کو سب خبر کرتا ہے، یہ بات تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ ویسے وہ اس سے بہت باتیں نہیں کرتا تھا۔ کہاں ہے، کس کمپنی میں اور کس پوسٹ پر ہے، اتنا ہی اسے بتاتا تھا۔ اس کا پتا اسے بھی نہیں معلوم تھا۔

☆☆☆

اُسوہ کے متعلق پوچھتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا اور اب تک کسی نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا تھا۔ جب اس نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تو اعجاز نے ایک عمر کے تجربے اور مشاہدے سے سیکھے سبق پر عمل کیا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹتا تو ہے مگر کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ خوش گوار اختتام اسی وقت ہوتا ہے جب ماضی فراموش کر کے اسے کھلے دل سے اپنایا جائے۔
"جوانی کے جوش میں غلطیاں سب سے ہوتی ہیں، تمہیں احساس ہوگیا ہے، اتنا کافی ہے، کسی معافی تلافی اور وہی سب دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے بعد اس گھر میں اداسی کا ڈیرا تھا اور تین سال کم نہیں ہوتے، پچھلی باتیں یاد کریں گے تو پھر دکھ ہی ہوگا، اب اس گھر میں اب صرف قہقہے اور مسکراہٹیں ہونی چاہییں۔"
لیکن اُسوہ کے بنا تو یہ گھر ادھورا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں سارے قہقہے اور مسکراہٹیں پھیکی تھیں۔ یہ اس کی ایسی خطا تھی جس کے سجدہ سہو کا وقت گزر چکا تھا۔
سنان نے کئی بار اسے میسج لکھا مگر بھیج نہ سکا۔ وہ چاہتا تھا وہ دونوں ہی اپنا معاملہ نپٹیں، وہ بیچ میں نہ پڑے۔ ویسے بھی سب کچھ اور ہر کوئی بدل گیا تھا۔
تیسرے دن اماں نے خود ہی اس سے کہا۔
"چلو اُسوہ سے مل آتے ہیں۔" وہ فوراً تیار ہوگیا۔ وہ اوبر کر کے اس کے گھر پہنچے جو سنان نے بک کی تھی۔ مکان کے سامنے کار سے اترتے ہوئے اس نے دیکھا وہ اُسوہ کے ابو کے گھر آئے تھے۔ اس کے دل کا چور تھا یا اس کے پرائے ہونے کا احساس، وہ اس کے متعلق استفسار کرتے ہوئے جھجکنے لگا تھا۔ اب بھی خاموشی سے اماں کے پیچھے گھر میں داخل ہوگیا۔
تبسم انہیں دیکھ کر حیران ہوئیں۔ ایاس کے آنے کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ اس سے حال احوال پوچھنے کے بعد وہ اور اماں جیسے اسے بھول گئی تھیں۔ ان تینوں خواتین، اماں تبسم اور رقیہ کی باتیں اور ان کی بے تکلفی سے اس نے اندازہ لگایا کہ اماں یہاں اکثر آتی رہتی ہیں۔ چائے پی کر اماں لیٹ گئیں۔ کھانے میں وقت تھا۔ ظہر کی اذان سن کر وہ نماز پڑھنے چلا گیا۔ واپس آیا تو اندر جانے کے بجائے صحن میں رکھی کرسی سنبھال لی۔
"شاید کھانے کے بعد یا شام میں اُسوہ کی طرف جائیں گے، ہوسکتا ہے وہ خود یہاں ملنے آجائے، کیا تمہارے ساتھ ہونے کی خبر سننے کے بعد بھی وہ آئے گی؟" خود سے سوال جواب کرتے ہوئے وہ فون گیلری میں پرانی تصویریں دیکھنے لگا۔
"اب پتا نہیں کتنی چینج ہوگئی ہوگی۔" وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ حسان کی شادی کی تصویر میں اصفیاء اور شمیلہ کے ساتھ اسے دیکھ کر اس

"تم۔" انہوں نے کروٹ بدل لی۔

وہ ان کی تسلی کی خاطر کچھ دیر میز پر کاپیاں پھیلائے بیٹھی رہی پھر ان کے سوتے ہی باہر نکل گئی۔ کمرے میں ٹہل ٹہل کر بالآخر وہ باہر آیا۔ ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ تنہا نہیں تھی، اندر اماں بھی موجود تھیں، دروازہ بھی پورا بند نہیں تھا سو وہ بے دھڑک پٹ کھول کر اندر آ گیا۔ پلنگ پر اماں دروازے کی طرف پشت کیے سو رہی تھیں۔ اُسوہ وہاں نہیں تھی اور کمرے میں ایک ہی دروازہ تھا۔ وہ بنا آواز کیے دروازہ بند کر کے پلٹ گیا۔ ہال خالی تھا، باورچی خانے کا دروازہ بند تھا، وہ صحن میں آیا، اوپر چھت پر جانے والی سیڑھیوں کو دیکھا، پوری چھت پر دھوپ تھی۔ سیڑھیوں سے لگ کر چھوٹی سی گلی تھی۔ وہ دبے قدم تنگ سی گلی سے گزر کر پیچھے آیا۔ کچے صحن میں سبزیاں اور دیگر پودے لگے تھے۔ پلاسٹک کے بڑے سے پانی کے ٹینک کے پاس وہ ہاتھ باندھ کر کھڑی تھی۔

وہ آگے بڑھا اور اسے بھی کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ چہرہ پر ہاتھ پھیر کر پلٹی۔ ایاس اس کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ پہلی بار اسے سمجھ میں نہیں آیا اُسوہ سے کیا کہے۔ وہ اس کے بازو سے گزر کر جانے لگی تھی کہ اس نے سامنے آ کر اس کا راستہ روکا۔

"مجھے علم نہیں تھا کہ تمہاری شادی......"

"باقی ان تین سالوں کی ہر بات کا علم تھا؟" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"نہیں...... لیکن یہ......"

"تم نے جاتے وقت واضح کر دیا تھا کہ تمہارے لیے اپنی فیلنگز اور وعدے کے علاوہ دوسرا کچھ اہم نہیں ہے اور مجھے اس سچائی کے ساتھ جینے کی عادت ہو گئی ہے اس لیے خود کو ان فارملیٹیز کے تکلف اور تکلیف سے بچائے رکھو۔" وہ آگے بڑھ گئی۔ ایاس پھر اس کے سامنے جا کر اسے روکنے جا رہا تھا کہ وہ خود ہی رک کر اس کی طرف مڑی۔

"تم واپس آئے ہی کیوں؟ آ بھی گئے تھے تو یہاں کس لیے آئے؟ کون ہے یہاں تمہارا؟ مجھے مخاطب بھی کیوں کیا؟"

اس کی آنکھوں کی اجنبیت اور لہجے کی سرد مہری ایاس کو کوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔

"اماں کو سنان لینے آ جائے گا، ان کو پہنچانے کا تمہارا کام مکمل ہوا، تم جاؤ، شام چھے بجے کی بس ہے۔"

وہ تیزی سے گلی میں غائب ہو گئی۔ ایاس نے دونوں ہاتھ بالوں پر پھیرتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

"یہ ہی ڈیزرو کرتے ہو تم۔" وہ جانتا تھا وہ ناراض ہو گی، غصہ کرے گی، روئے گی، شکایتیں کرے گی اور پھر مان جائے گی لیکن یہ جارحیت اور انتہا وہ کبھی بھی اُسوہ سے منسوب نہیں کر سکتا تھا، بدترین تصور اور خیال میں بھی نہیں اور اب یہ ناقابل یقین اور ناقابل برداشت رویہ وہ اس سے روا رکھے گی۔

"تم نے جتنا اسے ہرٹ کیا ہے یہ اس کا پرپورشنیٹ رد عمل ہے۔" ضمیر آج کل بڑا مستعد تھا۔

"تم اسی قابل ہو، اس کو دوش نہ دو۔"

"ہاں، یہ میرا ہی کیا دھرا ہے۔"

اس نے سوچا تھا سب سے مشکل پاپا کو منانا ہو گا اور سب سے آسان اُسوہ کو۔ اس خیال کے خام ہونے کا اسے اسی وقت اندازہ ہو جانا چاہیے تھا جب پاپا نے اسے دیکھتے ہی گلے لگا لیا تھا۔ جو اداسی اور پچھتاوا تھا وہ اُسوہ کے چاچا کی مہربانی سنتے ہی اڑن چھو ہو گئے تھے۔ اس کے دل کو قرار آ گیا تھا، وہ اب بھی سب سنوار سکتا تھا، دیر نہیں ہوئی تھی۔ اب ایک مشکل لڑکی کو جیتنا تھا جو اس کی بے رخی اور خود غرضی سے قبل بڑی سہل تھی۔

وہ اماں اور تبسم کے ساتھ شام کی چائے پی رہا تھا جب وہ اس کا بیگ لے کر آئی اور اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیوں لے آئی؟" اماں نے پوچھا۔

"ایاس چھ بجے والی بس سے واپس جا رہا ہے۔" وہ ایسے گویا ہوئی جیسے معمول کی بات ہو۔ شکر تھا کہ وہ چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتار چکا تھا ورنہ اس افتاد پر اچھا خاصا سین بن ہو جانا تھا۔

"ہیں...... کیوں؟"

"اسے ضروری کام ہے، آپ رہیں ابھی، سنان لینے آ جائے گا ہمیشہ کی طرح۔" اُسوہ عام سے انداز میں کہہ رہی تھی مگر وہ بھول گئی تھی وہ دونوں یہاں تک، اس حال کو اماں کے سامنے ہی پہنچے ہیں۔

"ارے ایسے کیسے؟" تبسم نے کہا۔ "رہو ابھی پہلی بار آئے ہو ہمارے گھر، چھٹیاں گزارنے آئے ہو تو پھر ضروری کام کیسا اور اب تو فون اور زوم پر سب ہو جاتا ہے۔"

اماں باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اُسوہ کافی ٹیبل پر پھیلی بسکٹ، کیک اور نمکین کی چھوٹی پلیٹیں اور چمچے سستی سے ٹرے میں رکھ رہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہی واپس جاؤں گی، اگر ابھی جانا ضروری ہے تو چلو۔" انہوں نے کپ پرچ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اماں!" اُسوہ کا لہجہ شکایتی تھا۔ "آپ کا کون سا ضروری کام ہے؟"

"میں فون پر بات کر لیتا ہوں......" اماں سے پہلے ایاس نے کہا۔ "ہم سب ساتھ ہی واپس جائیں گے۔" اس نے اُسوہ کو دیکھا جو اماں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ شکن زدہ پیشانی لیے ٹرے اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

"یہ ٹھیک ہے، فون پر بات کر لو۔" تبسم نے تائید کی۔

"باہر بیٹھتے ہیں تبسم، اندر بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" اماں کھڑی ہوئیں۔

وہ دونوں صحن میں چلی گئیں۔ ایاس فون کرنے کے بہانے وہیں بیٹھا رہا کہ وہ پھر ہال میں آئے گی لیکن وہ نہیں آئی۔

اماں کی گھبراہٹ معمولی نہیں تھی۔ پیٹ درد سے شروع ہو کر مغرب کے بعد ان کی طبیعت اس قدر بگڑی کہ سب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ایاس انہیں فوراً اسپتال لے گیا۔ ان کا بی پی خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ اس نے گھر فون کیا اور اعجاز اور شگفتہ فوراً ادھر کے لیے نکل گئے۔ ان کا ارادہ انہیں کار سے اسی وقت شہر کے اسپتال لے جانے کا تھا۔ وہ دل کی مریضہ تھیں۔ بی پی نارمل ہونے پر انہوں نے گھر جانے کی ضد شروع کر دی۔ چوں کہ اعجاز سے اس کی بات ہو گئی تھی اس لیے وہ انہیں لے کر گھر آ گیا۔

"آپ کیوں آ گئیں؟ ڈاکٹر نے چھٹی کیسے دے دی؟" اسے بھی ان کی کیفیت کا علم تھا۔

"پاپا اور ممی آ رہے ہیں، اماں کو ابھی ساتھ لے جائیں گے، وہاں ان کے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔" انہیں سہارے سے پلنگ پر لٹاتے ہوئے ایاس نے جواب دیا۔

"سب کو کیوں پریشان کر دیا بیٹا، میری ناؤ کا سنیوگ ہے اب تو یہ زندگی۔" وہ نڈھال تھیں۔ وہ جو مسلسل سوچ رہی تھیں اسی کے تسلسل میں دوسرا جملہ بے خیالی میں ان کی زبان سے ادا ہوا تھا۔

"اب آپ فضول باتیں نہ کریں۔" اس نے ناراضی سے کہا۔ ایاس پلنگ سے دور ہوا تو وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔ تبھی تبسم پانی کا جگ لیے اندر آئیں۔

"یہاں گرمی ہو گی، میرے کمرے میں آ جائیں وہاں آرام کریں، ادھر کولر ہے، اس سے پہلے کھانا کھا لیں۔"

"ممی پاپا آ رہے ہیں، ابھی انہیں ان کے فزیشن کو دکھانا ضروری ہے۔" ایاس نے کہا۔

"اچھا۔" تبسم کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

اُسوہ جو ان کے ہاتھ سہلا رہی تھی، اسے رونا آ گیا۔ اس نے جھٹ آنکھیں رگڑیں۔ انجکشن کے زیر اثر اماں پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ تبسم ایاس کو لے کر باہر چلی گئیں۔ وہ وہیں تھی۔

اماں کی بند آنکھیں دیکھ کر سمجھنا مشکل تھا کہ وہ سو گئی ہیں یا یونہی آنکھیں بند کیے لیٹی ہیں۔ تبسم اور ایاس ہال میں بیٹھے اعجاز اور شگفتہ کا انتظار کر رہے تھے۔ رقیہ سو گئی تھی۔

انہوں نے آنکھ کھولیں۔ اُسوہ سر جھکائے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔

اُسوہ!" ان کی آواز کمزور اور دھیمی تھی۔ وہ دل و جان سے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تین سال سے دیکھ رہی ہوں تجھے، نہ آنے کی خوشی ہے نہ گئے کا غم ہے۔ باپ کے جانے کا صدمہ، یتیمی کا دکھ اپنی جگہ پھر بھی تو نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیوں کیا مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اماں......" اس نے انہیں مزید بات کرنے سے روکنا چاہا۔ انہوں نے سر ہلا کر جیسے اسے روکنے سے روکا۔

"میں اپنی آنکھوں کے سامنے تجھے تیرے گھر کا ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ تجھے اس حال میں چھوڑ کر مر گئی تو میری روح کو......"

"اماں......!" ہاتھوں میں جکڑا ان کا ہاتھ لبوں سے لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایک بار پھر اس کی شادی اور بیماری ساتھ ساتھ تھے۔

"میری بات سے انکار مت کرنا۔" انہوں نے دوسرا کپکپاتا ہاتھ اس کے گال پر رکھا۔ اس کی آواز تیز ہوئی اور ایاس گھبرا کر اندر آیا۔ پل بھر کو اس کا دل تھم گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے روتی اُسوہ سے پوچھا لیکن وہ سن کہاں رہی تھی۔

"اعجاز آیا؟"

"بس پہنچتے ہوں گے۔" اس نے پھر سسکتی اسوہ کو دیکھا۔

"ارے۔ تم رو کیوں رہی ہو بیٹا؟" تبسم نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "اس طرح اماں زیادہ پریشان ہوں گی، حوصلہ رکھو۔" اُسوہ نے سر ہلا کر دوپٹے سے آنکھیں اور چہرہ خشک کیا۔

تب ہی بیرونی دروازے پر ہوئی بے تاب دستک نے سب کو اپنی سمت متوجہ کیا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" تبسم کمرے سے باہر گئیں۔ ایاس بھی ان سے پیچھے تھا۔

اُسوہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مسلسل اماں کی صحت اور زندگی کی دعا کر رہی تھی۔ چند پل بعد ہی اعجاز اور شگفتہ کمرے میں موجود تھے۔ وہ کار سے آئے تھے۔ فوراً انہیں لے کر واپس جانا تھا مگر اماں کچھ اور ہی طے کیے تھیں۔

"یہاں میری طبیعت خراب ہونا اور ایاس کا آنا یونہی نہیں ہے۔"

"اماں! یہ باتوں کا وقت نہیں ہے، پہلے ڈاکٹر سے مل لیں پھر گھر پر سکون سے بات کریں گے۔" اعجاز نے ماں کو روکا۔

"اب عمر اتنی ہو گئی ہے کہ کسی بھی وقت میری آنکھوں سے نیل ڈھلنے کا وقت آ جائے گا۔"

"اماں!" سارے حاضرین نے گھبرا کر احتجاج بلند کیا۔

"میری بات سن لو پہلے، میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایاس اور اُسوہ کی شادی دیکھنا چاہتی ہوں۔" کمرے میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"ان شاء اللہ اماں وہ بھی ضرور دیکھیں گی آپ لیکن فی الحال ہاسپٹل جانا ضروری ہے۔" اعجاز ہی سب سے پہلے اس بے موقع فرمائش کے جھٹکے سے سنبھلے۔

"اب مجھے بھروسا نہیں بیٹا اگلا دن بھی میں دیکھ سکوں گی یا نہیں۔" وہ حد درجہ مایوس اور دل برداشتہ تھیں۔

"اماں!" شگفتہ پلنگ کے کنارے ٹک گئیں۔

"آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

اماں پر نظر لگائے کھڑی اُسوہ کے دل میں دبا پرانا درد اچھل کر اوپر آیا۔

"ہوگا نہیں ابھی اسی وقت کر دو۔" وہ رونے لگیں۔ سب گڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگے۔

"اماں! پہلے میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلیں اس کے بعد گھر جا کر طے کرتے ہیں......"

"کیا طے کرنا ہے؟ یہاں سب موجود ہیں، ایاس اُسوہ اور ان کے سرپرست بھی۔" انہوں نے دور کھڑی تبسم کو دیکھا۔

"تمہیں کوئی اعتراض ہے تبسم؟"

"یہاں موجود لوگوں میں اُسوہ پر سب سے آخری حق میرا ہے، اُسوہ اور آپ سب کے فیصلے پر مجھے کیا اعتراض ہوگا۔" انہوں نے اُسوہ کو دیکھا جو اب سر جھکائے کھڑی تھی۔

"تم دونوں کی مرضی ہے؟" اب کے انہوں نے بیٹا بہو سے پوچھا۔

"اماں! بات اعتراض اور مرضی کی نہیں ہے، آپ جو چاہتی ہیں وہی ہوگا مگر پہلے......"

"کوئی اگر مگر نہیں پہلے نکاح کر دو پھر جہاں چاہتے ہو لے جاؤ۔" اب کے ان کا انداز ضدی اور حتمی تھا۔ اعجاز نے بے بسی سے بیٹے کو دیکھا پھر اُسوہ کو۔

"میرا فون دو ذرا......" وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"میں برہان اور فرحت کو ہی قاضی کے ساتھ بلاتی ہوں۔" انہوں نے اُسوہ کی پھوپھو اور ریاض کے کزن کا نام لیا جو اسی شہر میں رہتے تھے۔

"آپ لیٹی رہیں۔" اعجاز نے انہیں اٹھنے سے روکا۔

"تم دونوں نکاح کے لیے راضی ہو؟" انہوں نے پہلے اُسوہ اور پھر ایاس کو دیکھا۔ شگفتہ اُسوہ کے قریب آ گئیں۔

"ہم سب کی یہ خواہش نئی نہیں ہے، ایاس کی بے وقوفی نے دیر کر دی ورنہ تم کب کی اپنے گھر میں ہوتیں۔"

فقرے کے درمیان میں اُسوہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ شگفتہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"گزرے وقتوں میں کچھ پچھتاوے، افسوس اور سلجھی گتھیاں ایاس کا نہیں اس کا بھی حاصل تھے۔ وہ رونے لگی۔ شگفتہ اور وہ ایک ساتھ آگے آ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ساری عمر کی حسرت، اس آغوش کی تمنا جو اس کے دل کا داغ بن گئی تھی بس ایک قدم کی محتاج تھی، ایک قدم نہ اٹھانے کی خطا عمر بھر کی محرومی کی وجہ تھی۔ اسے بڑی دیر سے اور بے وقت یہ بات سمجھ میں آئی تھی۔ دونوں رو رہی تھیں کہ بن باس دونوں نے کاٹا تھا۔

"تم میرے ساتھ آؤ۔" اعجاز نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر ایاس سے کہا۔

"آپ جیسا کہہ رہی ہیں وہیں کرتے ہیں۔" وہ ماں کو تسلی دے کر کھڑے ہوئے۔

پھر وہ دونوں سے قبول ہے کہلوا کر ہی وہاں سے روانہ ہوئیں۔ اُسوہ بھی رو دھو کر ان کے ساتھ تھی۔ وہ سیدھے اسپتال پہنچے جہاں سونوگرافی کے بعد ان کے پتے میں پتھری تشخیص ہونے کے بعد فوری آپریشن کرنا پڑا کہ پتہ پھٹنے کا خدشہ تھا۔

وہ ضد کر کے رات بھر اماں کے ساتھ ٹھہری تھی۔ صبح تبسم اس کا بیگ لے کر آ گئیں۔ تب شگفتہ نے اسے زبردستی ایاس کے ساتھ گھر بھیجا۔

اس کی بائیک پر کبھی نہ بیٹھنے والی آج منہ بند کیے اس کے پیچھے بیٹھی تھی۔ شگفتہ نے گھر فون کر دیا تھا۔ سنان گیٹ کھولے ان کا منتظر تھا۔ ایک دن میں رونما ہوئے اتنے بڑے بڑے واقعات پر اس کے اندر چار سال پہلے والا سنان جاگ گیا تھا مگر ان دونوں کی سنجیدہ شکلیں دیکھ کر زبان روکنا پڑی۔

"اماں کے ساتھ آنے کی ذمہ داری تمہاری تھی نا؟" اُسوہ نے بائیک سے اترتے ہوئے اسے کھا جانے والے انداز میں گھورا۔

"ہاں مگر وہ......" وہ اس کا جواب سنے بنا اندر چلی گئی۔

"اتنی بڑی بات کیوں چھپائی مجھ سے؟" ایاس بھی کڑے تیوروں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

"لوگو! ادھار تمہارے ایک دوسرے کی طرف

نکلتے ہیں، آپس میں لڑو، مجھے بخشو۔" اس نے ہاتھ جوڑے۔

وہ سیدھا اپنے کمرے میں آئی جواب بھی اس کا تھا۔ دروازہ بند کر کے بیگ ایک طرف رکھا اور پلنگ پر گر گئی۔ گھر میں وہ تینوں ہی تھے اسے پتا تھا ایاس ضرور ادھر آئے گا۔ کچھ دیر بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"اُسوہ!" اس نے تکیہ کانوں پر رکھ لیا۔

کچھ دیر کوشش کرنے کے بعد وہ چلا گیا۔ تکیہ ہٹا کر وہ چھت کو تکنے لگی۔

اسے بہت اور بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا تھالی میں سجا کر اسے ایاس کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اپنی بے عزتی محسوس ہو رہی تھی، بے بسی پر دل خون ہو رہا تھا۔ اماں نے یوں گھیرا تھا کہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ان کے آپریشن کی خبر کے ساتھ سب کو ایاس کی واپسی اور ان کے نکاح کا بھی علم ہو گیا اور لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ شمیلہ اور حسان بھی بچے کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔ اماں کے مطابق وہ نئی دلہن تھی سو اسے اسپتال جانے اور وہاں رکنے کی اجازت نہیں تھی۔ شگفتہ ہی ان کے پاس تھیں۔ سنان ایاس دونوں اس کے آگے پیچھے پھرتے مگر اس کے تیور نہایت خطرناک تھے۔ وہ اب بھی اس کے پیچھے باورچی خانے میں آیا تو وہ زمانے بھر کی تختی شکل پر لیے اس کی سمت مڑی۔

"تم نے پھر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو میں واپس چلی جاؤں گی۔" اس نے انگلی سے ناک پر چشمہ پیچھے کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"اُسوہ! ایک بار میری۔"

"سنان!" اس نے ہاتھ میں پکڑا ٹفن سلیب پر پٹخا۔ "تم ہی ٹفن بھر کے لے جاؤ میں واپس اپنے گھر جا رہی ہوں۔" وہ دروازے کی سمت بڑھی اور ایاس نے آگے آ کر راستہ روکا۔

"اوکے اوکے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر گویا ہتھیار ڈالے۔ "تم رکو میں جا رہا ہوں۔" وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔ وہ باہر نکل گیا۔

"فی الحال اماں سے ہی بات کرنا چاہیے۔" اسپتال جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اماں اسپتال سے گھر آ گئیں تو اب انہیں رخصتی کی جلدی تھی۔

"آ تو گئی ہے اُسوہ یہاں، اب کون سی رخصتی؟" سنان نے پوچھا۔

جتنی جلدی انہوں نے نکاح کی مچائی تھی، ولیمہ اور رخصتی بھی اسی رفتار سے مکمل ہوئے۔

☆☆☆

"کب تک ناراض رہو گی یہ ہی بتا دو۔" دادی کے کہنے پر شمیلہ اسے کمرے میں سجے پلنگ پر بٹھا گئی تھی۔ ایاس دروازہ بند کر کے پلٹا تو وہ پلنگ سے اتر کر دوپٹا سر سے گرائے چشمہ لینے آئینے کی سمت جا رہی تھی۔

"کس نے کہا تم سے کہ میں ناراض ہوں؟" وہ زخمی شیرنی کی طرح پلٹی۔

"تمہارے رویے نے، تمہاری باتوں نے اور......" وہ اس کے سامنے آ رکا۔ "اس چہرے نے۔"

"ہونہہ!" اس کے انداز پر وہ تلملائی۔ "رومانٹک ہونے کی کوشش نہ کرو۔ تم کبھی مجھے اتنا سمجھے ہی نہیں تھے کہ چہرے اور رویے پڑھنے کا دعویٰ کر سکو۔" اس کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔

"شاید!" اس نے بحث کے بجائے اقرار کیا۔ "ہم ایک دوسرے سے اس طرح بات نہیں کرتے تھے، ہم فری اور فرینک تھے، تم اپنا غصہ، جھنجلاہٹ، ڈس اپائنٹمنٹ، سب صاف مجھ سے کہنے کی عادی تھیں، اب بھی مجھے مار لو، دل کر رہا ہے تو پیٹ ڈالو مگر یہ اجنبیوں جیسا بی ہیو نہ کرو پلیز، ہمارے درمیان......"

"ہمارے درمیان تین برسوں نے ناقابلِ عبور فاصلہ کھڑا کر دیا ہے، یہ مت بھولو۔" اُسوہ نے اس کی بات مکمل کی۔ "کچھ بھی تین سال پہلے جیسا نہیں ہے۔"

"اوکے سوری، یوں گھر سے جانا میری غلطی تھی، مجھے تم سے ہر حال میں رابطہ رکھنا چاہیے تھا، پہلے تم پر غصہ تھا پھر لگا تمہاری شادی ہو گئی ہے اس۔۔۔"

"شادی ہونے کے بعد انسان مر نہیں جاتا اور غصہ کس بات کا تھا تمہیں؟ میں نے کیا کیا تھا؟" وہ عادتاً غصے میں تڑاتڑ جواب دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ اپنے برتاؤ کے اس ارتقاء اور پیش قدمی کا اسے اندازہ نہیں تھا اور اس کی چپ کے چابک جھیل چکے ایاس کے اندر کہیں اطمینان اتر رہا تھا۔

"جس طرح کہو اس طرح معافی مانگ لیتا ہوں، تمہارے پیروں میں گر جاؤں، ناک رگڑوں، ایک ٹانگ پر کھڑا ہوں، تم جو سزا دو منظور ہے بس یہ ناراضی ختم کر دو یار۔" وہ مزید قریب آیا۔

"میں ناراض نہیں ہوں۔" اس نے اسی تیز لہجے میں کہا اور جانے لگی تھی کہ ایاس نے سامنے آ کر راستہ روکا۔

"یہی تو تمہارے ناراض ہونے کا ثبوت ہے۔"

"مجھے جاننے کا اتنا زعم ہے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے تم سے شادی نہیں کرنا تھی؟" اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

"یہ جھوٹ ہے۔" اس نے یقین سے کہا۔

"یہ سچ ہے۔" اس کے لہجے نے اسے آگ لگا دی۔ تین لفظ اس نے چبا چبا کر مکمل کیے۔ "مجھے تم نہیں پسند، اس شادی میں میری مرضی نہیں شامل۔" آواز شعلے برسا رہی تھی اور آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"جھوٹ۔" ایاس کے فقرے اور چہرے کا تیقن اس کے اندر پھر طیش کی نئی لہر دوڑا گیا۔ اس کے احساسات بے دردی سے روندنے کے بعد اب اس کا یہ اعتماد اسے اپنے ساتھ سراسر ناانصافی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، اتنی آسان تو وہ ہرگز نہیں تھی۔

"ان تین سالوں میں تمہارے اور میرے جذبات ہی تو مکمل کھلے ہیں مجھ پر، وہ سب جو......" اُسوہ نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر اسے پیچھے دھکا دیا۔

"تم مجھے بھی ان جیسی ہی سمجھ رہے ہو جو تمہاری باتوں کے جال میں پھنس جاتی تھیں؟"

"اُسوہ......!" ایاس نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہی تھے کہ وہ ہاتھ جھٹک کر دور ہوئی اور اس کی طرف سے رخ موڑنے کے لیے وہ الماری کے پٹ کھول کر بلاوجہ ہی کچھ تلاش کرنے لگی۔

"مجھے بہت دیر سے سمجھ میں آیا یار۔ لیکن یہ تمہارے لیے بھی اہم ہے، بہت خاص ہے، اسے یوں غصے میں اور خفا رہ کر ضائع تو نہ کرو، یہ رشتہ، یہ رات......"

وہ پھر اس کے قریب آ رہا تھا کہ اُسوہ نے الماری کے خانے سے تہ کی ہوئی جینز اٹھا کر اسے دے ماری۔ ایاس کی بات پر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ رکی نہیں۔ الماری سے کپڑے، چادریں، تولیے، جوتے کے باکس، جو اس کی پہنچ میں تھا وہ اٹھا اٹھا کر اسے مارے جا رہی تھی۔ ہاتھ سے روکنے کی کوشش میں کچھ چیزیں نیچے گر رہی تھیں کچھ کیچ ہو رہی تھیں۔

"اس شور کا مطلب سب کچھ اور نہ سمجھ لیں۔" اس نے دراز کھول کر پرفیوم کی بوتل اس کی طرف اچھالی جسے اس نے کیچ کر لیا۔ الماری کا اس کی دسترس والا حصہ خالی ہو گیا تھا۔ ایاس نے ہاتھ بڑھا کر بوتل واپس رکھ کر دراز اندر دھکیلا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"مجھ سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں اُسوہ، معافی نہ سہی تلافی کا ایک موقع تو دو، میری سنو، اپنی کہو، مجھے بہت کچھ کہنا ہے، تمہارے اندر بھی میرے لیے بہت کچھ جمع ہے۔ میں بے وقوف تھا، پورا گدھا تھا، اپنے سوا کسی کا نہ سوچا۔"

سرخ آنکھیں، تیز چلتی سانسیں، غصے سے پھولتی ناک اور آنسوؤں کی جھڑی، وہ یک ٹک اسے

گھور رہی تھی۔

"پلیز......" اس نے نرمی سے التجا کی۔ "اپنی دوستی کا واسطہ یار۔" اس نے مزید ایک قدم آگے آ کر لجاجت سے کہا۔ اس نے یونہی روتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"اُسوہ!"

اس کی جذبوں سے بھری آواز میں اپنا نام سننے کی دیر تھی۔ دل و دماغ مزید محاذ آرائی سے مکر گئے۔

اگلے پل دفعتاً اس نے ایاس کے سینے پر پیشانی ٹکائی اور زور و شور سے رونے لگی۔ اس کا ہاتھ میکانکی انداز میں اس کے شانے کی طرف گیا۔ اس نے کندھا ہلا کر اس کا ہاتھ جھٹکا۔ ایاس نے فوراً ہاتھ دور کر لیا۔ وہ روتی رہی اور ایاس ضبط و صبر کی اعلیٰ مثال بنا یونہی ہاتھ لٹکائے کھڑا رہا۔

"مجھے تمہاری شکل نہیں دیکھنی۔" ذرا توقف کے بعد سوں سوں کرتے ہوئے سر اٹھا کر وہ پیچھے ہوئی۔

"او کے۔" اس کے لہجے کے دھیمے پن نے ایاس کو حوصلہ دیا۔

"اس طرح میری شکل نہیں دیکھے گی۔" اس نے آگے آ کر بازوں پھیلا کر اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اُسوہ نے مزاحمت نہیں کی لیکن رکے آنسو پھر شروع ہو گئے تھے۔

"میں نے تمہیں پہلی بار روتے دیکھا ہے اور وہ بھی اتنا سارا، ٹیکنیکلی تو پہلے۔"

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔" وہ مزید سہولت سے سر جماتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان گویا ہوئی۔

"او کے۔" ایاس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

اب کچھ کہنے اور سننے کا وقت تھا۔

"پانچ چھ مہینے تک تو میں غصے میں ہی تھا یعنی لاجیکلی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ کسی نے میرا موقف اور اسپیشلی تم نے میرا احساس اور جذبہ نہیں سمجھا مجھے اس کا دکھ اور افسوس تھا۔ اب تم اسے جو بھی کہو لیکن اس وقت مجھے تو یہی لگا تھا بڑی سچی محبت ہوئی ہے اور اس کی شادی کروا کے میں اس محبت کو امر کر لوں گا......" بچپن کی بے وقوفی یاد کرتے وقت جو مسکراہٹ چہرے پر بکھرتی ہے، وہی اس وقت اس کے چہرے پر بھی تھی۔ "دوستوں سے تم سب کو پتا چل جائے گا اس لیے میں نے انہیں بھی نہیں بتایا تھا کہ کہاں ہوں۔ چار ماہ میری جاب بنگلور میں ہی تھی۔ اس کے بعد موقع ملا باہر جانے کا تو پیسے نہیں تھے۔ میں نے بینک سے پرسنل لون لیا اور ملک چھوڑنے کے بعد دوستوں کو بتایا۔ وہاں جا کر اجنبی ملک اور اجنبی لوگوں کے بیچ دھیرے دھیرے عقل ٹھکانے آئی۔ جب تم نے شادی کا میسج کیا تو مجھے اور غصہ آ گیا کہ یہاں میں اکیلا کس برے حال میں ہوں اور تم شادی کر رہی ہو، مجھے لگا تم دوستی نہیں نباہ رہی ہو صرف بڑوں کی باتیں مان اور سن رہی تھی۔ میرا ماننا یہ تھا کہ جب میرے خلاف ہو جائیں، مجھے غلط سمجھیں لیکن تمہیں میرے ساتھ ہونا چاہیے، یہ میری خود غرضی تھی۔ بعد میں مجھے ریلائز ہوا کہ یہ ہی تو تمہارا بھی مان ہو گا کہ کسی کی نہ سہی میں تمہاری بات سنوں سمجھوں، مانوں۔ پھر سنان نے تمہاری اس خبیث کے ساتھ تصویر سینڈ کی، تب مجھے تمہارے الفاظ "سمجھنا میں مر گئی ہوں۔" کی اصل روح سمجھ آئی کہ میرا دل تصویر دیکھتے ہی بند ہو گیا تھا، اس وقت مجھے ریلائز ہوا میں نے تمہارے اور اپنے ساتھ کیا کیا ہے، تمہاری اور اپنی محبت مجھ پر ایک ساتھ آشکار ہوئی تھی۔ ایک پل میں سب الٹ پلٹ کیسے ہوتا ہے، دنیا کیسے بدل جاتی ہے اس تجربے کے بعد میں نے تسلیم کیا کہ واقعی میں گدھا ہوں۔ میں اتنا بڑا نالائق تھا کہ لاشعور میں منزل طے کر لینے کے باوجود راستے کے سارے منظروں میں الجھ رہا تھا۔ تمہیں کسی اور کو سونپ دیا گیا تب احساس ہوا میں ادھورا رہ گیا ہوں، اپنے وجود کا نصف حصہ چھن گیا۔ تب میں نے قبول کیا مجھے تم مکمل کرتی

تھیں۔ پھر بہت ہنسی آئی کہ میں نے اصفیاء سے محبت کے دعوے کے ساتھ اس کی شادی کروائی تھی۔ اپنی محبت کسی اور کے حوالے کرنا ناممکن ہے، یہ فلموں میں ہی ہو سکتا ہے اصل زندگی میں نہیں، تمہیں چھیننے کے لیے میں نے اسے قتل کرنے کا بھی سوچ لیا تھا۔"

اُسوہ بت بنی سن رہی تھی۔

"تم دور ہوئیں تو میرا ضمیر بھی زندہ ہو گیا، تمہاری جگہ آئینہ دکھانے لگا۔ میں نے بھی تو محبتیں چھینی تھیں، پیاروں اور عزیز دلوں سے دور کیا تھا خود کو اصفیاء کو، مان توڑا تھا، اپنے علاوہ کسی کا نہیں سوچا تھا، ایک ایک کر کے سب واضح ہونے لگا۔ خود پر گزری تو دوسروں کا سہا نظر آیا۔ اصفیاء نے مجھے یوز کیا تھا اور جوانی کے جوش میں میں نے اس کے والدین کو کتنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا اس کا احساس ہوا۔ تب پاپا کی تڑپ بھی سمجھ میں آئی کہ وہ کیوں ان کا ایڈریس جاننے کو بے چین تھے، وہ مجھے اپنی غلطی سدھارنے کا موقع دے رہے تھے، میں ان کی بات مان کر سب ٹھیک کر سکتا تھا مگر مجھ پر محبت نبھانے کا بھوت سوار تھا۔ میں فوراً واپس آ جاتا لیکن مجھ میں حوصلہ نہیں تھا تمہیں کسی اور کے ساتھ دیکھنے کا، مجھے ڈر تھا جذبات میں میں پھر کوئی بے وقوفی کر بیٹھوں گا۔ ایک بار پھر پاپا ممی اور سب کو شرمندہ کرنے کا خیال مجھے روک رہا تھا۔ زندگی اتنی مشکل اور بھاری بھی ہو جائے گی کبھی نہیں سوچا تھا۔ تم اب میری نہیں یہ خیال زندگی کو بے رنگ کر گیا تھا اور ممی پاپا اماں سنان حسان بھائی سب کے چہرے واپس بلا رہے تھے۔ وہ شکست خوردہ، اداس مایوس دکھی ایاس برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ پہلے ہی انہیں اتنا بڑا داغ دیا تھا مزید ایک اور زخم کی وجہ نہیں بن سکتا تھا۔ خود کو سنبھالنے اور تمہیں کسی اور کے ساتھ دیکھنے کی ہمت جمع کرنے میں اتنا وقت لگ گیا۔ میں نے دل کو پھر اس وقت دھڑکتے سنا جب اماں نے کہا تمہاری رخصتی ہوئی ہی نہیں تھی۔ سب نے جانے انجانے خوب بدلا لیا مجھ سے۔ ویسے تم کیوں یہاں واپس نہیں آئیں؟"

"اس کی وجہ کا بیج تمہارے جانے سے بہت پہلے میرے اندر جڑ پکڑ گیا تھا......" یہ اعتراف اور اقرار کی رات تھی۔ "تم نے جو کیا اس کا دکھ اور غصہ تھا پھر جب مامی نے کہا میں نے انہیں کیوں نہیں بتایا، انہیں مجھ سے ایسی امید نہیں تھی، مجھے گھر میں یہ بات بتا دینی چاہیے تھی۔ تب بھی میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا مگر جب سنان کے ساتھ ان کا نارمل رویہ دیکھا تو مجھے لگا ہمارا قصور ایک سا ہے پھر سلوک الگ الگ کیوں، یہی فرق میری کم ظرفی نے تاک لیا۔ مامی سے دوستی اور محبت کے باوجود مجھے ہمیشہ ایک کمی کھلتی تھی، وہ تم سب کی طرح مجھے کیوں نہیں لگاتیں، میری پیشانی پر بوسہ کیوں نہیں دیتیں، میں ساری عمر ان خیالوں کو نظر انداز کرتی رہی، یہ حسرت بن گئے اور پھر آخر میں کھینچنے پر اتر آئے۔ مامی کے سرد رویے نے مجھے بہت دکھی کیا۔ ابو کے ساتھ جاتے ہوئے بھی میرا ارادہ نہیں تھا کہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جاؤں گی۔ جب جاب کی آفر ملی تو سوچا یہی تو میرا گھر ہے، یہیں تو میرا سگا رشتہ ہے، مجھے یہیں رہنا چاہیے۔ مامی کی طرف سے خاموشی پر بھی میں دل برداشتہ تھی۔ میں اندر کہیں منتظر تھی وہ فون کریں گی اب آ جاؤ اُسوہ اور میں دوڑ پڑوں گی، پھر انا بیچ میں آ گئی۔ اس کے بعد سب اتنا جلدی جلدی ہوا کہ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ شادی کی بات پر تم نے میسج کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے سوچا تمہیں پروا نہیں تو وہ چاچا کا بیٹا ہو یا کوئی اور کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے احساس سے عاری ایک لاش بن کر ہی باقی زندگی گزارنی ہے تو پھر ابو کی خواہش کیوں نہ پوری کر دوں۔ وہ دور ایسا تھا کہ مجھے کچھ فیل نہیں ہوتا تھا۔ مجھے کسی کی پروا تھی نہ اپنا احساس تھا۔ ابو کی وفات نے میرے منجمد جذبات پگھلا دیے تھے ورنہ جانے کیا ہوتا۔ اس کے بعد کا وقت حقیقتوں سے آشنائی کا تھا۔ میں نے جذباتی اور نوخیز احساسات کی عمر پار کر کے سمجھ دار اور ذمہ دار لڑکی تک کا سفر طے کیا۔ دنیا کو الگ نظروں سے

دیکھا، رشتوں پر غور کیا، کتابی باتوں اور آئیڈیلائز کرنے والے فلسفوں کی عینک اتار کر حقیقت کے عدسے سے دیکھنا شروع کیا جس کا نچوڑ یہ ہے کہ ہم اپنی بے شمار کمیوں اور خامیوں کے ساتھ دوسروں سے ہر معاملے میں کاملیت کی امید رکھتے ہیں، اپنے اندر جھانکنے کے بجائے ان کی ذرا سی لرزش، غلطی پر ہم انہیں کینسل کرنے میں دیر نہیں کرتے۔ میں تبسم آنٹی کو اب تک بھی امی کہہ کر نہیں پکار پاتی ہوں، جھجک ہے، عجیب لگتا ہے لیکن اگر اماں نے مجھے وہیں رہنے دیا ہوتا تو میں بچپن سے امی لفظ سے مانوس ہوتی، میں ایک نارمل فیملی میں پلی بڑھی ہوتی۔ ابو انصاف پسند تھے، وہ اپنے گھر اور رشتوں کو بیلنس کرنا سنبھالنا جانتے تھے۔ تبسم آنٹی بھی اچھی فطرت کی مالک ہیں۔ اِن جیسے لوگ دنیا میں کم ہیں مگر ہیں، اس بات پر کوئی یقین کرنے تیار نہیں ہوتا۔ اماں نے بھی میری بھلائی کی خاطر شک اور احتیاط کو ڈھال بنالیا تھا۔ یہاں بھی مامی کے ساتھ اماں کا رویہ ایسا ہی تھا۔ اماں کے بے انتہا محتاط اور مشکوک رویے نے تبسم آنٹی اور مامی کو بھی میرے معاملے میں محتاط اور ایک مخصوص فاصلہ رکھنے پر مجبور کیا۔ انہیں کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ سب کے برتاؤ اور عمل کو سگا سوتیلا کی عینک سے ہی دیکھتی تھیں اور پھر اسے انصاف ناانصافی، بوجھ فرض، دل سے زبردستی سے جیسے کئی پلڑوں میں تولتی تھیں اور ان کے حساب کے بعد منفی پلڑا ہمیشہ جھکا ہی رہتا تھا۔ آنٹی اور مامی نے ہمہ وقت ترازو میں تلنے سے بچنے کی خاطر پھونک پھونک کر قدم اٹھایا۔ اماں یہ سب میری محبت میں کرتی تھیں اور وہ دونوں کسی بھی الزام سے بچنے کے لیے۔ تینوں تمام تر نیک نیتی کے باوجود یہ نہیں جان پائیں کہ ان کے رویوں نے خلوص اور محبت کے باوجود مجھے تشنہ رکھا۔ دنیا میں فیری ٹیلو جیسی ظالم سوتیلی مائیں اور بہنیں بہت ہیں، یوسف علیہ السلام کے بھائیوں جیسے خودغرض، حاسد اور سفید خون والے رشتوں کی بھی کمی نہیں مگر اسی دنیا میں تبسم آنٹی اور مامی بھی موجود ہیں اور یہ دنیا انہیں

قبول کرنے، سراہنے کی بجائے انہیں تنگ دری پر چڑ... کے لیے مجبور کر دیتی ہے اور پھر یہاں میرے جیسے ناشکرے، احسان فراموش بھی ہیں جو میرے ... کرنے کی بجائے ذرا سی کمی کو دل سے لگا لیتے ہیں۔"

وہ واقعی سمجھ دار ہوگئی تھی۔

"دنیا کے لیے میں قابلِ رشک زندگی جی رہی تھی، ماموں کے گھر میں پوری شان اور استحقاق کے ساتھ رہتی تھی، مامی سے دوستی تھی، اپنی مرضی سے تعلیم حاصل کر رہی تھی، دوسری شادی اور بچوں کے بعد بھی باپ غافل نہ تھا اسی لیے کوئی میرے اندر جھانکتا نہیں تھا۔ اگر اماں، تبسم آنٹی، ابو اور مامی کو کچھ وقت اور موقع دیتیں، پرکھتیں پھر فیصلہ کرتیں تو وہ زیادہ مناسب فیصلے ہو سکتے تھے۔ سب میری بھلائی چاہتے تھے پھر بھی ان کی کوششوں نے میرے اندر چھوٹے چھوٹے خلاء چھوڑ دیے۔ میں نے بھی حاصل نعمتوں کے بجائے ذرا ذرا سی کمیوں کو دل میں بڑی جگہ دی۔ مجھے لگتا ہے ہم سب کے اندر وہ بچہ چھپا ہوتا ہے جسے ہر بات میں خود کو وکٹم بنا کر بسورنے کا شوق اور عادت ہوتی ہے، ہمیں اس بچے کو چپڑیں لگا لگا کر سیدھا کرنا چاہیے، جو میں نہیں کر سکی۔ یہ سب ریئلائز ہونے کے بعد میں نے وہ کیا جو حشر میں مجھے ابو کے سامنے شرمندہ نہ کرے۔ فاطمہ کی فیس ابو کی پینشن پوری نہیں کر سکتی تھی، میں نے وہیں رہنے کا طے کیا، چاچا کی ڈیمانڈ ٹھکرا دی، میں اپنی بہنوں اور آنٹی کو یوں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی تھی، میں نے تبسم آنٹی کی قدر سیکھی اور میری اس سوچ نے انہیں بھی میرے لیے سب کے سامنے ڈٹ جانے کا جواز اور حوصلہ دیا۔ دنیا کا سب سے بڑا سچ یہ ہے کی یہ لین دین سے چلتی ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں، ہمیں اسے اچھی بات کی طرح قبول کر لینا چاہیے۔۔۔ جب مجھے اپنی ناشکری کا احساس ہوا تو نادم دل و دماغ کسی کا سامنا کرنے تیار نہ تھے۔ میرے پاس ہیرے جیسی مامی تھیں اور میں نے اتنی بے قدری، ناشکری

کی۔ مامی سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں نہ اب ہے۔ وہ ستان سے نہیں صرف مجھ سے اس لیے ناراض تھیں کہ میں تمہیں ستان سے بہتر جانتی تھی، ان سے یہ بات ستان سے زیادہ آسانی سے کہہ سکتی تھی اور میری طرح انہیں بھی لگتا تھا کہ تم میری بات نہیں ٹال سکتے۔ تم نے جیسے میرا مان اور یقین توڑا تھا ویسا ہی میں نے بھی تو ان کے ساتھ کیا تھا۔ اماں سے اب بھی مجھے کچھ نہیں کہنا۔ اس عمر میں انہیں کچھ جتانا اور سمجھا کر دکھی کرنا درست نہیں، مجھے ان سے شکایت بھی نہیں۔ انہوں نے وہی کیا تھا جو انہیں درست لگا۔ لیکن مامی کے لیے مجھے لگتا ہے میں ان سے اسی وقت آنکھ ملا پاؤں گی جب مجھ میں ان سے یہ سب کہنے کی ہمت ہوگی۔ سچ کہوں تو میں بزدل ہوں اور ان کے سامنے اپنی غلطیوں اور غلط گمانوں کا اعتراف کرنے سے بھاگ رہی ہوں۔"

"تم بزدل تو بالکل نہیں ہو۔" اِیاس نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "باقی باتیں بریک کے بعد، ابھی بہت بھوک لگی ہے۔"

"پیٹ تو میرا بھی دہائیاں دے رہا ہے۔" اس نے آواز کرتے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

"آج میں تمہارے لیے کچھ بناتا ہوں۔"

"ہاں تین سال میں تو تم کھانا بنانا سیکھ گئے ہوگے۔" وہ بھی پلنگ سے اتر گئی۔

"آملیٹ اور چائے کے علاوہ کچھ نہیں آیا مجھے۔" اِیاس نے پہلے درجے پر ہی اس کی توقعات کے نیچے سے زینہ کھینچ لیا۔

"تین سال بھی برباد ہی کیے، تم جاؤ میں یہ سب اتار کر آتی ہوں ورنہ ان کا شور سارے گھر کو جگا دے گا۔"

"ہمم۔" وہ چلا گیا۔ اس کا لہنگا ہلکے نفیس سے کام والا تھا۔ اس نے کلائیاں اور گلا خالی کیا۔ وزنی بارڈر والا دوپٹا وہ پہلے ہی اتار چکی تھی۔ وہ بنا دوپٹے کے ایسے ہی باہر آگئی۔

وہ دونوں آملیٹ بریڈ سے انصاف کر رہے تھے جب ہال میں آئی شمیلہ ٹھٹک کر رک گئی۔ صبح کے چار بجے دلہا دلہن آمنے سامنے کرسی پر بیٹھے کھانے میں مشغول تھے۔

"کم سے کم آج تو سحری نہیں کرنا چاہیے تم دونوں کو۔"

"بھوک تو دن رات اور موقع نہیں دیکھتی نا بھابھی!" اُسوہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کھٹ پٹ کی آوازوں پر باہر نکلیں شگفتہ ہال میں آئے بنا پلٹ گئیں۔ ان کے گھر میں رونق لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنا خالی بیگ الماری کے اوپر چڑھا کر نیچے اتری تو پیچھے شگفتہ کھڑی تھیں۔

"کوئی کام تھا؟ مجھے آواز دی ہوتی۔" انہوں نے اسٹول جگہ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں آؤ۔" پلنگ کے کنارے بیٹھ کر انہوں نے اسے پاس بلایا۔ وہ سر جھکائے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم میرے پاس آئیں ان دنوں میں چوتھی بار امید سے تھیں۔ مجھے بیٹی کی بہت خواہش تھی، ساڑھے تین چار سال کی تم مجھے اپنی بیٹی ہی لگی تھیں۔ تم دن رات میرے ساتھ رہتیں، میرے ساتھ سوتیں، مجھے تمہارا ہر کام اپنے ہاتھ سے کر کے سکون ملتا تھا، میری ممتا تمہاری ماں کی کمی ہر قیمت پر مٹانا چاہتی تھی۔"

وہ بنا تمہید اس انوکھی بات پر حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ "پھر ایک دن میں نے تمہاری پھوپھو اور اماں کی بات سن لی۔" انہیں اب بھی وہ جملے لفظ بہ لفظ یاد تھے۔

☆☆☆

"اماں! کل کو اس کی اپنی بیٹی ہو جائے گی تو وہ اُسوہ کو منہ بھی نہیں لگائے گی اور اس بچی پر اس طرح جھڑکنے کا کیا اثر ہوگا؟ آپ نے کیسے اسے شگفتہ کو سونپ دیا ہے؟ اس کی رسی کھینچ کے ہی رکھیں اور اُسوہ

کو اس سے اتنا مانوس اور قریب نہ ہونے دیں۔"

سمجھ دار اور جہاں دیدہ بیٹی کی بات اماں کے دل کو لگی۔ اعجاز اور شگفتہ کی بیٹی کی شدید آرزو بھی کوئی راز نہ تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اس کی آمد کے بعد اُسوہ کو فی الوقت مل رہا پروٹوکول ختم ہو جاتا۔ وہ اسے اپنے پاس سلانے لگیں، شگفتہ ہی اسے کھانا کھلاتیں، نہلاتیں، تیار کرتیں مگر اب اماں ان کے سر پر بطور نگراں اور مالک موجود ہوتیں۔

ان کی باتیں اور یہ نگرانی شگفتہ کا دل برا کر گئی تھی پھر قسمت نے ان سے بیٹی جنم دینے کا سکھ بھی چھین لیا۔ پانچویں ماہ میں ان کا مس کیرج ہو گیا۔ انہیں لگا نند اور ساس کی خواہش پوری ہو گئی ہے۔ لاشعوری طور اُسوہ اور اپنی اولاد میں روا رکھا ایک انچ کا فرق دنیا میں آنے سے پہلے کھو جانے والی بیٹی سے ان کی وفا تھی۔ نیک نیت اور خلوص رکھنے والی عورت کو چند الفاظ بڑا گہرا زخم دے گئے تھے اور انجانے میں قائم ہوا ان کے مابین کا یہ ایک انچ کا فاصلہ اُسوہ کی زندگی کا لامتناہی صحرا بن گیا تھا۔

☆☆☆

"اللہ جانتا ہے میں نے کبھی تمہیں اس سے کم نہیں رکھا مگر اس کے ساتھ ایک سچ یہ بھی ہے کہ بیٹی کا چھن جانا اور اماں کی بات کبھی بھی میرے دل سے نہیں نکلی اور یہ خلش کب میرے عمل میں داخل ہوئی مجھے پتا ہی نہیں چلا......" وہ رونے لگیں۔ "جس نے تمہیں بھی......"

"مامی!" وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر رو پڑی۔ جب سے ایاس نے انہیں اُسوہ کا حال دل سنایا تھا وہ بے چین تھیں۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا ان کے ایک انچ کے فاصلے نے اسے کتنا دور کر دیا تھا۔ کاش وہ ساس کی دیگر باتوں کی طرح یہ بات بھی در گزر کر دیتی لیکن عورت کا دل ایسا ہی ہے۔ کوئی معمولی بات بھی گہری چوٹ دے کر دل میں بیٹھ جائے تو پھر عقل مند اور سمجھ دار عورت بھی منطق بھول جاتی ہے۔

انہوں نے اسے خود سے الگ کر کے اس کا ماتھا چوما۔

"مجھے ایاس نے بتایا، تم اس سے خفا ہو۔ ہم دونوں کو یوں دیکھنا اس کے لیے بڑا مشکل تھا۔ اب ساری فضول سوچیں ذہن سے نکال دو۔ جب ریاض بھائی نے تمہارے رشتے کی بات کی تو میں نے اعجاز سے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، اُسوہ ہماری بیٹی ہے۔ مگر وہ ایاس سے حد درجہ متنفر تھے۔ انہوں نے کہا اس نالائق کے لیے وہ تمہاری زندگی برباد نہیں کر سکتے۔ کیا بھروسا کل کو وہ باہر شادی بھی کر لے، گھر چھوڑنے کے بعد اس سے کسی بھی حد تک جانے اور کچھ بھی کر گزرنے کی توقع تھی انہیں۔ وہ اس کی وجہ سے پھر سب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ تب میں نے اللہ سے مانگنا شروع کیا۔ میں جانتی تھی تمہیں یہیں رہنا ہے، تمہیں ایاس سے محبت ہے اور اللہ نے میری سن لی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔

تب ہی کب سے دروازے پر کھڑے ایاس اور سنان نے اندر جھانکا۔

"تم کیا کن سوئیاں لے رہے ہو؟" انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"کن سوئیاں نہیں ممی، میں ایاس سے کہہ رہا تھا اس لو اسٹوری کے مین کریکٹر آپ اور اُسوہ ہیں، ایاس تو ہے ہی نہیں اس میں۔"

"ہے تو، یہ ولن ہے ہماری لو اسٹوری کا۔" اُسوہ نے بسورتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اسے نوٹس پیریڈ تک اسکول میں نوکری جاری رکھنا تھی۔ وہ مکمل ہونے کے بعد ایاس اور وہ ایک ساتھ شارجہ جانے والے تھے۔ وہ فوراً نوکری چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا تھا لیکن جلد ہی اس کا واپس لوٹنے کا ارادہ تھا۔ وہ ویک اینڈ پر آتی تھی پھر پانچ دن کے لیے واپس دبئی۔ اسے وہاں کے اخراجات کی فکر تھی مگر تبسم نے اسے یقین دلایا تھا کہ سب مینج ہو جائے گا۔ ویسے بھی فاطمہ کی پڑھائی مکمل ہو گئی تھی۔ ابھی بھی وہ صبح جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے اصفیاء پچھلے دو مہینوں سے اپنے پیرینٹس کے گھر ہے؟" اس نے کن انکھیوں سے ایاس کو دیکھا۔

"کیوں؟" اس نے لیپ ٹاپ سے پل بھر کو نظر ہٹا کر پوچھا۔

"بڑی دلچسپی ہے تمہیں اب بھی اس میں؟" وہ جیسے اس جواب اور پھر اس کی درگت کے لیے تیار تھی، کمر پر ہاتھ رکھ کے پلٹی۔

"اتنے دن سے میکے میں ہے تو ضرور کوئی ان بن ہو گی، کیوں نہ ان کی صلح کروا دی جائے؟ آخر میرا کرایا رشتہ نہ ٹوٹے یہ بھی مجھے ہی دیکھنا ہو گا نا۔" اس نے زمانے بھر کی سمجھ داری چہرے پر سجائی۔

"تمہاری ٹانگیں نہ توڑ دوں!" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اب تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی۔" اس کی آواز میں افسوس تھا۔

"کیوں؟"

"تم مجازی خدا جو ہو گئے ہو۔" وہ واپس الماری کی سمت مڑ گئی۔

"اگر تم عمل سے توبہ کر لو تو کہہ کر دل ہلکا کرنے کی اجازت ہے۔" وہ حاتم طائی بنا۔

"رہنے دو۔ کہتے کہتے دل توبہ سے مکر گیا تو؟"

"یہ بھی ہے، ویسے تم کیا کر رہی ہو وہاں؟ یہاں آؤ، میرا محبت کا سفرنامہ اور ہجر کی داستان تو تم نے مکمل سنی ہی نہیں۔" وہ الماری کھولے جانے کیا کر رہی تھی۔

"اس میں کیا ہے؟" اس نے الماری سے بیگ پیک نکالتے ہوئے پوچھا۔

ایاس فوراً لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر کھڑا ہوا مگر تب تک وہ بیگ کھول چکی تھی۔ اندر جھانکنے کے بعد اس نے پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ پلنگ پر الٹ دیا۔ انواع اقسام کے ڈھیروں ہیئر بینڈ اور رنگز بستر پر بکھر گئیں۔

"جہاں بھی نظر آتے تھے میں خود کو خریدنے سے روک نہیں پاتا تھا۔" وہ مسکینیت چہرے پر سجا کے منمنایا۔ اُسوہ نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے خود کو روکا لیکن پھر بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

"اتنی ہنسی کس بات پر آ رہی ہے تجھے؟" اماں دروازے میں نمودار ہوئیں۔ ان کے پیچھے شگفتہ بھی۔

"تین سال شارجہ میں ایاس نے یہ جمع کیا ہے۔" اس نے ہنسی روک کر بستر کی سمت اشارہ کیا۔ انہوں نے قریب آ کر دیکھا اور پھر اسے ملامتی نظروں سے گھورا۔ جب کہ شگفتہ حیرت سے کبھی بستر اور کبھی بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

"تمہیں میرے ہاتھ کے سونے کے کنگن یاد نہیں آئے ایاس!" انہوں نے لہجے میں مصنوعی درد سمویا۔ ایاس بے بسی سے ماں کو 'بخش دیں' والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اُسوہ کے ساتھ ہنسنے لگیں۔

"بویا نہ جوتا اللہ نے دیا پوتا! تجھے بیٹھے بٹھائے مل گیا ہے تو اس کا شکر ادا کر۔" اماں تو ہمیشہ سے نیم ایاس تھیں۔

"اور نہیں تو کیا اماں۔" وہ دادی کے قریب آیا۔ "ٹھیک ہے، پھر کل سے میں کالج والے حلیے میں واپس آ جاتی ہوں۔"

"نہیں!" اماں نے ڈپٹ کر کہا۔

"بالکل!" شگفتہ نے سر ہلا کر اکسایا۔ اُسوہ نے اسے دیکھ کر سوالیہ ابرو اچکائے۔

"میں اپنی رائے ان معزز خواتین کے سامنے نہیں دے سکتا۔" اس نے مودبانہ طریقے سے کہا۔

"صاف کہو کمرے سے نکلیں! ہم چلے، آ جاؤ اماں۔" شگفتہ ساس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

"ارے نہیں مامی رکیں تو...... اماں...... سنیں تو......" اُسوہ مسکراتے ایاس کو گھور کر ان کے پیچھے لپکی۔

☆☆

پچھلی قسط کا خلاصہ

خاص۔

فردوس گوہر گھر لوٹی تو بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی شناخت پالی تھی اور وہ اس حقیقت پر مطمئن تھی۔

منتاشا نے فردوس کو اپنی باجی کے رشتے کے بارے میں بتایا کہ پانچ مہینوں میں شادی ہو جائے گی۔

عدن خلیل کے ساتھ فردوس گوہر کے گھر آتی ہے۔ عدن خلیل کا تعارف اپنا منگیتر کہہ کر کرواتی ہے۔ خلیل نے عدن کے سامنے بالکل ایسے ظاہر کیا جیسے فردوس گوہر اور وہ کبھی ملے ہی نہیں۔

فردوس گوہر اپنا گھر دکھاتی ہے اور وہ دونوں بہت متاثر ہوتے ہیں گھر کی خوب صورتی سے۔

تینوں مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگتے ہیں اور لکڑی کی سیڑھیوں کے سب سے اونچے اسٹیپ پر منتاشا ابراہیم اپنے آپ کو بونا محسوس کرتی ہے۔

بختاور نے اس شام اماں اور ابا کے چہرے پر شام اترتے دیکھی تھی جب کنیزاں سکندر سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

تمکین کی پھوپھو اس کے لیے ایک لڑکے کا رشتہ لاتی ہیں۔ ابا جمال دین اس سے پوچھتے ہیں۔ وہ اپنی رضامندی دے دیتی ہے۔ اس سہ پہر جمال دین اپنی بہن اور سارے زمانے کے سامنے سرخرو ہو گیا تھا۔

سیرت بوا سے پوچھتی ہے کہ اگر مجھے یونیورسٹی میں کوئی لڑکا پسند آ جائے تو۔ بوا کہتی ہیں کہ اس سے کہنا کہ اپنے ماں باپ کو لے کر آئے۔ مجھے پتا ہے کہ تم زندگی میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کرو گی۔

آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں سب جمع تھے۔ جہاں مٹی کے برتن، گھروندے بنانے کی ورکشاپ تھی۔ سیرت وہاں کسی کام سے آئی تھی اور اس نے بھی ایک صراحی بنائی۔ سرخاب خان اس سے ٹکرایا تھا، سیرت کو اپنے دل کے چار خانے ہاتھ سے جاتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سامنے ایک اپالو کھڑا تھا۔

دوسری ملاقات سرخاب خان سے سیرت کی ہاسٹل روڈ کی طرف ایس ٹی سی کوریڈور میں ہوئی تھی۔ سیرت اپنی سالگرہ کا کیک اس کو دیتی ہے۔ سرخاب خان انکار کر دیتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتی ہے کہ۔
"کیا تم لمحوں کی واردات پر یقین رکھتے ہو۔" سرخاب خان کہتا ہے کہ وہ ایک زمینی و حقیقی انسان ہوں۔

بارہواں باب

تلاش گمشدہ

ہاڑاہانیا وے ایک بوٹا لسوڑے دا
ویلا خوشیاں دا آیا جوڑا رب نے بنایا
ہاڑاہانیا وے اک بوٹا کیر دا
دل رکھ بجناں ذرا تک بجناں
ہاڑاہانیا وے اک ہٹی سنار دی
میڈی بجناں دہائی تمیں لک دی لکائی
گل تیرے میرے پیار دی
ہاڑاہانیا وے چڑھ آئیاں نے ہنیریاں
ساڈا جانڑ دا اے رب بھاویں بھل جاوے

جگ

یاداں بھلنڑ نہ تیریاں
ہاڑاہانیا وے

بڑے شہروں کے بھی دانت ہوتے ہیں اور جب انہیں بھوک لگتی ہے تو یہ انسانوں کو بھنبھوڑنے لگتے ہیں کھانے لگتے ہیں۔

☆☆☆

وہ کتنے ہی دن سے ان دونوں کی خاموشی کو محسوس کر رہی تھی جیسے وہ دونوں اپنے دھڑ سے پھر رہی ہوں مگر روح کہیں خلاؤں میں معلق ہوئی پھرتی ہو۔ دیکھا جائے تو کتنی بڑی نعمت ہے کہ انسان جس احساس میں ہو وہی محسوسات اوڑھے پھر رہا ہو جیسے کہ کنیزاں اور سیرت۔ حمکین نے اس بات پر انہیں غائبانہ خراج تحسین پیش بھی کر دیا تھا۔

شام ڈھلنے سے ذرا پہلے جب پرندے ٹولیوں کی صورت میں اپنے گھونسلوں کی طرف اڑے جاتے تھے اور خنکی سے تھر تھرا کر لوگوں نے اپنے بازو باندھے ہوئے تھے تو وہ اور سیرت اسپورٹس گراؤنڈ کی طرف چہل قدمی کرتی ہوئی نکل آئی تھیں۔

"تم نے کبھی محبت کی ہے حمکین؟" سیرت نے سڑک پر پڑے ایک ننھے سے پتھر کو ٹھوکر کے حوالے کر دیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے، کب ہوتی ہے، کیسے ہوتی ہے، تجربہ نہیں ہوا مگر مشاہدہ کر رہی ہوں آج کل۔ مجھے......"

وہ اتنی سیدھی بات نہیں تھی کہ سیرت پتھر اڑائے جاتی وہ لمحے بھر کو رک سی گئی تھی۔

"کس کو محبت میں مبتلا دیکھ رہی ہو آج کل؟ تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟"

"یونیورسٹی میں ہاسٹل میں ایسی کہانیاں تو بہت ہیں کوئی سی بھی اٹھالو۔" حمکین نے اس نادان لڑکی کو ہنس کر دیکھا تھا۔

لاعلمی سے بڑی دنیا میں کوئی نعمت نہیں اتری ہوگی۔

سامنے جغرافیہ کی لڑکیاں بیڈ منٹن کھیل رہی تھیں۔ وہیں کی چڑیا اڑتی ہوئی سیرت کے سامنے سرمئی سڑک پر آگری تھی جہاں وہ پتھروں کو ٹھوکروں پر رکھے ہوئے تھی، چڑیا کو بھی یوں ہی اس نے ٹھوکر لگائی تھی۔

"افسوس کی بات ہے۔" ریکٹ تھامے پسینے میں شرابور چڑیا کے پیچھے بھاگتی ہوئی وہ لڑکی، سیرت کو لتاڑ گئی تھی۔ مگر یہاں کوئی اثر تک نہ ہوا تھا۔

"ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"یہی کہ جب کسی کو محبت کا بخار چڑھتا ہی تو وہ پریشانی پر نظر آنے لگتا ہے جیسے کیتی آرا کے چہرے کے اوپر ابھر آتا تھا۔"

حمکین جمال کو ہمیشہ انہوں نے زمانے سے بے خبر اور کام سے کام رکھنے والی کا ہی لقب دیا تھا مگر آج وہ انہیں آئینے دکھا رہی تھی۔

"تم۔ تمہیں کوئی غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔"

حمکین نے سامنے مکئی کے سٹے پر ایک ننھی سی چڑیا کو ٹونگتے ہوئے دیکھا تھا جو شاید اس کی نظروں کے لمس سے ہی ڈر کر پھر سے اڑ کر کہیں گم ہو گئی تھی۔

"ہاں شاید غلط فہمی بھی بہت آسانی سے ہو جانے والی چیزوں میں سے ایک ہوتی ہے تو مجھے بھی ہو گئی ہوگی۔"

شام کی چھتری تلے سب سیاہ ہو گیا کچھ روشنیاں جگنوؤں جیسی چمکتی تھیں۔ کنیز کا پریکٹیکل تھا تو اس نے آج کچھ دیر بعد ہی آنا تھا تو وہ دونوں ادھر کو نکل آئی تھیں۔ کچھ لڑکیاں اپنی اسکوٹیاں بھگائے پھر رہی تھیں۔ پاس ہی ایک گروپ کسی بحث میں الجھا ہوا تھا تو وقفے وقفے سے شور شرابے کے ساتھ کچھ الفاظ بھی کانوں میں پڑ جاتے تھے۔

"مرد ہمیشہ ہی عورت کی خود اعتمادی سے خوف زدہ رہا ہے۔"

دور دور تک جیسے ایک قہقہہ پھسل گیا۔

"غلط...... غلط۔ مرد ہمیشہ عورت کے حسن سے خوف زدہ رہا ہے، خود اعتمادی تو آخری چیز ہو سکتی ہے۔" حمکین نے جوتے اتار کر ٹھنڈی سڑک کو اپنے پیروں کے تلوؤں سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

"بے وقوف لوگ" سیرت کو جیسے بے وجہ تاؤ سا آیا تھا۔

"کس کی بات کر رہی ہو؟"

"یہی جو کہہ رہے ہیں کہ عورت کا حسن خوف زدہ کرتا ہے۔"

"تو تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

وہ اب آہستہ آہستہ بھاگنا شروع ہو گئی تھیں سڑک پر ان کا سایہ بھی ساتھ ساتھ بھاگنے لگا تھا۔

"عورت ہمیشہ مرد کے حسن سے ڈر محسوس کرتی ہے کہ کہیں [illegible]"

حمکین کا سایہ ساکت ہو گیا وہیں کا وہیں۔ وہ جیسے ٹھٹھر گئی تھی۔ جس سوال کی پہیلی اس نے ڈالی تھی اس کا سرا کھل گیا تھا۔

سیرت نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"میں نے بہت کوشش کی مگر میں ہار گئی تمکو...... اس نے مجھے صرف خوف زدہ نہیں کیا، بے بس بھی کیا...... اسیر بھی...... پیروں میں زنجیریں ڈال دی ہیں...... تالے لگ گئے ہیں جن کی چابیاں ڈھونڈنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔"

☆☆☆

سرخاب خان نے اپنے راستے میں کھڑی لڑکی کو بہت کوفت اور بے زاری سے دیکھا تھا جو اس کا راستہ روکے کھڑی ہوئی تھی۔

"تم جیسے بڑے گھروں کی بگڑی ہوئی امیر لڑکیوں کو میں خوب جانتا ہوں۔"

جوس کے سپ لیتی ہوئی سیرت کو ٹھسکا سا لگا تھا۔ وہ اتنے زور سے ہنس رہی تھی کہ آس پاس سے گزرتی لڑکیوں کو اس کے دماغ چل جانے کا یقین سا ہوا تھا۔

"بڑا گھر اور امیر! یہ میری زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ ہو سکتا ہے۔"

وہ اس کی مسلسل ہنسی سے خائف ہوا تھا۔ کانوں کی لوویں جیسے سرخ ہونے لگی تھیں۔ پہاڑی مرد کی شرم نے اسے بہت دلکش بنا دیا تھا۔

"میں عورت کی عزت کا قائل ہوں، میں تمہیں پھر سے کہہ رہا ہوں کہ میرے راستے میں مت آیا کرو۔" اس کے دوست دور کھڑے تھے۔ سفید کاٹن کے کڑکڑاتے ہوئے کرتے شلوار میں ملبوس وہ اس لڑکی پر بگڑ رہا تھا۔

"میں اپنے دل سے مجبور ہوں" وہ ڈٹ کر کھڑی تھی، جرنل تھامے، سر پر دوپٹا پنوں سے ٹانکے ہوئے اور اسے مہر پوش نظروں سے گھورتی ہوئی۔ "تمہارا صدقہ اتار رہی ہوں میں آج کل۔"

سرخاب خان نے خود کو غصے کی انتہا پر پایا تھا۔

اس کا لہجہ جیسے آگ اگلنے کو تیار تھا۔
"اب نہیں، تب نہیں اور کبھی نہیں...... سمجھیں...... یاد رکھنا اور میری زندگی میں کوئی اور شامل ہے تمہاری کہیں جگہ نہیں اگلی بار تم مجھے نظر آئیں تو بہت برا ہوگا۔" وہ دھاڑتا چنگھاڑتا رہا۔

وہ بس خالی دماغ سے اس کی سرخیوں میں ڈھلتی ہوئی اونچی ناک کو دیکھے گئی۔ بس ایک بازگشت تھی جو اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔

"میری زندگی میں کوئی اور شامل ہے۔"

سارے منظر عمارتیں، درخت، انسان آنکھوں کے سامنے بھاگنے لگے تھے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور وہ غائب دماغی سے اپنے ہاسٹل روم کے باہر کھڑی تھی، دستک دینا بھول گئی تھی۔ وہ تو اچانک کنیزاں باہر نکلی تھی تو اس نے سامنے کھڑی سیرت کو عجیب حالوں میں دیکھا تھا، بنجر چہرہ، خالی آنکھیں، اور پتھر تاثرات۔

"تم باہر کیوں کھڑی ہو؟ کیا تم ٹھیک ہو؟" وہ کھینچ کر اسے اندر لائی تھی۔

وہ دھم سے کارپٹ پر گری تھی ہچکیوں سے سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ کاریڈور سے لڑکیاں گزر رہی تھیں، آوازوں کے شور میں اس کی سسکیاں بھی دم توڑنے لگی تھیں۔ کنیزاں نے اسے ساتھ لگا کر تھپکنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا ہوا سیرت! کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟"

"کنیز! اس کی اونچی سرخ ناک اس کے کانوں کی لو دیں میں نے بہت کوشش کی نظر ہٹا لوں مگر مجھے بہت دیر ہو گئی۔ اب آنکھوں کے سامنے سے وہ شخص ہٹ ہی نہیں رہا...... سچ کہوں میں اس کا پیچھا نہیں کرتی وہ خود بخود سامنے آجاتا ہے اور جب وہ سامنے آجاتا ہے تو صرف وہی نظر آتا ہے اربوں کی آبادی کہیں گم ہو جاتی ہے۔"

کنیز فاطمہ کا ہاتھ اپنے دل پر جا پڑا تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں ابال اٹھا تھا۔ وہ دونوں کھات میں آگئی تھیں۔

"مجھے کہتا ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور شامل ہے...... کوئی اور کیوں شامل ہے؟ پھر میرے دل میں اللہ نے اس کی محبت کیوں زندہ رکھی ہے...... یا محبت زندہ رکھے یا سرخاب کو موت دے دے کہ مجھے صبر آجائے۔"

کنیز فاطمہ نے آہستہ سے اپنے آپ کو پیچھے والی دیوار کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی سرگوشی پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔

"بڑے شہروں کے بھی دانت ہوتے ہیں اور جب انہیں بھوک لگتی ہے تو یہ ہم جیسوں کے دل بھنبھوڑنے لگتے ہیں اور اس بڑے شہر نے ہم دونوں کے دلوں کو کھا لیا ہے۔"

☆☆☆

فضا میں زناٹے دار تھپڑ کی آواز گونجی تھی سارے لوگوں نے بے ساختہ متوجہ ہو کر دیکھا تھا۔ اور انہیں فردوس گوہر نظر آگئی تھی جس نے اپنی کلائی پکڑنے والے موسیٰ کے چہرے پر اپنے تھپڑ کے نشانات ثبت کیے تھے۔

"اب تو تمہارا چہرہ نشانہ بنا ہے، اگلی بار میرے راستے میں آئے تو یاد رکھنا اپنی ٹانگوں پر سلامت واپس نہیں جاؤ گے سمجھے۔"

موسیٰ ابلاغیات کا لیڈی کلر تھا جس کی زندگی ہمیشہ حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں ہی گزری تھی اور اس نے ہمیشہ لڑکیوں کو اپنی محبت میں مبتلا گڑگڑاتے ہی دیکھا تھا مگر آج فردوس گوہر کے تھپڑ نے اس کی شخصیت کے چارم کو ایک لمحہ میں زمین کے حوالے کر دیا تھا اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ننگا ہو گیا ہو۔ وہ طیش میں فردوس کے منہ کے برابر آگیا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا ہمیشہ، کہ میں تمہیں وہاں زک پہنچاؤں گا جہاں کا تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ سمجھیں۔" انگلی اس کی طرف بلند کرتا ہوا منہ سے جھاگ نکالتا ہوا وہ پلٹ گیا تھا۔

پہلی بار فردوس کے اندر خوف کی لہر بلند ہوئی

تھی جب تک سیرت اور تمکین پہنچیں وہ حادثہ ہو چکا تھا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی اس کے منہ لگنے کی۔"

"میں پچھلے تین ماہ سے اس کی بدتمیزیاں برداشت کر رہی ہوں آخر کب تک میں اس جیسے لفنگے کی باتیں برداشت کر سکتی ہوں۔ آج میرا بھی پیمانہ لبریز ہو گیا۔" وہ دوبارہ جیسے طیش میں آرہی تھی۔

تمکین نے پانی کی بوتل اس کے سامنے کی تھی۔

"اچھا چھوڑو۔ جو ہوا سو ہوا، اب سکون سے پانی پیو اور دفع کرو۔ اسے اچھا کیا تم نے جو ایک بار اسے اوقات یاد دلا دی تم نے...... بھول جاؤ تم۔"

وقت کو ہمیشہ مٹی ڈالنے کا ہنر آتا ہے کہ کوئی حادثہ، واقعہ مٹی کے سپرد کر کے وقت آگے بڑھ جاتا ہے اس واقعے پر بھی وقت نے اپنے تئیں مٹی ڈال دی تھی مگر موسیٰ کی یادداشت میں وہ ذلت روز اول کی طرح تازہ تھی۔

☆☆☆

نتاشا نے مڑ کر اس لڑکے کو دیکھا تھا جو اچانک اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے بہت اچھے سے جانتا ہو۔ کوئی بچپن کی جان پہچان ہو چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"میں آپ کو نہیں جانتی۔"

نتاشا نے اس لڑکے کو نظر بھر کر ضرور دیکھا تھا جو کسی امیر ایلیٹ کلاس گھرانے کا فرد دکھائی دیتا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں تک سک سے تیار اور مسحور کن کلون کی خوشبو کا حصار لیے وہ اب بھی شناسا نظروں سے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا اور چہرے پر مسکان سجی ہوئی تھی۔

"میں تو جانتا ہوں آپ کو بہت اچھے سے۔"

"تو میں کیا کروں۔" اس نے نظر انداز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور نظریں سامنے گیٹ کی طرف بڑھا دی تھیں جہاں سے فردوس نے باہر آنا

تھا۔

"بس نظریں نہ چرائیں مجھ سے...... میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔"

"کسی اور پر کوششیں آزمائیں، مجھے ایسے الفاظ متاثر نہیں کرتے۔ سمجھے۔"

یونیورسٹی کے سیاہ گیٹ کے باہر شہتوت اور شیشم کے درخت تھے جن کے زرد پتے پرندوں کی چھیڑ چھاڑ سے مسلسل گر رہے تھے اور وہ اپنے بالوں سے کئی بار وہ پتے نکال چکی تھی۔

"آپ کہیں تو شاعر بن جاتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ آپ کو ادب سے ہی جیتا جا سکتا ہے۔"

وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھورنے پر مجبور ہوئی تھی۔

"یہ کوئی کھیل نہیں ہو رہا کہ آپ ہار اور جیت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔"

وہ بہت ہی دلکش انداز میں مسکرایا تھا تو موتیوں جیسے دانت نظر آنے لگے تھے۔ اس نے ہاتھوں میں گلاسز تھام رکھے تھے۔ تب ہی شیشم کی چوٹیوں سے ایک زرد پتا اڑتا ہوا نتاشا ابراہیم کے بالوں میں ٹھہر گیا تھا...... وہ تھوڑا سا آگے ہوا تھا اور اس نے وہ زرد آوارہ پتا اپنی انگلیوں کی چٹکی سے پکڑ لیا اور ہاتھوں میں دبا لیا جیسے انسان دنیا جہان سے کوہ نور چھپائے پھرتا ہے۔

نتاشا ابراہیم سن سی ہو کر بس وہیں کھڑے کی کھڑی رہ گئی تھی۔

"آپ سے مل کر اچھا لگا نتاشا، جلد پھر ملیں گے۔" وہ شخص کسی جھونکے کی طرح آن کی آن میں وہاں سے گم ہوا تھا۔ وہ ساحرانہ مسکراہٹ اور کلون کی خوشبو جیسے اب بھی وہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ہی فردوس گیٹ سے باہر آتی ہوئی دکھائی دی تھی تو وہ اس کی طرف بڑھی تھی۔

"نتاشا! تم کب آئیں؟ اندر ہی آجاتیں۔"

"نہیں۔ بس مجھے یہیں اچھا لگ رہا تھا۔"

وہ گاڑی کی طرف آگئی تھیں جہاں ڈرائیو ران

کا نہر کنارے منظر تھا۔ شیشوں کے پار نہر، درخت، برج بھاگنے لگے تھے۔

"اتنی چپ چپ کیوں ہو؟"

"ناں...... نہیں۔" وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر چپکانے لگی تھی۔

"تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا نتاشا...... میں نے ڈاکٹر طلال کے پاس جانا ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلا گئی تھی۔

کچھ ہی دیر کے فاصلے پر ڈرائیور فردوس کو ڈاکٹر طلال کے ہاں اتار کر نتاشا کو لے گیا تھا...... وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی تو چہرے پر ایک طمانیت سے بھرپور مسکراہٹ پھیلنے لگی تھی۔ وہ گھر بھی اس کے لیے پناہ گاہ جیسا ہو جاتا تھا جہاں وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ تصور کیا کرتی تھی۔

فردوس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر طلال نے اسے خوش آمدید کہا تھا اور پھر وہ ہمیشہ کی طرح پورے کانوں سے متوجہ ہو کر سامنے بیٹھی اس لڑکی کو سننے لگے تھے جس کے چہرے پر آج نئی قسم کی مسکراہٹ تھی جو اتنے سالوں میں پہلی بار نظر آئی تھی۔

"انسان کیوں اصل سے بھاگتا ہے؟ فریب میں کچھ لمحوں کے لیے پناہ تو مل سکتی ہے مگر سکون کبھی بھی نہیں ملتا ڈاکٹر طلال...... مجھے پتا چل گیا ہے کہ میرا اصل کیا ہے اب میں اور دنیا کے سہارے زندگی نہیں جی سکتی......"

ڈاکٹر طلال اس عرصے میں چائے کے دو کپ بنا کر سامنے رکھ چکے تھے کپوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا ناں فردوس۔ کہ اللہ کی حکمتوں کے آگے سر جھکانے سے ہی کامیابی ملتی ہے اور ہر چیز کو سمجھنے کی عمر ہوتی ہے۔ آپ کو کوئی ادارہ کوئی استاد تب تک وہ سبق نہیں سکھا سکتا جب تک کہ شاگرد کی سمجھ کی عمر نہ ہو جائے...... اور پھر یہاں تو تمہیں استاد کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔"

"ایسی بات نہیں ہے ڈاکٹر! میری زندگی سنوارنے میں آپ کا بہت ہاتھ ہے، چاہے آپ یہ تسلیم کریں یا نہ کریں۔"

"تم نے کیا سوچا ہے کہ تم ان کے جیسی زندگی گزار دوگی؟"

کپ کے کناروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اپنی نئی نویلی مسکراہٹ سے خود کو آراستہ کیے ہوئے پرسکون لگ رہی تھی۔

"میں اب خواب دیکھوں گی...... بہت بڑے خواب...... پھر میں ان کو حقیقت تک لے جانے کے لیے عمر لگا دوں گی...... میرے خواب بہت اونچے اور سچے ہوں گے...... میں آج کل ہمت اور حوصلے کی سیڑھی تیار کر رہی ہوں جس دن میری سیڑھیاں تیار ہو گئیں میں سفر شروع کر دوں گی۔" وہ آدھی چائے کپ میں ہی چھوڑ کر اٹھ گئی تھی مگر اب بھی بیٹے..... سامنے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر طلال کو حیرت ہوئی تھی کہ فردوس کو ہر نے اپنا وجود حاضر غائب کرنا سکھ دیا تھا۔ چائے کے کپوں کی بھاپ دم توڑنے لگی تھی۔

وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی جب وہ اچانک سامنے آ گیا تھا۔ اب کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو شناسائی کا کوئی اشارہ نہ دیتے۔

"کیسے ہو خلیل؟" وہ سنبھل کر بول رہی تھی وہ سامنے بس آ کر بازو باندھے کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں بہت کم لوگوں سے متاثر ہوتا ہوں۔ کیونکہ لوگوں کے پاس ایک جیسی خصوصیات ہوتی ہیں، وہی جو مدتوں سے چلی آ رہی ہوتی ہیں۔ کسی بھی انسان نے آج تک مجھے گنگ نہیں کیا...... شاک میں مبتلا نہیں کیا مگر......" پنسل ہیل پر مضبوطی سے جم کر کھڑی وہ لڑکی خلیل کو بہت اونچی لگی تھی جسے وہ سر اٹھا کر دیکھنے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔

"مگر؟" گھنی پلکیں خلیل کی طرف اٹھی تھیں۔

"مگر تم نے مجھے گنگ کر دیا...... شاک میں مبتلا کر دیا فردوس کریم!"

وہ لمحہ آیا اور کسی آندھی کے آوارہ گولے کی طرح سب اڑانے کے درپے ہونے لگا تھا۔ فردوس نے خود کو بمشکل روکا تھا سامنے کھڑا شخص تو اسے بہت عزیز تھا، وہ خود اسے دیکھ کر گنگ ہوتی تھی۔ جانے کیسا جادو آتا تھا اسے کہ وہ پلک تک نہ جھپک سکتی تھی۔

"جلد میں، تم اور عدن مووی دیکھنے جائیں گے۔" وہ عدن کو مورل سپورٹ سمجھتی ہوئی وہاں سے کھسکنے کو تھی۔

"مجھے جلدی ہے میں چلتی ہوں۔"

خلیل نے اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا تھا۔ کیونکس سے سجے خوب صورت ناخن، لمبے گھنے کندھوں پر ڈھلکتے ہوئے بال اور ایک نسوانی خوشبو جو بھرپور اگلے پر اثر انداز ہوتی تھی۔

فردوس اسے کنارے پر کرتی پورچ پار کر رہی تھی جب پیچھے سے خلیل نے جادو کیا تھا۔

"سنو فردوس؟"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی پلٹ گئی تھی۔

"مجھے تمہارا راز پتا چل گیا ہے۔"

وہ گھر جہاں کی فضا سے اسے عشق تھا اور مکینوں سے بھی وہ پیار کرتی تھی، وہ گھٹن کا شکار ہونے لگی تھی۔

پنسل ہیل کی نوک پر اس کے وجود کا وزن لرزنے لگا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ریشمی ہوا اور کوئی آوارہ مزاج لڑکا اس کے چہرے پر تھوک کر، استہزائیہ قہقہہ لگا گیا ہو۔ وہ پورے قد سے جیسے پھر سے زمین بوس ہو گئی تھی۔ پوری شان و شوکت سمیت...... ہر بار زخموں کے ٹانکے نئے سرے سے ادھڑتے تھے۔ سامنے کھڑے شخص نے اس کے سارے کھرنڈ چاک کر دیے تھے۔

☆☆☆

کمرے میں لتا منگیشکر کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ تینوں اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ اماں رضائیوں کے لحاف سینے کے بعد تھک ہار کر سو گئی تھیں۔ نیلم کوئی شیفون اور سلک کا کپڑا بازار سے لے آئی تھی اور اب کپٹ پیس پھیلائے کوئی جگاڑ لگانے کو ترکیبیں لڑا رہی تھی۔

"شرارہ بنانے میں کتنا کپڑا لگے گا؟" اس نے نتاشا سے جیسے اہم مسئلے کے حل کے لیے رائے طلب کی تھی۔

"مجھے نہیں پتا، میں کوئی درزن تھوڑی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب اپنے شادی کے کپڑے تم خود ہی بناؤ گی سمجھیں۔" وہ اسے دھمکی دے کر پھر سے اپنے حساب کتاب میں الجھ گئی تھی۔

نتاشا کی نظریں باجی کی کھوج میں اٹھی تھیں اور وہ کاپیوں کو سامنے پھیلائے موبائل ہاتھ میں تھامے ٹیکسٹ میسجز میں مصروف مسکرا رہی تھیں۔

"رشتہ ہونے کے بعد کتنی خوش دکھائی دیتی ہیں، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔" وہ انہیں دعا دے گئی تھی۔

کچھ دیر دیواروں کو گھورنے کے بعد وہ کھڑکی کی طرف آ گئی تھی کھڑکیوں کے باہر جیسے ایک نیا جہان کھل جاتا تھا سب کی مصروف زندگی اس کو بہت دلچسپ لگتی تھی تو وہ صدیوں بھی یوں ہی کھڑے کھڑے مزے سے گزار سکتی تھی۔ تب ہی ہاتھ میں تھامے موبائل کی گھنٹی بجی تھی تو اس نے کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو کون؟" وہ اب بھی بال کے پیچھے چھتوں پر بھاگتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

"میں ہوں۔" دوسری طرف سے کوئی جانی پہچانی سی آواز گونجی تھی۔

"سوری! میں نے پہچانا نہیں۔"

"اک دوست کچا پکا سا۔" وہ دوسری طرف مسکرایا تھا۔

وہ جیسے اب بھی سیاہ گیٹ کے سامنے چوٹیوں سے گرتے زرد پتوں تلے کھڑی تھی۔

"تم نے مجھے کال کیوں کی؟ نمبر کہاں سے ملا؟" وہ غیر ارادی طور پر اس سے بات کر رہی تھی مگر

آنکھیں اب بھی چھتوں پر ہونے والی سرگرمیوں پر ٹکی تھیں جہاں کچھ دکان دار طبلے بجا رہے تھے اور بھی بھی طبلے کی تھاپ سے ایک گونج پیدا ہوتی تھی اور جنگلی کبوتر ایک جھنڈ کی طرح آسمان کی طرف چھیڑ چھیڑ کر کے اڑتے تھے۔

''محبت سے زیادہ بھی بڑی وجہ کوئی ہو سکتی ہے کیا؟'' وہ سوال جواب کا کھیل شروع کرنے لگا تھا۔
اب وہ یوں ہی بے فائدہ سی ہنسی ہنس دی تھی۔
''ہاں ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے۔''
وہ دوسری طرف جیسے بجس کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ ''تو بتاؤ محبت کے علاوہ کون سی بڑی وجہ ہو سکتی ہے؟''
طبلے کی تھاپ جیسے چاروں طرف سے بلند ہونے لگی تھی۔
''نفرت۔''
وہ ایک لفظ موتی کو کسی چابک کی طرح لگا تھا۔
وہ ایک پل کو خاموش ہوا تھا۔
''تم غلط سمجھ رہی ہو میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ پھر سے پہلے والے روپ میں آنے لگا تھا۔

نتاشا ابراہیم کو پتا بھی نہیں چلا کہ جس فون کال کو وہ دو منٹ کے دورانیے کے بعد کاٹ دینے کا فیصلہ کر رہی تھی وہ کال پندرہ منٹ کے دورانیے میں چپکے سے داخل ہو گئی تھی۔
یوں ہی ہوتا ہے...... کسی بڑے حادثے کے پیچھے بہت چھوٹی وجوہات کے سلسلے ہوتے ہیں۔
کاش طبلوں کی زہریلی تھاپ والی سہ پہر نتاشا اپنی زبان کے اس ایک لفظ ''نفرت'' پر یقین کر لیتی مگر وہ بھی بس اچانک یوں ہی سے ایک لمحے کا شکار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

عدن کے کئی بار کے اصرار اور منت سماجت کے بعد وہ مووی دیکھنے پر راضی ہوئی تھی۔ وہ گہری سیاہ شام تھی جس کے آسمان پر کوئی تارا کوئی چاند نہیں تھا۔ وہ دونوں شیشے اور لکڑی سے بنے اس گھر کے دروازے کے باہر گاڑی میں اس کے منتظر تھے۔ سیاہ رات کی تاریکی میں کب وہ سیاہ لباس میں ملبوس گاڑی کے شیشے کو اپنے ناخن سے بجانے لگی تھی، وہ دونوں نہیں دیکھ سکے تھے۔
عدن فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی اور خلیل ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا جب فردوس نے پیچھے کا دروازہ کھولا تو عدن جبار بھی اتر کر اس کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی تھی، جس پر خلیل نے برا منہ بنایا تھا۔
''مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں تم دونوں کا ڈرائیور ہوں۔''
عدن نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر مکا جڑا تھا۔
''خیر، آج تو تم ہمارے ڈرائیور کے عہدے پر فائز ہو۔''
وہ گاڑی کی زرد روشنی میں شیشے میں پیچھے بیٹھی فردوس کو دیکھ رہا تھا جو عدن کی کسی بات کا جواب دے رہی تھی۔
''میں خود حیران ہوں کہ جانے کنیز اور سیرت کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے کیونکہ وہ دونوں ہی مجھے بہت ڈسٹرب لگ رہی ہیں کچھ عرصے سے۔''
''تم نے تمکین سے پوچھا تھا ناں۔'' عدن نے اسے مشورہ دیا تھا۔
''میں تمکین کو بھی کنارے پر کر کے پوچھ چکی ہوں کہ تم لوگ روم میٹ بھی ہو تو کیا وجہ ہے، اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ ہم مل کر حل کر لیں گے۔ مگر اس نے یہی کہا کہ شاید وہ موڈ کو لے کر پریشان ہیں۔''
''مجھے نہیں لگتا کہ یہ وجہ ہوگی۔ مگر ہم کوشش کریں گے کہ یونیورسٹی کے باہر کوئی گیدرنگ رکھیں اور ان سے صاف صاف بات کریں یار۔ دوست اسی لیے تو ہوتے ہیں کہ ان سے ہر مسئلہ، پریشانی بنا جھجک شیئر کر لی جائے۔''
عدن کی بات پر خلیل نے شیشے کو سیٹ کرتے ہوئے فردوس کو اپنی نظروں کے فوکس میں رکھا تھا۔

''عدن ٹھیک کہہ رہی ہے دوست اسی لیے تو ہوتے ہیں کہ ان سے پریشانیاں بانٹ لی جائیں۔''
وہ ایک دم سے نظریں چرا گئی تھی...... وہ شخص کیوں کرتا تھا ایسے کہ اسے بالکل زمین بوس کر دیتا تھا، وہ اس کے سامنے ٹھہر نہیں پاتی تھی۔ نظریں وہاں سے ہٹ کر اپنی گود میں رکھے عدن کے ہاتھوں پر پڑی تھیں۔
وہ دونوں ہمیشہ ہی اسے اپنے دل کے قریب لگے تھے تب بھی جب وہ ان دونوں سے ناواقف تھی۔
وہ کچھ سوچ کر ہنسی تھی۔ جب نتاشا سے وہ بات کرتے ہوئے اسے بتا رہی تھی
''میرا دل کرے تو میں خلیل طلال بن جاؤں...... یا پھر عدن جبار ہو جاؤں۔''
اور آج جب وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ آئی تھی تو وہ دنیا کو خود با نگِ دہل کہہ سکتی تھی۔
''میں فردوس گوہر ہوں اور میں یہی بنے رہنا چاہتی ہوں اور بس۔''
پھر اور بس کے بعد تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے، سچائی شروع ہو جاتی ہے...... خود شناسی سے بڑھ کر کچھ قیمتی نہیں ہوتا......!
وہ رات فردوس گوہر کی زندگی کی سب سے خوب صورت راتوں میں سے ایک تھی جب اس نے وقت کا ایک ایک سیکنڈ بہت اطمینان سے گزارا تھا۔ مووی دیکھتے ہوئے، ہال میں پاپ کارن کھاتے ہوئے اس کے کندھے پر رکھا ہوا عدن جبار کا تھکن سے نڈھال وجود اسے اپنے آپ میں اعزاز لگا تھا۔
اس کے گلاس میں کولڈ ڈرنک انڈیلتا ہوا خلیل بھی اسے اپنے دل کے پاس بہت پاس محسوس ہوا تھا۔
تو وہ ایک نارمل زندگی گزارنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ کوئی شودر، اچھوت نہیں تھی کہ جس کے ساتھ رزق الگ کر لیا جائے۔ جس کے لمس سے دور ہوا جائے۔
وہ جان گئی تھی کہ اس کا ''اصل'' ہی اس کا سب کچھ ہے۔ کیونکہ پردے اور فریب تو صرف دھوکا ہوتے ہیں......!

☆☆☆

اماں نے انہیں ہمیشہ ہی شام ہونے سے پہلے سونے سے منع کیا تھا بقول ان کے شام سے جوان لڑکیوں کو چادر لے کر منہ سر لپیٹ کر نہیں سونا چاہیے۔ اور یہ بات بختاور نے پلو سے باندھ لی تھی۔ وہ خود شام کی نیند سے خوف کھاتی تھی چاہے سر درد سے پھٹ ہی رہا ہوتا، وہ تب بھی چارپائی پر بس بیٹھی رہتی تھی۔ مگر آج وہ جانے کتنے دنوں سے شام سے چادر لے کر سو جاتی تھی۔ اماں کو اس کے اس طرح سونے سے ڈر لگتا تھا دل ہول ہول سا جاتا اور یوں لگتا کہ جیسے ابھی شام کی آندھی آئے گی اور سب کچھ بہا کر لے جائے گی مال، مویشی، مکان اور انسانوں کو بھی، اور پیچھے بنجر گھاٹیاں چھوڑ جائے گی جن کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اماں جیسے کسی خوف کے زیرِ سایہ بختاور کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی تھیں۔
''بختاور بختاور!'' انہوں نے اس کے پیر کے انگوٹھے کو پکڑ کر جیسے اس کے زندہ ہونے کی یقین دہانی کی تھی۔
''اٹھ جا، کب سے سو رہی ہے۔ دیکھ تو دودھ بھی ویسے کا ویسے پڑا ہے اور دودھ پہ بھی کوئی کپڑا نہیں ڈالا۔''
اماں کی تیسری چوتھی آواز پر آہستہ سے بختاور نے اپنے اوپر سے چادر ہٹائی تھی۔ اور اماں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں کہ گلابی آسمان سے بھی زیادہ گلابی بختاور کی آنکھیں ہو رہی تھیں۔ وہ سسکتی ہوئی سیدھی چارپائی پر اٹھ بیٹھی تھی اور اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سسک کر رو رہی تھی۔
''اماں! اللہ کا واسطہ میں سچ کہہ رہی ہوں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ نے اور ابا نے مجھے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ پلیز، خدا کے

واسطے ایسا ظلم مت کریں۔ یہ صرف میرے ہی ساتھ ہی نہیں اس کے ساتھ بھی ظلم ہے۔ اماں میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتی ہوں، میں یہ نہیں کر پاؤں گی۔"

اور اماں بس اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو موتی کی طرح بہنے لگ گئے تھے۔

"بختاور! اب جو کچھ بھی ہے تو ہی سنبھال سکتی ہے۔ ہمارے گھر کی، پورے خاندان کی عزت اب تیرے ہاتھوں میں ہے۔ تیرے علاوہ ایسا کوئی نہیں کر سکتا میری دھی! بس اپنے باپ کی لاج رکھ لے۔ اس گھر کی عزت اب تیرے ہاتھ میں ہے ورنہ اس نے تو ہماری عزت کو نیلام کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔"

"مگر اماں! ایسے کیسے؟ سکندر مجھ سے نہیں کنیزاں سے پیار کرتا ہے۔ کیسے میں اس کے کھونٹے سے بندھ جاؤں۔ اس نے اسی کے لیے گھر بنایا۔ اس کے دل میں وہی ہے۔ ساری زندگی وہ اس کے ساتھ شادی کے خواب دیکھتا رہا ہے اور آخر میں آپ مجھے اس کی سیج پہ بٹھانے لگے ہیں۔ یہ بہت غلط بات ہے، آپ اور ابا آگے کا سوچیں۔

کنیزاں جاتے جاتے جیسے اسے ہی دار پر چڑھا کر چلی گئی تھی۔ بختاور اپنا چیتھڑے چیتھڑے وجود لیے لٹی پٹی ہوئی سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

چچی کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی ان کے گردوں کا ڈائیلاسز ہو رہا تھا اور انہوں نے ابا کو بلاوے کا پیغام بھجوایا تھا کہ وہ سکندر کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتی تھیں۔ ابا جہاں کے تہاں رہ گئے تھے۔

"مگر اتنی جلدی کیسے ہو گا سب کچھ؟"

"سب ہو جائے گا بھائی صاحب! بس مجھے اب سکندر کی خوشی دیکھنی ہے تب ہی سکون سے دنیا چھوڑ پاؤں گی۔"

سکندر خود بھی چپ چاپ بیچارہ گیا تھا شاید کہنے کو کچھ بھی اس کے پلے میں نہیں تھا۔ وہ کیسے کہہ دیتا کہ جانے والی ایسی ریت کے ٹیلوں تلے دبا کر ہی گئی تھی۔

وہ تینوں چولہے کے گرد سکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ سرخ انگاروں کی حدت بھی کوئی سکون نہیں پہنچا رہی تھی۔ بختاور نے کنیزاں کو کال ملائی تھی اور کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جیسے پوچھا تھا۔

"تم واپس کب آ رہی ہو؟"

بختاور کا وہ جملہ جیسے کنیزاں کو ہوشیار کر گیا تھا۔

"کیا مطلب، کب آ رہی ہو؟ ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے تو میں یہاں آئی ہوں تو واپسی کی بات کیوں کر رہی ہو؟"

"چاچی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں ہی سکندر کی خوشیاں دیکھ لیں تو ابا اور ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا اور سکندر کا نکاح اسی اگلے ہفتے کر دیتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم! دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی وہ بغاوت بھری آواز جیسے ان تینوں پر صور اسرافیل پھونک گئی تھی۔ اماں نے لرزنا شروع کر دیا تھا اور انہوں نے فون جھپٹ کر لے لیا تھا۔

"میری بات سن غور سے، میں تجھے اپنے دودھ کا واسطہ دیتی ہوں۔ اگلے ہفتے ہم نے تجھے سکندر کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ وہ نمانی وہاں پڑی ہے اکیلے گھر میں۔ سب کچھ تیرے لیے بنایا گیا ہے اور تو ہے کہ شہر میں بیٹھی ہے۔ اس وقت ہمارے گھر کو اور ہمارے خاندان کو تیری ضرورت ہے بس تو گاڑی پکڑ اور اگلے ہفتے پہنچ جا، ادھر جو باقی تیاریاں رہتی ہیں وہ مل کر کر لینا۔ بیمار کو اور اذیت میں مبتلا نہیں کرتے۔"

اماں کی آواز نے جیسے اس کے زخموں پر نمک چھڑکنا شروع کر دیا تھا، وہ شل ہو کر رہ گئی تھی۔

"اماں! کوئی بیمار ہوتا ہے یا نہیں، میں آپ سے اور ابا سے سب سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے سکندر سے شادی نہیں کرنی تو نہیں کرنی۔ آپ مجھے زبردستی کے کھونٹے سے کیوں باندھ رہے ہیں۔؟ وہ طیش میں آ گئی تھی اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

ہاسٹل کی چھت پر ادھر ادھر واک کرتی ہوئی کافی لڑکیاں جیسے رک کر اسے دیکھنے لگی تھیں جسے اس کی پروا نہیں تھی۔

"ساری زندگی میں نے اپنی زندگی میں اس مقام پر پہنچنے میں اتنی مدتیں لگائی ہیں اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اس انسان کے ساتھ بندھ کر رہ جاؤں۔ خدا کے واسطے اس بات کا تو خیال رکھیں کہ مجھ میں اور اس میں کتنا فرق ہے؟"

"تو فرق بتائے گی ہمیں۔ تو جانتی ہے میں ماں ہوں تیری۔ ارے، میں تو تجھے اور سکندر کو ایک پلڑے پر تولوں تو خاک برابر بھی تیرا وزن نہ نکلے۔"

کنیزاں فاطمہ رونے لگ گئی تھی، ابا نے اماں سے فون لے لیا تھا۔

"کنیزاں! ہماری عزت کا معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں اور میں تم سے یہ توقع کر رکھتا ہوں کہ اگلے ہفتے تم آ جاؤ بس، کہ اس کے علاوہ مجھے کسی بحث میں نہیں پڑنا۔"

اور پھر فون کال کاٹ دی گئی تھی وہ خالی ہاتھ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی جو قطبی ستارے سے خالی تھا جو راستہ دکھاتا ہے...... منزل تک چھوڑ جاتا ہے۔

ابا نے جیسے اپنی بات سنا کر فون بند کر دیا تھا۔ وہ جیسے کسی سناٹے کی کیفیت میں تھی، کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ جس کو دیکھ کر کوئی بھی جذبہ نہیں ابھرتا تھا۔

جس طرح کی زندگی اس نے دیکھی تھی اس حوالے سکندر اس کا کبھی بھی آئیڈیل نہیں رہا تھا۔ جس شخصیت پرستی کی وہ قائل ہو چکی تھی اور آس پاس کے انسانوں کو اس نے دیکھا تھا تو اس کی نظر میں جیسے سکندر تو کچھ تھا ہی نہیں چاہے وہ کچھ بھی بن جاتا مگر وہ کبھی بھی آئیڈیل شخص نہ بنتا جس سے وہ اپنی آگے کی زندگی شروع کرتی......!

جب وہ اپنے نشان اور قطبی ستارہ کھو چکی تھی تو بھٹکے ہوئے راستے میں اس کے سامنے وہ ہر بار آ جاتا تھا جس سے وہ سو بار جان چھڑایا کرتی تھی۔

☆☆☆

"آج کل میری زندگی میں بہت کچھ مشکل چل رہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تم میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ۔ پلیز، اللہ کے واسطے میرے راستوں میں مت آیا کرو۔"

آدم نے جیسے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"تم دنیا جہان کا غصہ مجھ پر کیسے نکال سکتی ہو؟"

"تو تم بھی دنیا جہان کو چھوڑ کر میرے سامنے کیسے آ سکتے ہو۔ اپنا راستہ ناپو اور جاؤ، سمجھے۔"

وہ کبھی بھی راستہ ناپ کر نہیں جاتا تھا بس وہ اولڈ کیمپس کی بسیں بدل بدل کر اس کے راستے میں آ جاتا تھا۔ اس نے وہ سارے راستے حفظ کر لیے تھے جن سے وہ گزرتی تھی۔

تعلق کبھی بھی نظر انداز نہیں کیے جاتے۔ خاص طور پر تب جب وہ مسلسل آپ کے آگے نظر آئیں رستے کاٹتے...... آپ کو کنارے پر کر کے...... اپنا آپ پیش کر کے...... وہ بھی تھک گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی جیسے کسی مضبوط چھت کا شہتیر ٹوٹتا ہے تو ساری چھت دھڑام سے زمین پر آ جاتی ہے۔

"میں رنگوں کی زبان سمجھتا ہوں۔ تم مجھ

رنگوں کی زبان جیسی لگتی ہو، کچھ کچھ زعفرانی سی...... کبھی کبھار کاسنی سی...... اور بہت دفعہ آسمانی سی...... آرٹسٹ آرٹ کے پیچھے لپکتا ہے اور تم مجھ سے یہ توقع مت رکھو کہ میں تمہارے علاوہ نہیں اور دیکھوں۔"

آدم علی کے لہجے سے جیسے قوس وقزح کے سات رنگوں کی بوچھاڑ کنیزاں پر گری تھی۔ اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ رہی تھی۔

"میں زندگی میں ناانصافی کی کبھی قائل نہیں رہی اور میں منافق بھی نہیں۔ مگر میں تمہیں ایک سچ بتاؤں میں تھل کی وہ لڑکی ہوں جسے دیکھ کر باقی پیچھے رہنے والیاں سبق حاصل کریں گی۔ میرے ماں باپ نے آخر مجھ سے میری سارے سفر کی کامیابیوں کا خراج وصول کرنے کی بات کی ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس راستے پر چلوں۔ تم مجھے بتاؤ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم کیا کرتے؟"

"میں ہمیشہ اپنے دل کی سنتا کنیزاں، کہ میرا دل کیا کہہ رہا ہے انسان دل کی سنے تو وہ بہت سے پچھتاوؤں سے بچ جاتا ہے۔"

کنیزاں نے صرف یہی سوچا تھا اگر میں سامنے بیٹھے شخص کو اپنے دل کی بتادوں تو آگے کیا ہوگا؟ زندگی اس کے ساتھ چھپن چھپائی کھیل رہی تھی۔

"اولڈ کیمپس سے اتنی بسیں بدل کر یہاں آتے ہو، تھکتے نہیں ہو تم؟" وہ بہت سہولت سے موضوع کو بدل گئی تھی۔ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتے ہوئے جیسے انہیں اس پاس کے ہجوم کی کوئی بھی پروا نہیں تھی۔ فیصل آڈیٹوریم کی نیلی بلڈنگ کا سایہ ان دونوں پر پڑ رہا تھا۔ کبھی وہ چھاؤں اور کبھی دھوپ کے پہرے میں چلے جاتے تھے۔

"دیکھ لو، یہی بات ہے۔ میں بھی اس معاملے میں بہت مجبور ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تم مجھے کیا سمجھو یا کچھ بھی کہو مگر میں نے زندگی میں تمہارے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی۔ محبت میرے لیے ایک لفظ تھا زندگی میں، میں صرف مشاہدات پر چلتا رہا۔ لیکن مجھے تجربہ ہوا ہے تو میری تصویر اور رنگوں کی زبان بدلنے لگی ہے اب آکر مجھے زندگی کے ایک حصے میں احساس ہوا ہے کہ اصل اثاثہ کیا ہوتا ہے۔"

"تم باتیں بہت اچھی بنا لیتے ہو۔"

"لیکن میں جھوٹ نہیں کہتا۔"

وہ پگھلنے لگی تھی...... ساتھ ساتھ چلتا ہوا شخص جس کے بالوں میں ایک برش پھنسا ہوا تھا اور وہ اپنی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کتنے مطمئن انداز میں چل رہا تھا جیسے یوں ہی وہ اس کے ساتھ ساری دنیا گھوم لے گا۔ وہ اپنے اور اس کے سائے کو دیکھتی رہی۔ اور اس نے اگلے ہفتے گھر نہ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ریت کے ٹیلوں کو اپنا نصیب نہیں بننے دے گی۔

وقت گزرتا گیا اور تھل واسیوں کی آنکھیں انتظار نے بنجر کردیں۔ کنیزاں فاطمہ نے نہیں آنا تھا اور وہ نہیں آئی تھی۔ وہ چودھویں کے چاند سے سجی ہوئی مکمل رات تھی۔ جب ہاسٹل گیلری میں بیٹھی ہوئی کنیزاں کے موبائل پر نوٹی فکیشن آیا تھا۔ اس نے لاپروائی سے کھولا تھا اور سامنے وہ تصویر آئی تھی۔ جس نے زندہ کنیزاں فاطمہ کو مردہ کردیا تھا۔

سامنے ہی تصویر میں دلہن بنی بختاور سکندر کے ساتھ نظر آئی تھی۔ دونوں دولہا دلہن کے چہرے پر بس ایک ہی تاثر تھا۔ تباہی کا...... بربادی کا...... اور قیامت کا......!

بختاور اپنے خاندان کی عزت پر قربان ہوگئی تھی۔

شہر عجائبات کی ہر شے عجب
گمشدہ ہے روح اور ہر جسم ہوا لا

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

☆☆

تنظین فاطمہ
حرام کمائی

عفیفہ اسکول سے واپس آئی تو سرتا پا پسینے میں شرابور تھی۔ سورج کی تپش میں دہکتے کوئلوں سے بھر چکی تھی جو اردگرد آگ لگانے کے درپے تھی۔ شدید گرمی میں گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔ ابھی تو شکر تھا کہ جس اسکول میں وہ پڑھاتی تھی گھر سے قریب ہی تھا۔ پانچ منٹ پیدل کا راستہ تھا۔ بی۔ ایس۔ سی کے بعد وہ پچھلے چار سال سے اس پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اچھی ساکھ کا اسکول تھا۔ تنخواہ بھی اچھی دیتا تھا ہاں کام البتہ بہت لیتا تھا۔ تو عفیفہ بھی تھی سو وہ کام بھی خوشی خوشی کر لیتی تھی۔

"یہ لو بیٹا شربت پی لو۔" اماں نے شربت کا جگ اور گلاس اس کے سامنے رکھا۔ شربت کے دو گلاس پی کر عفیفہ کے حواس بحال ہوئے تو اس نے اماں کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے اماں؟ آج تو بہت خوش لگ رہی ہیں۔" عفیفہ نے ماں کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں، خوشی کی بات ہے تو خوش ہی ہوں گی" اماں کھل کر مسکرا دیں۔

"اچھا، کیا خوشی کی بات ہے؟ مجھے بھی بتائیں۔" عفیفہ مشتاق ہوئی۔

"تمہارے ابا آ جاتے ہیں تو بتاتی ہوں۔" اماں جگ گلاس اٹھا کر چلی گئیں اور عفیفہ بھی کپڑے بدلنے کے لیے اٹھ گئی کہ اب اماں سے ایک لفظ بھی نہیں اگلوایا جا سکتا تھا۔

ابا سرکاری محکمے میں گریڈ سولہ کے افسر تھے۔ جو صرف سرکار کی طرف سے ملنے والی تنخواہ کو اپنے لیے حلال سمجھتے تھے۔ سو طرز زندگی سادہ تھا۔ لوگ ان کو بے وقوف سمجھتے تھے کہ جس کرسی پر وہ بیٹھے تھے وہاں بیٹھنے والوں کا کیا شاہانہ طرز زندگی ہوتا تھا۔ مگر ابا کو ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو ہمیشہ حلال کا لقمہ کھلایا اور حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر طرح کی آزادی دی تھی۔

"عفیفہ کے ابا وہ جو پچھلے ہفتے عفیفہ کو دیکھنے آئے تھے نا، رحمان صاحب کے حوالے سے، انہوں نے رشتے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔" اماں کے لہجے میں خوشی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"رحمان اچھی طرح جانتا ہے انہیں۔ کہہ رہا تھا کہ لڑکے کے والد کی وفات ہو چکی ہے۔ دو بہنیں ہیں دونوں شادی شدہ ہیں اور خود وہ کے۔ ایم۔ سی میں کلرک ہے۔ کہہ رہا تھا اچھے لوگ ہیں۔" ابا نے کہا۔

"پھر بھی آپ اپنے طور پر بھی پتا کروا لیں اور بسم اللہ کریں۔ ایک تو اپنے گھر کی ہو۔"

عفیفہ گھر میں سب سے بڑی تھی۔ اس کے بعد ایک بہن اور دو بھائی تھے جو ابھی زیر تعلیم تھے۔ گزشتہ چار سال سے اس کی شادی کے لیے کوششیں کی جا رہی تھیں مگر کہیں بات نہیں بن پا رہی تھی۔

"وہ تو میں کروا لوں گا۔"

لڑکے کے بارے میں سارے معلومات کروا لینے کے بعد کوئی قابل گرفت بات نہ ملی تو ابا نے عفیفہ سے اس رشتے کی بابت اس کی رائے لی۔

"ابا جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ آپ یقیناً میرے لیے بہترین فیصلہ کریں گے۔" باپ نے بیٹی کی رائے لے کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو بیٹی نے ماں باپ کی دی دستار ان کے سر پر واپس رکھ دی۔ ماں باپ دونوں سرخرو ہو کر مسکرا دیے۔

عفیفہ کو کچھ روز پہلے اس کے گھر آنے والے مہمان یاد آ گئے تھے۔ ایک آنٹی اور ان کی دو بیٹیاں تھیں جو عفیفہ کو رشتہ دیکھنے آنے والے روایتی مہمانوں سے قدرے مختلف محسوس ہوئی تھیں۔ نہ چبھتی ہوئی نظریں، نہ چبھتے ہوئے سوالات، نرم نظریں، نرم بات۔ رشتہ ہونا یا نہ ہونا تو قسمت کی بات ہوتی ہے مگر جب آپ کسی کے گھر جائیں تو اپنا اچھا تاثر چھوڑ کر آئیں۔ یہ عفیفہ کا بالکل ذاتی خیال تھا۔

☆☆☆

سارے معاملات سہولت سے طے پا گئے۔ عفیفہ نوید کے سنگ بیاہ کر اس کے گھر آ گئی۔ گھر میں صرف تین نفوس تھے وہ دونوں اور نوید کی امی۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ عفیفہ نوید کے ساتھ خوش تھی۔ نوید کی امی بھی اچھی خاتون تھیں۔ نندیں بھی اپنے گھروں میں شاد آباد تھیں۔ ماں کی طرح اچھی فطرت رکھتی تھیں۔ شادی کے ایک ہفتے بعد نوید نے دفتر جانا شروع کر دیا کہ شادی سے پہلے وہ کافی چھٹیاں لے چکا تھا۔ بقول اس کے دفتر میں کام پہلے ہی بہت حرج ہو گیا تھا۔

نوید کے جانے کے بعد سارا دن عفیفہ نوید کی امی کے ساتھ گزارتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لیے ملازمہ آتی تھی۔ صرف کھانا پکانا ہوتا تھا جو دونوں مل کر پکا لیتی تھیں۔ کبھی کبھار اس کی نندیں چکر لگاتیں تو گھر میں رونق سی ہو جاتی اور ان کے جانے کے بعد پھر وہی خاموشی چھا جاتی۔ عفیفہ کو مصروف رہنے کی عادت تھی۔ اسے دنوں میں وہ فارغ رہ کر اکتانے لگی تھی۔

"اچھا ہوا، میں نے اسکول چھوڑنے کے بجائے اپنے جانے سے پہلے دو مہینے کی چھٹی لے لی تھی۔ میرا اسکول یہاں سے بھی قریب ہی ہے۔ بس اب پیدل کے بجائے کسی سواری کا انتظام کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے مجھے اسکول دوبارہ شروع کر دینا چاہیے۔"

عفیفہ کی سسرال ساتھ والی کالونی میں تھی۔ آج دوپہر کو کھانے کے بعد آرام کرنے کمرے میں آئی تو اس نے دل میں سوچا۔

"ٹھیک ہے نوید آتے ہیں تو بات کرتی ہوں۔ آج اگلے ہفتے میری چھٹی ختم ہو رہی ہے۔ گھر کے کام بھی کوئی بہت زیادہ نہیں ہیں۔ میں آرام سے کر لیا کروں گی۔" منصوبہ بناتے بناتے عفیفہ گہری نیند میں چلی گئی۔

☆☆☆

"یہ لیں چائے۔"

عفیفہ نے ٹرے بیڈ کے درمیان میں رکھی جس میں مگ تھے اور خود نوید کے سامنے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ نوید نے اسے مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔

"نوید مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

"کہیے بیگم صاحبہ" اس نے چائے کا مگ اٹھایا۔

"وہ اگلے ہفتے میری چھٹی ختم ہو رہی تو میں چاہ رہی تھی اسکول جوائن کر لوں۔"

عفیفہ کی بات سن کر نوید کا موڈ یکدم بدل گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا مگ واپس ٹرے میں رکھا۔ عفیفہ نے اس کے بدلتے موڈ پر دم سادھ لیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے نوکری کرنے کی۔ اب میں لوگوں سے یہ سنوں گا کہ نوید اپنی بیوی سے نوکری کروا رہا ہے۔" نوید کی آواز میں کھردرا پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ دونوں مل کر کام کریں گے تو سہولت رہے گی۔" پہلے تو عفیفہ چپ سی ہو گئی۔ پھر ہمت جمع کر کے گویا ہوئی۔

عفیفہ نے اماں کو ابا کی تنخواہ میں گھر چلاتے دیکھا تھا۔ ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑتی تھیں۔ اماں کو دیکھ کر عفیفہ سوچا کرتی تھی کہ ممکن ہوا تو وہ شادی کے بعد نوکری کرتی رہے گی تاکہ تنگی کا احساس نہ ہو۔ اپنے سسرال آ کر اسے لگا تھا کہ وہ اپنی نوکری آسانی سے جاری رکھ سکتی ہے مگر نوید تو سنتے ہی پیچھے سے اکھڑ گیا تھا۔ بات اتنی آسان ثابت نہیں ہوئی تھی جتنی عفیفہ نے سوچی تھی۔

"وہ میں سوچ رہی تھی کہ ایک تنخواہ میں گھر چلانا تھوڑا مشکل ___" ابھی اس کی آدھی بات منہ میں ہی تھی جب نوید بیڈ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میں تم سے نوکری نہیں کرواؤں گا۔ تم اسکول چھوڑ دو۔ ویسے بھی عورت کی کمائی حرام ہوتی ہے اور رہی بات ایک تنخواہ میں گھر چلانے کی تو بے فکر رہو میری تنخواہ بھلے کم ہے مگر "اوپر کی کمائی" بہت ہے۔" نوید کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

عفیفہ نوید کے اس فلسفے پر ساکت سی بیٹھی پردے کو دیکھتی رہ گئی جس کے مطابق وہ عورت کی محنت کی حلال کمائی حرام اور مرد کی حرام کمائی کو "اوپر کی کمائی" کہہ کر حلال سمجھتا تھا۔

☆☆

طیبہ کو اٹھ سال دو ماہ اور تین دن بعد اپنا گھر چھوڑنا پڑا جب ان کا ہم سفر ان کے ساتھ نہیں رہا۔ ان کے
بھائی خلیل غوری اپنی بہن اور بھانجی حیا کو اپنے گھر لے آئے۔
گردیزی ہاؤس میں شاہ مخدوم گردیزی اپنے دو بیٹوں حاتم گردیزی اور سبحان گردیزی اور بہوئیں زینب
اور منیزہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا تعلق زمیندار گھرانے سے ہے اور ان کی "گردیزی کنسٹرکشنز" کے نام سے
کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ حاتم گردیزی کے دو بیٹے جرار اور ہادی اور ایک بیٹی خولہ ہے جبکہ سبحان گردیزی کی ایک بیٹی
سلوی ہے۔
عباس چچا کے بیٹے نصر نے جو منیزہ کا بھائی ہے، اپنے سالوں کے ساتھ مل کر شاہ مخدوم گردیزی کے آموں
کے باغات پر قبضہ کر لیا ہے۔ شاہ مخدوم گردیزی اپنے بھتیجے کے خلاف پنچایت بٹھاتے ہیں وہاں پر۔ نصر اور اس
کے سالے کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔ ملک دلاور دھمکی دے کر ان کی زمینیں چھوڑنے کا اعلان کر دیتا ہے۔
خلیل غوری کو برین ٹیومر ہے۔ ہاسپٹل اپنے پرانے دوست حاتم غوری سے ملاقات ہوتی ہے۔ جوانی میں

طیبہ اور حاتم گردیزی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ مگر باپ کے ڈر سے وہ طیبہ سے محبت کا اظہار نہیں
کر سکے تھے۔
خلیل غوری آپریشن سے پہلے طیبہ کا نکاح حاتم گردیزی سے کر دیتے ہیں۔
آقا جان جرار اور سلوی کی بچپن میں منگنی کر دیتے ہیں۔ زینب اس منگنی پر خوش نہیں ہیں مگر مصلحت کے تحت
خاموش ہو جاتی ہیں۔
حاتم جب اپنے دوست بخت چوہدری کے ہمراہ طیبہ کو اپنے ساتھ گردیزی ہاؤس لے کر پہنچتے ہیں تو وہاں پر

شاہ مخدوم کسی صورت طیبہ کو قبول نہیں کرتے۔

طیبہ اور زینب کے درمیان خاموش معاہدہ طے پا گیا تھا۔ نہ کبھی طیبہ نے اندر حویلی کا رخ کیا اور نہ کبھی زینب اینکسی کی طرف آئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت کسی آزاد پنچھی کی مانند اڑتا چلا گیا اور زندگی انیس سال آگے کا سفر طے کر گئی۔

طیبہ حیا سے کہتی ہیں کہ میمونہ بھابھی نے بسیط کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ حیا حیران رہ جاتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ بسیط سلوئی کو پسند کرتا ہے۔ جرار کو حیا کا اپنے گھر میں آنا پسند نہیں ہے۔

یونیورسٹی میں دو گروپوں کے تصادم ہونے کے باعث سلوئی کے ماتھے پر پتھر لگتا ہے اور وہ بے ہوش جاتی ہے۔ وائس چانسلر سلوئی اور حیا کو اسفند کے ساتھ ہاسپٹل جانے کا کہتے ہیں۔ حیا کو سلوئی کو بسیط کے ہاسپٹل لے جاتی ہے۔

بہادر اور اس کے کزن وقاص کی ساتھ ہی شادی ہوئی تھی۔ وقاص کے یہاں تیسرا بیٹا ہوتا ہے لیکن بہادر ابھی تک بے اولاد ہے۔

شاہ میر بہادر سے کہتا ہے کہ تایا جی اس کی دوسری شادی چوہدری فرزند علی کی بیٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔ بہادر غصے سے بھرا گھر پہنچتا ہے۔ اور ابا جی سے کہتا ہے کہ اس بار اس کا تماشا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حیا اپنے ماموں کی بیٹی اولیا کو بتاتی ہے کہ بسیط سلوئی کو پسند کرتا ہے۔

جرار کے مغرورانہ انداز بادی اور خولہ کو بالکل پسند نہیں ہیں۔ وہ دونوں اپنی ماں کے دوغلے معیار پر تبصرہ کر رہے ہوتے ہیں یہ جانے بغیر کہ ان کی اس گفتگو میں کوئی اور بھی شریک ہو گیا ہے۔

حیا سے انعم اور فارعہ کہتی ہیں کہ اسفند بالکل بھی قابل بھروسا نہیں ہے۔ وہ ایک نمبر کا فلرٹ انسان ہے۔ ڈرنک کرنا، اسموکنگ کرنا، آئے دن دوستوں کے لیے محفلیں سجوانا یہ سب اس کے مشاغل ہیں۔

یونیورسٹی مستحق اور قابل اسٹوڈنٹس کے لیے ایک نیا فنڈڈ اسکالرشپ پروگرام شروع کرتی ہے۔ جس کا ڈائریکٹر اسفند ہے۔ اس سلسلے میں میگزین ایڈیٹر کے لیے سلوئی کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ اس کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسفند بھی سلوئی کی ذہانت سے متاثر ہوتا ہے۔

حاتم گردیزی کمپنی کی میٹنگ ختم ہونے کے بعد جرار سے طیبہ اور حیا کے ساتھ اس کے رویے کی شکایت کرتے ہیں۔ تو جرار اور ان کے درمیان بحث و تکرار ہوتی ہے۔

بدگمانیوں کا ایک انبار تھا جو جرار گردیزی نے اپنے اندر لگا رکھا تھا۔

حیا سلوئی سے اسفند کے متعلق انعم اور فارعہ کی کہی باتوں کا ذکر کرتی ہے تو سلوئی یقین نہیں کرتی۔

جرار لان میں حیا سے بدتمیزی کرتا ہے تو حیا کو اپنے بے امان ہونے کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

نرگس بی بی بہادر کے لیے اپنی بھتیجی زمرد کو بیاہ کر لائی تھیں۔ بہادر اور زمرد کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ زمرد نے اسکول کی شکل دیکھی تھی اور نہ ہی اس میں گھرداری کا سلیقہ تھا۔ اس لیے بہادر اپنے دل کی پوری آمادگی کے ساتھ خود کو اس کی جانب مائل نہ کر سکا تھا۔ بہادر کا زیادہ وقت اب شہر میں گزرتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے ایکسپورٹ کا بزنس بھی شروع کر دیا تھا۔

سلوئی اور اسفند کی ملاقاتیں بڑھنے لگتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

بخت چوہدری حاتم سے بلند اور خولہ کے رشتے کی بات کرتے ہیں۔ خولہ اس رشتے پر حامی بھر لیتی ہے۔

انیسویں قسط

شہر کے مشہور ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے وہ خاصے پرکیف سے ماحول میں

...رہے تھے۔ روشنیاں بکھیرتے قیمتی فانوس، ہنستے مسکراتے سجے سنورے چہرے اور دھیمے سروں میں بجتا ساز۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں آنے والا ہر فرد ہر فکر، ہر غم سے آزاد تھا۔

سلوئی نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنے اطراف میں ایک نظر ڈالی اور یک دم ٹھٹک کر رک گئی۔ ان سے ایک میز چھوڑ کر پانچ لڑکیوں کا گروپ بیٹھا تھا۔ اور سب ہی کی نگاہیں خاصے پرشوق انداز میں اسفند پر جمی تھیں۔ وہ لب دبائے مسکرا دی۔

"آپ کو پتا ہے، آپ اس وقت ایک نہیں دو نہیں بلکہ پوری پانچ لڑکیوں کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔" اس نے سامنے بیٹھے اسفند کو دیکھا جو اپنی پلیٹ میں رکھے چکن کے پیس کو چھری سے کاٹتے ہوئے بے نیازی سے مسکرا دیا۔

"بنے رہنے دو۔"

"کمال ہے۔ آپ تو یونیورسٹی میں خاصے فلرٹ مشہور ہیں۔ ان حسیناؤں کو دیکھیں گے نہیں؟" وہ شرارت سے بولی۔ اسفند نے ہاتھ روکتے ہوئے محظوظ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پہلی بات، میرے سامنے جو حسینہ بیٹھی ہے مجھے اس کے علاوہ فی الحال کسی اور کو نہیں دیکھنا۔ دوسری بات، یہ بتاؤ محترمہ کہ تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔۔۔ میرے فلرٹ ہونے پر یا ان سے فلرٹ نہ کرنے پر؟"

"دونوں پر۔" سلوئی مسکرائی۔ "ویسے سچ سچ بتائیں، کیا آپ واقعی عاشق مزاج ہیں؟" وہ متجسس سی آگے کو جھکی تو اسفند قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"قسم سے، تم پہلی محبوبہ ہو جو اتنی اسٹریٹ فارورڈ واقع ہوئی ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔ سلوئی کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا مطلب؟ مجھ سے پہلے کتنی تھیں؟" اسے مشکوک نظروں سے تکتے وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ اسفند نے بامشکل تمام اپنی امڈتی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

"سچ کہوں تو تعداد یاد نہیں۔" مزے سے کہتے ہوئے اس نے نوالہ منہ میں رکھا۔ سلوئی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"اسفند!" اس کی دہائی بے اختیار تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر اسفند جو ہنسا تو پھر ہنستا چلا گیا۔ سلوئی نے خفگی سے اسے گھورا۔

"اور یہاں میں سمجھ رہی تھی کہ جناب بے حد شریف واقع ہوئے ہیں۔" وہ منہ پھلائے بولی۔ اسفند نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شریف تو میں ہوں۔ جب ہی تو آج تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں تمہاری محبت کو اپنی زندگی کی آخری محبت بنانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں سلوئی۔" گمبھیر لہجے میں کہتے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔ سلوئی بے اختیار خاموش ہوگئی۔

"آپ جانتے ہیں یہ اتنا آسان نہیں۔" وہ دل گرفتہ سی بولی۔ اسفند نے اک گہری سانس لی۔ وہ جرار سے سلوئی کی منگنی کے بارے میں جانتا تھا۔

"مشکل میں ہاتھ ڈالیں گے تو وہ آسانی میں بدلے گی ناں۔ ایسے کب تک کنارے پہ کھڑے رہ کر دریا کی گہرائی ناپتے رہیں گے؟"

"پتا نہیں۔" بے بسی سلوئی کی آنکھوں سے ہی نہیں پورے چہرے سے ہویدا تھی۔

اسفند اس کے ہاتھ چھوڑ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی پر حدت گرفت کی گرماہٹ سلوئی کے ہاتھوں سے جدا ہوئی تو اسے یوں لگا جیسے یک لخت ہی اس کے ہاتھ خالی رہ گئے ہوں۔ وہ لب کاٹتی نگاہوں کا زاویہ بدل گئی۔ اسفند نے ایک نظر اس کے ملول چہرے کو دیکھا۔

"دیکھو سلوئی، میں کوئی تم سے دل لگی نہیں کر رہا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تم مجھے واضح الفاظ میں اپنا عندیہ دو تاکہ میں ایک دو دن تک اپنے گھر والوں کو تمہاری طرف بھجوا سکوں۔" اس کی بات پر سلوئی پریشان ہوگئی۔

"پلیز اسفند، یہ غضب نہ کیجیے گا۔"

"تو یہ معاملہ آخر کیسے آگے بڑھے گا؟" اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "یا پھر تم خود ہی اس بات کو کوئی منطقی انجام نہیں دینا چاہتیں؟"

"اسفند!" سلوئی کے دل پر ضرب سی لگی۔ "آپ میری محبت پر شک کر رہے ہیں؟"

"میں شک نہیں کر رہا۔" وہ جھنجلا سا گیا۔ "لیکن تمہارا رویہ کوئی خاص حوصلہ افزا بھی نہیں۔" خفگی سے کہتے وہ رخ موڑ گیا۔ سلوئی نادم سی خاموش ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اسفند کی جگہ اگر وہ ہوتی تو شاید اس ساری صورت حال سے وہ بھی ایسا ہی کوئی نتیجہ اخذ کرتی۔ کیونکہ یہ وقت کمزوری دکھانے کا نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ہمت بندھانے کا تھا۔ ساتھ نبھانے کا تھا۔ اور اسفند بھی دل ہی دل میں شاید اس سے ایسی ہی کسی مضبوطی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ مجھے کچھ دنوں کی مہلت دیں۔ میں مما سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دل میں مصمم ارادہ باندھتے ہوئے بولی تو اسفند نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

"سوچ لو۔ پھر نہ کہنا کہ محض میری باتوں میں آکر ایک نئے طوفان کو دعوت دے ڈالی۔" اس کی چوٹ پر سلوئی کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

"بے فکر رہیں۔ محبت نبھانا صرف اسفند یار کو ہی نہیں سلوئی گردیزی کو بھی آتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ مضبوط لہجے میں بولی تو۔ ایک جاندار سی مسکراہٹ اسفند کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اس کے خفا چہرے پر جھولتی لٹ کھینچی۔

"یہی تو وہ انداز ہے جس نے اسفند یار کو چاروں خانے چت کیا ہے۔" گمبھیر لہجے میں کہتا وہ اس کی جانب جھکا تو سلوئی کے لیے اپنی ناراضی کو برقرار رکھنا مشکل ہوگیا۔ وہ مسکراہٹ دبائے پیچھے کو ہٹی۔

"اچھا، بس بہت ہوگیا۔ اب اپنے کھانے پر توجہ دیں۔ پہلے ہی ٹھنڈا ہو چکا ہے۔"

"جو حکم سرکار۔" اسفند نے شوخی سے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر کو خم کیا تو سلوئی اس ڈرامے بازی پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

گردیزی ہاؤس میں آج صبح سے بڑی خوش گوار ہلچل مچی ہوئی تھی۔ خولہ کی رضامندی کے بعد آج بخت چوہدری اپنی فیملی کے ساتھ باقاعدہ طور پر اس کا رشتہ لے کر آرہے تھے۔ سب کی خوشی دیدنی تھی۔ ایسے میں جب طیبہ اور حیا، حاتم گردیزی کی معیت میں لاؤنج میں داخل ہوئیں تو وہاں ایک پل کو سناٹا چھا گیا۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟" زینب نے سرد نظروں سے سامنے کھڑی سوتن اور اس کی بیٹی کو دیکھا۔ ان کے انداز پہ حیا کے اندر ناگواری کی شدید لہر اٹھی تھی جسے اس نے بامشکل تمام برداشت کیا۔ حاتم صاحب نے تیز نظروں سے بیوی کو گھورا۔

"وہی جو تم کر رہی ہو۔" ان کا لہجہ بے حد جتاتا ہوا تھا۔ زینب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"میں یہاں اپنی بیٹی ـ ـ ـ ـ"

"خولہ صرف تمہاری ہی نہیں میری بھی بیٹی ہے......" انہوں نے باآواز بلند انہیں ٹوکا۔ "اور جو چیز میری ہے اس پر طیبہ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہارا۔ میری خوشی، میری غمی میں وہ برابر کی شریک ہے اور رہے گی۔ خبردار، جو دوبارہ کسی نے مجھ سے یہ بے ہودہ سوال کیا تو۔" کڑے لہجے میں کہتے انہوں نے فہمائشی نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

زینب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے۔ وہ چند لمحے شعلے برساتی نگاہوں سے شوہر کو دیکھتی رہیں اور پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر چلی گئیں۔ ان کے وہاں سے ہٹتے ہی اردگرد پھیلی خاموشی کچھ اور گہری ہوگئی۔

صوفے پر براجمان شاہ مخدوم گردیزی نے لبوں پر چپ جمائے، سپاٹ نظروں سے اس سارے منظر کو دیکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ایک کی آڑ میں سب کے کان کھولنے والی اس حرکت پہ بیٹے سے ضرور باز پرس کرتے۔ مگر آج گھر میں بدمزگی پھیلانے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے خاموشی کو ترجیح دیتے ہوئے اس ساری بحث کو نظرانداز کردیا۔

"جاؤ بیٹا، ماں کو بہن کے پاس لے کر جاؤ۔" حاتم صاحب پلٹ کر حیا سے مخاطب ہوئے تو وہ خود پہ قابو پاتی طیبہ کے ساتھ آگے بڑھی لیکن سیڑھیوں تک پہنچتے اس کے قدم سست پڑ گئے۔ جرار گردیزی، نیچے پہلی سیڑھی کے پاس دونوں انگوٹھے پینٹ کی جیبوں میں اڑسے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ حیا کی دھڑکن تیز ہوئی۔ وہ بے اختیار پلکیں جھکا گئی۔ مگر اس کے باوجود اسے جرار کی تیغ صفت نگاہیں اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر اوپر چلی گئی تو پیچھے ایک واضح تناؤ در آیا۔ جرار نے اک تپش بھری نظر باپ پر ڈالی اور تیز قدموں سے زینہ طے کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ماحول پہ اک عجیب سا بوجھل پن چھا گیا۔ لیکن مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ احساس خود بہ خود پس پشت چلا گیا۔ بخت چوہدری نے نہایت محبت اور چاہت سے آقا جان کے سامنے خولہ کے لیے دست سوال دراز کیا جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ ان کی فیملی کا اصرار تھا کہ اگلے جمعے کو منگنی کی تقریب منعقد کی جائے مگر شاہ صاحب کے انکار نے سب کو ایک پل کے لیے حیران کردیا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر چاچا جی، لیکن اگر نشانی کی ایک چھوٹی سی تقریب ہو جاتی تو اچھا ہو جاتا۔" بخت چوہدری سنبھل کر بولے۔

شاہ مخدوم مسکرا دیے۔

"چھوٹی کیوں بڑی تقریب رکھو۔ مگر منگنی کی نہیں نکاح کی۔"

"نکاح؟" سب نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ میں منگنی جیسی غیر شرعی خرافات کے حق میں نہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اگلے جمعے کو ہم نہ صرف بلند اور خولہ کا بلکہ جرار اور سلوئی کا بھی نکاح کر دیں۔"

"کیا؟" سب کی سب کو حیرت ہوئی تھی۔ جبکہ سلوئی کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔ اس نے پھٹی پھٹی بے یقین آنکھوں سے دادا کا چہرہ دیکھا تھا جو اس پر قیامت کا صور پھونکنے کے بعد اب تنقیدی نظروں سے سب گھر والوں کی حیرت کا جائزہ لے رہے تھے۔

"اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ کیا ان دونوں کے رشتے کو آگے نہیں بڑھانا؟"

"بڑھانا ہے۔ بالکل بڑھانا ہے آقا جان۔ لیکن اتنی جلدی سب کیسے ہوگا؟" سبحان صاحب پریشان سے بولے۔

"سب ہو جائے گا۔ ویسے بھی تمہیں کون سا کسی غیر کو بیٹی دینی ہے؟ اپنے گھر ہی کی تو بات ہے۔" انہوں نے ناگواری سے بیٹے کو ٹوکا اور بخت چوہدری کی جانب پلٹے۔

"یقین مانو بخت، اگر میرا بس چلے تو میں اسی دن دونوں بچیوں کی رخصتی کر کے ان کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مگر نجانے ان لوگوں نے یہ کون سی نئی پڑھائیوں کے جھنجھٹ پال لیے ہیں۔ بھلا کوئی پوچھے کہ ہم نے کوئی لڑکیوں سے نوکریاں کروانی ہیں جو یہ انہیں یوں ڈگریوں پہ ڈگریاں دلوانے پر تلے بیٹھے ہیں؟" خفگی سے کہتے انہوں نے بدمزگی سے سر جھٹکا تو پل بھر کو خاموشی چھا گئی۔ بخت چوہدری سبھاؤ سے مسکرا دیے۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں چاچا جی۔ لیکن کیا، کیا جائے کہ آج کل کے دور میں اعلیٰ تعلیم لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لیے بے حد ضروری ہو گئی ہے۔ اب دیکھیں ناں، بچیاں کتنی محنت سے دن رات ایک کر کے اپنی پڑھائی مکمل کر رہی ہیں۔ ایسے میں ان کی تعلیم کو ادھورا چھڑوا دینا تو بڑی زیادتی والی بات ہوگی۔ باقی جہاں تک آپ کی نکاح والی بات ہے تو مجھے وہ پسند آئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منگنی جیسے کچے کام سے نکاح بدرجہا بہتر ہے۔ باقی رخصتی ہم ان کے فائنل ایگزامز کے بعد رکھ لیں گے۔ کیا خیال ہے حاتم؟" وہ خاموش بیٹھے دوست کی جانب پلٹے۔ انہوں نے اک گہری سانس لی۔

"ہاں نکاح مناسب رہے گا۔ ویسے بھی ان سب کا دھیان جتنی جلدی اپنی آنے والی ذمہ داریوں کی جانب مرکوز ہو جائے۔ اتنا ہی ان کے لیے بہتر رہے گا۔" انہوں نے ایک جتاتی نظر بیٹے پر ڈالی تو وہ ناگوار سا نگاہوں کا رخ پھیر گیا۔

شاہ مخدوم کے چہرے پر اطمینان بھری مسکان آ ٹھہری۔

"بس تو پھر اگلے جمعے کو ہم ان شاء اللہ ایک نہیں بلکہ دو، دو خوشیوں کے منہ دیکھیں گے۔ چلو بہو، سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔" انہوں نے ٹیبل پر رکھی مٹھائی کی جانب اشارہ کیا۔

منیرہ نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر پلیٹ تھام لی۔ ڈرائنگ روم کی فضا میں یک لخت ہی خوش گواری ہلچل مچ گئی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگا۔ ایسے میں سب سے پیار اور دعائیں لیتی سلویٰ کی جھکی آنکھوں سے کب نارسائی کا پہلا قطرہ گرا کسی کو پتا ہی نہ چلا۔

☆☆☆

بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی سلویٰ کا سر اپنے گھٹنوں پر دھرا تھا اور آنسو بہاتی آنکھیں بے جان انداز میں کھڑکی سے باہر پھیلے اندھیرے پر جمی تھیں۔ اس کی قسمت کا فیصلہ یوں اچانک کر دیا جائے گا اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے اپنی کم ہمتی پر افسوس اور پچھتاوا ہو رہا تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو اس نے کتنے وثوق سے اسفند کے سامنے اپنی محبت کو نبھانے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور آج اس کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی قید کا پروانہ جاری کر دیا گیا تھا اور وہ کچھ نہ کر سکی تھی۔

حالانکہ جو بھی ہوا تھا اس میں کچھ بھی انہونا نہ تھا۔ وہ جرار کی منگیتر تھی اور اسے ایک نہ ایک دن اس کے سنگ رخصت ہونا ہی تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ یہ حقیقت بچپن سے اس کے ساتھ منسلک ہونے کے باوجود اس سے اپنا آپ اس طرح نہ منوا پائی تھی جس طرح کہ اسفندیار کے ساتھ دیکھا گیا اک خواب محض چند ہی ماہ میں منوا گیا تھا۔

عزت اور احساس کی چاشنی میں ڈوبی چاند کی کرنوں سی نرم اور اجلی محبت کیا ہوتی ہے یہ اسے اسفندیار کی ہمراہی میں پتا چلا تھا جو اسے اس قدر ٹوٹ کے چاہتا اور سراہتا تھا کہ سلویٰ کو اپنا آپ کسی معتبر ہستی سا لگنے لگا تھا۔ وہ اسفند کی حیات کا محور و مرکز بن گئی تھی اور سلویٰ کے لیے بھی اب اس کے بنا زندگی کا تصور محال تھا۔ وہ اپنی جان تو دے سکتی تھی۔ لیکن اسفند کے سوا کسی اور کو اپنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں مگر آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی اسی وقت جا کر سب کے سامنے واشگاف الفاظ میں نا صرف اس نکاح سے بلکہ جرار گردیزی کے پورے وجود سے انکار کر دے جس کے پاس خود سے منسلک لوگوں کو دینے کے لیے پیار اور توجہ تو دور، دو میٹھے بول تک نہ تھے۔

سلویٰ کے اندر جذبات کا اک گھمسان کا رن پڑا تھا۔ غصہ، نفرت، بے بسی ہر احساس جیسے اپنے عروج پر تھا۔ ایسے میں تمام کاموں سے فارغ ہو کر مسکراتی ہوئی منیرہ جب اس کے روبرو آئی تھیں تو وہ جیسے خود پر سے ہر اختیار کھو بیٹھی تھی۔

"میں آپ کو بتا رہی ہوں مما---" سختی سے آنسو پونچھتی وہ تیزی سے بیڈ سے نیچے اتری تو اپنے دھیان میں آگے بڑھتی منیرہ ٹھٹک کر رک گئیں۔ "میں کسی صورت یہ نکاح نہیں کروں گی۔ میری طرف سے انکار ہے۔ صاف انکار!"

"سلویٰ!" حیران پریشان سی منیرہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے؟ بھونچکی نظروں سے بیٹی کے بکھرے حلیے، سرخ چہرے اور سوجی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے ان کی الجھن اپنے عروج کو جا پہنچی تھی۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ انہیں اس حلیے اور اس حال میں ملے گی۔

"یہ۔۔ یہ سب کیا ہے بیٹا؟" وہ بے قراری سی آگے بڑھیں تو سلویٰ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ منیرہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گئیں۔

"وہی جو آپ سن رہی ہیں۔ مجھے یہ نکاح نہیں کرنا۔" اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔

"ٹھیک ہے......" منیرہ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اسے پرسکون کرنا چاہا۔ "تم اگر ابھی نکاح نہیں کرنا چاہتیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تمہارے بابا---"

"نہ ابھی، نہ آئندہ کبھی۔ مجھے جرار گردیزی سے شادی ہی نہیں کرنی۔"

ان کی بات کاٹتے وہ مٹھیاں بھینچے غصے سے بولی تو منیرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

"تم ہوش میں تو ہو؟ یہ۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" ان کا پورا وجود جیسے بے یقینی کی زد میں تھا۔ ماں کی حالت سلویٰ کو نگاہیں چرانے پر مجبور کر گئی۔

"وہی جو مجھے بہت پہلے کہہ دینا چاہیے تھا۔ مجھے جرار سے اپنا رشتہ کسی صورت منظور نہیں۔" ان سے نظریں ملائے بنا وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔ منیرہ کو لگا جیسے ان کا دماغ اڑ جائے گا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟" انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ سلویٰ کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئیں۔

"پہلے ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ مجھے جرار جیسے خود پرست اور بے حس شخص کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں جوڑنا مما۔ میں اپنی ساری زندگی ایک ایسے اکھڑ اور مغرور شخص کے ساتھ برباد نہیں کر سکتی جس کے پاس مجھے دینے [illegible] نکلے تو منیرہ کو لگا جیسے کسی نے ان [illegible]

کا دل مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔ اس کے بازو پر ان کی گرفت خود بہ خود ڈھیلی پڑ گئی۔

"تم پریشان مت ہو میری جان۔ میں اور تمہارے بابا خود جرار سے بات کریں گے۔ اسے سمجھائیں گے۔ تم چیزوں کو تھوڑا سا وقت دو۔ شادی کے بعد انسان بہت بدل جاتا ہے۔" نرمی سے کہتے انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ سہلایا۔ سلوٰی کی آنکھوں میں بے بسی پھیل گئی۔

"اور میں اپنے دل کا کیا کروں گی؟ اسے کیسے بدلوں گی؟" وہ دھیرے سے بولی۔

منیرہ کا بیٹی کے چہرے پر گردش کرتا ہاتھ تھم سا گیا۔ کچھ تھا اس کی آنکھوں میں جو انہیں ایک پل کو خوف زدہ کر گیا تھا۔ ان کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"میری......" وہ لحظہ بھر کو اٹکی۔ "میری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے مما۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتی وہ دھیرے سے بولی۔ منیرہ کو لگا جیسے ان کا خوف فقط ایک ہی جملے میں کسی عفریت کا روپ دھارے ان کے روبرو کھڑا ہوا ہو۔ وہ دم سادھے اپنی لاڈلی کو دیکھے چلی گئیں۔ ان کے چہرے کی زردی سلوٰی کو گھبراہٹ میں مبتلا کر گئی۔ اس نے بے اختیار ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

"پلیز مما! خود کو سنبھالیں۔ باخدا میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے جرار کے ساتھ اپنے رشتے کو پوری ایمان داری سے نباہنے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس کی بے حسی اور رکھائی نے میری ہر کوشش پر پانی پھیر دیا۔ ایسے میں جب اسفند سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ چاہے جانا دراصل کس احساس کا نام ہے۔ کسی کے لیے معتبر ہونا۔۔۔۔"

"بس!" غصے سے کہتے منیرہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ "تمہیں احساس بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" ان کی آواز صدمے سے چور تھی۔ سلوٰی نادم سی لب کاٹ کر رہ گئی۔

"جانتی ہوں۔ لیکن میں اپنی جگہ بے حد مجبور ہوں مما۔ میں اگر آج اپنی محبت کے لیے نہ بولی تو شاید اپنے ساتھ بہت بڑی زیادتی کر جاؤں گی۔"

اس کی بات پہ اک کرب آمیز مسکراہٹ منیرہ کے لبوں کو چھو کر غائب ہو گئی۔

"کتنی اچھی بیٹی ہو تم۔ کتنی پروا ہے تمہیں اس محبت کی جسے پروان چڑھے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے۔ اور ہماری محبت؟ اس کا کیا؟ تمہارے باپ کی بے لوث شفقت، ان کا تم پر اندھا اعتماد، میرا مان، میری تربیت اس سب کا کیا سلوٰی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ جیسے پھٹ پڑی تھیں۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب میں اپنی بیٹی کے منہ سے سن رہی ہوں۔ تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو؟ تم مجھے اور اپنے باپ کو سارے خاندان کے سامنے کیسے رسوا کر سکتی ہو؟"

"اللہ نہ کرے جو آپ لوگ رسوا ہوں......" سلوٰی تڑپ اٹھی۔ "کسی کو شرافت کے دائرے میں رہ کر پسند کرنا جرم نہیں ہے مما۔ آپ ایک بار اس سے مل کر تو دیکھیں۔ وہ۔ وہ بہت اچھا ہے۔"

منیرہ لب بھینچے چند لمحے خاموشی سے بیٹی کو تکتی رہیں۔

"کیا وہ جانتا ہے کہ تم بچپن سے منگنی شدہ ہو؟" ان کی سپاٹ آواز اچانک کمرے میں ابھری۔ سلوٰی کا سر میکانکی انداز میں اثبات میں ہل گیا۔

"جی۔"

منیرہ کے لبوں پہ اک کاٹ دار مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"بس! مجھے اچھی طرح پتا چل گیا کہ وہ کتنا شریف لڑکا ہے۔"

سلوٰی کی نگاہوں میں بے بسی پھیل گئی۔

"ایسی بات نہیں ہے مما۔ وہ جانتا ہے کہ میرا اور جرار کا کوئی دلی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی اس رشتے میں ہماری کوئی مرضی شامل ہے۔"

"تو کیا وہ اس چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہیں اپنے بڑوں کے فیصلے کے خلاف اکسائے گا؟" پیشانی پر بل لیے انہوں نے بیٹی کو گھورا۔ "ایک بات یاد رکھنا سلوٰی، جرار سے تمہاری نسبت صرف ایک رشتہ نہیں بلکہ تمہارے باپ کی زبان ہے۔ وہ زبان جو انہوں نے برسوں پہلے اپنے بھائی کو دی تھی۔ انہیں حاتم بھائی سے نا صرف بہت محبت ہے بلکہ وہ ان کی بے حد عزت بھی کرتے ہیں۔ تمہاری ایک غلطی نہ صرف تمہارے باپ کو اپنے بھائی کی نظروں میں گرا سکتی ہے بلکہ انہیں ہمیشہ کے لیے اپنے خون سے بھی جدا کر سکتی ہے۔ ان کے ذہنی سکون اور اس گھر کے اتفاق کو برباد کر سکتی ہے۔ اس لیے خدارا ہم پر رحم کھاؤ۔" بات کرتے کرتے انہوں نے یک لخت اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے سلوٰی کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔

"اور اس لڑکے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ ورنہ اس گھر میں کچھ باقی نہ بچے گا۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی پیچھے گہرا سناٹا چھا گیا۔ سلوٰی نے شکستہ نظروں سے بند دروازے کو دیکھا اور نڈھال سی قالین پہ آ گری۔ اس کی قسمت میں شاید دل کی آبادی نہ تھی۔

☆☆☆

ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی طیبہ جیولری اتار رہی تھیں جب حاتم گردیزی کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں لاکٹ کے کنڈے سے الجھتا دیکھ کر وہ ان کے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور نرمی سے ان کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے لاک کھولنے لگے۔ طیبہ کی نگاہیں آئینے میں نظر آتے شوہر کے باوقار سراپے پر جا ٹھہریں۔

اگر کوئی ان سے "زندگی" کو فقط ایک لفظ میں عبارت کرنے کو کہتا تو وہ صرف "حاتم" لکھتیں۔ وہ ان کی چادر ہی نہیں چار دیواری بھی تھے۔ جیون کی ہر بہار فقط ان کے دم سے تھی۔ وہ تھے تو طیبہ کا وجود تھا۔ ان کے بنا وہ اتنی ہی بے معنی اور ارزاں تھیں جتنی کہ راہ کی دھول۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" حاتم صاحب کی نظریں اٹھیں تو انہیں اپنی جانب تکتا پا کر وہ بے اختیار رک گئے۔

"یہی کہ اگر آپ نہ ہوتے تو آج میں کہاں کھڑی ہوتی؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتی وہ کھوئی کھوئی سی بولیں۔ حاتم گردیزی کے لب دھیرے سے مسکرا دیے۔ انہوں نے شانوں سے پکڑ کر نرمی سے ان کا رخ اپنی جانب کیا۔

"یہی بات اکثر میں بھی سوچتا ہوں کہ اگر تم نہ ہوتیں تو نجانے میرا کیا بنتا؟"

طیبہ پھیکا سا مسکرا دیں۔

"یقین مانیں کچھ اچھا ہی ہوتا۔ اور کچھ نہیں تو زندگی بہت سہل ہو جاتی آپ کی۔ میرے لیے لڑتے لڑتے آپ تھکے نہیں؟"

"تم میری خاطر صبر کے گھونٹ پیتے تھکی ہو؟" انہوں نے دوبدو سوال کیا۔

طیبہ لاجواب سی ہو گئیں۔ حاتم صاحب نے انہیں بازوؤں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کر دیا۔

"جب تم محبت کے ہر امتحان میں آج تک پوری ثابت قدمی سے کھڑی ہو تو بھلا میں کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہوں؟" ان کے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ نرمی سے بولے۔ طیبہ انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔

"تم میری ذات کا وہ گم گشتہ حصہ ہو طیبہ جو اگر مجھے نہ ملتا تو میں آج شاید زندہ تو ہوتا مگر میری روح ہمیشہ تشنہ لب رہتی۔ تمہارے پندار اور تمہاری عزت کی حفاظت میرا فرض ہے اور میں اپنے اس فرض کو زندگی کی آخری

سانس تک نباہتا رہوں گا۔" وہ اپنی آنکھوں میں محبت کا اک جہان آباد کیے ہوئے تھے۔ طیبہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اور آپ کے ذہنی اور گھریلو سکون کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ اس نکاح میں شرکت نہیں کریں گے۔ میں اس روز آپ کے لیے کسی قسم کی بدمزگی اور ٹینشن نہیں چاہتی۔"

"طیبہ۔۔۔"

"پلیز حاتم۔ اس گھر میں بڑے عرصے بعد کوئی خوشی آ رہی ہے۔ اسے کسی فضول بحث کی نظر مت کریں۔" وہ ملتجی ہوئیں۔

"یہ ممکن نہیں۔" انہوں نے سختی سے ان کی بات رد کر دی۔ طیبہ کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

"سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ زینب آپا کی زندگی کا بہت اہم دن ہے۔ وہ اپنے ایک نہیں دو، دو بچوں کے فرضوں سے فارغ ہونے جا رہی ہیں۔ ایسے میں مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں ایک ماں کی خوشی کے رنگوں کو پھیکا کروں۔ انہیں اپنی موجودگی سے پریشان کروں۔"

"یہ صرف زینب کی نہیں میری بھی خوشی ہے۔" ؟ وہ خفگی سے بولے۔ "اور میری ہر خوشی تمہارے بنا ادھوری ہے۔ کیا میں یہ برداشت کر سکوں گا کہ تم دونوں یہاں تنہا پڑی رہو اور میں اپنوں کے درمیان جشن مناتا پھروں؟" انہوں نے ناراضی سے اپنی شریک حیات کو دیکھا تو طیبہ بے اختیار نگاہیں چرا گئیں۔

"کبھی نہیں۔ کم از کم میرے جیتے جی تو یہ کبھی نہیں ہوگا۔ اس لیے اس فضول تکرار کو یہیں ختم کرو اور کل سے اپنی اور حیا کی تیاری شروع کرو۔ مجھے نکاح والے دن تم دونوں میں کوئی کمی نظر نہیں آنی چاہیے۔" قطعی لہجے میں کہتے انہوں نے اپنا کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا اور بگڑے موڈ کے ساتھ ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئے۔

طیبہ طول سی بیڈ پر آ بیٹھیں۔ ان کی ذات کسی کے لیے ناگواری کا باعث بنے یہ انہیں کبھی گوارا نہ رہا تھا۔ وہ پریشان سی آنے والی گھڑیوں کے بارے میں سوچنے لگیں۔

☆☆☆

اگلی صبح یونیورسٹی پہنچنے کے بعد سلوی نے سب سے پہلا کام اسفند کو فون کرنے کا کیا تھا جو اتنی صبح اس کی کال دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"سلوی، سب خیر تو ہے؟" اس نے تکیے پر سے سر اٹھاتے ہوئے دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھا تھا جہاں صبح کے نو بج رہے تھے۔ وہ عموماً اس وقت تک اٹھ جاتا تھا مگر کل رات دوستوں کی محفل میں اسے دیر ہو گئی تھی۔ بھی آج صبح اس کی آنکھ نہ کھل پائی تھی۔

"مجھے ابھی آپ سے ملنا ہے۔ کیا آپ مجھے لینے یونیورسٹی آ سکتے ہیں؟" وہ اس کے سوال کو نظر انداز کیے سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

اسفند پریشان سا اٹھ بیٹھا۔ اس کے انداز میں کچھ تھا جس نے اسفند کو الجھا دیا تھا۔

"میں ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔" اس نے فون رکھتے ہوئے خود پہ پڑا کمبل ہٹایا اور عجلت میں اٹھ کر باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

ٹھیک تیس منٹ بعد اس کی لینڈ کروزر یونیورسٹی کے باہر تھی۔ سلوی نے ہمیشہ کی طرح ایک نظر اطراف میں ڈالی تھی اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے سوار ہوتے ہی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

"اب کچھ بولو گی بھی یا یونہی پریشان کرتی رہو گی؟" اسفند نے روڈ پہ سے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے برابر بیٹھی سلوی کو دیکھا جو لبوں پہ چپ سی جمائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"بہتر ہوگا اگر آپ گاڑی ایک طرف لگا دیں۔" وہ بنا پلٹے بولی۔

اسفند کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ اتر آئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک ذیلی سڑک پہ گاڑی موڑتے ہوئے کنارے پہ کھڑی کر دی۔

"اب بولو سلوی۔ پہیلیاں بوجھوانا بند کرو۔ میرا دماغ گھوم رہا ہے۔" وہ غصے سے اس کی جانب پلٹا۔

سلوی نے اک گہری سانس لی اور آنے والی قیامت کی گھڑیوں کے لیے خود کو تیار کرتی اسفند کی جانب پلٹی۔ اس کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی اسفند بے اختیار چونک گیا۔ آنسوؤں سے لبریز اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ وہ بری طرح پریشان ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟" اس نے بے قراری سے اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کا لمس، اس کا چہرہ سلوی کے اندر حشر برپا کرنے لگا۔ اس نے بامشکل تمام حلق میں اٹکا آنسوؤں کا گولا نیچے اتارا۔

"م۔ میرا۔ میرا نکاح طے ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" اسفند نے اسے یوں دیکھا جیسے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ سلوی کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"میں نے اپنی محبت کو بچانے کی بہت کوشش کی اسفی مگر میں ہار گئی۔ میں ہار گئی۔" دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

اسفند لب بھینچے اسے روتا دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس کی سسکیاں خود ہی تھمنے لگیں۔

"آپ۔ آپ مجھے بھول۔۔"

"خبردار! خبردار جو تم نے مجھ سے دور جانے کی بات کی۔" تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائے وہ تند لہجے میں بولا۔ سلوی کی آنکھوں میں ٹھہرا درد کچھ اور بڑھ گیا۔

"سب ختم ہو گیا ہے اسفند! سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"کچھ ختم نہیں ہوا۔ میں ابھی چل کر تمہارے گھر والوں سے بات کرتا ہوں۔" اس نے پلٹ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ سلوی نے تیزی سے اس کا بازو تھاما۔

"کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہیں؟ میں پہلے ہی کم عذاب میں مبتلا نہیں ہوں۔ خدارا مجھ پر رحم کریں!"

اس کی دہائیوں پر اسفند کے اعصاب چیخ اٹھے۔ اس نے زور سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

"یہ نہ کروں تو کیا کروں؟ بولو کیا کروں؟" اس کی جانب پلٹتا وہ غصے سے گرجا۔ سلوی نے سختی سے اپنے آنسو صاف کیے اور سیدھی ہو بیٹھی۔

"مجھے چھوڑ دیں بس!"

اسفند چند لمحے اسے پتھرائی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے رخ موڑ گیا۔

"جاؤ چھوڑ دیا۔" اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ سا خالی پن تھا۔

سلوی یوں پلٹی جیسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہ آ رہا ہو۔ اسفند بے تاثر چہرہ لیے ونڈ اسکرین کے پار نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ سلوی کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

"اسفند۔۔۔" اس کے لب لرز اٹھے۔ اسفند یار زخم خوردہ سا مسکرا دیا۔

"چھوڑ دیا سلوی گردیزی۔ اب اور کیا چاہتی ہو؟"

سلوی نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ یہ اگر موت نہ تھی تو موت سے کچھ کم دردناک

بھی نہ تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی کھوکھلی شاخ کی طرح اس کے بازو سے آ لگی۔
"میں مر جاؤں گی اسفند۔ میں مر جاؤں گی۔" دیوانہ وار سسکتی سلوٰی کی تڑپ، اس کا درد اپنے عروج پر تھا۔ اسفند کو اپنا بازو اس کے اشکوں کی تپش سے جلتا محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔
نہیں۔ وہ اتنی کڑی اور کبھی نہ ختم ہونے والی سزا اپنے ہاتھوں اپنے مقدر میں نہیں لکھ سکتا تھا۔ وہ اتنا بہادر نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر روتی ہوئی سلوٰی کو دونوں شانوں سے تھام کر سیدھا کیا۔
"میں تم سے صرف ایک سوال کروں گا سلوٰی۔ اور صرف ایک ہی بار کروں گا۔ جواب نہ دیا تو خدا کی قسم میری اور تمہاری راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گی۔" اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ قطعی لہجے میں بولا۔ سلوٰی نے بامشکل تمام اپنی برستی آنکھیں کھولیں۔
"کیا تم ابھی اسی وقت مجھ سے شادی کرو گی؟" اور سلوٰی کی آنکھیں جیسے برسنا بھول گئیں۔ اس کے ناتواں وجود نے اسفند یار کی گرفت میں ایک زوردار جھٹکا کھایا تھا۔ اسفند نے اس کے شانوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔
"سوچ لو سلوٰی، یہ ایک دو دن کی بات نہیں۔ تمہاری زندگی کے آنے والے ہر اک پل، ہر اک لمحے کا سوال ہے۔ کیا تم اپنی پوری عمر اس کٹھن، اس درد کے ساتھ ایک ناپسندیدہ شخص کی بانہوں میں گزارنے کے لیے تیار ہو؟"
سلوٰی پوری جان سے لرز اٹھی۔
"نہیں۔"
"کیا تمہیں مجھ پہ بھروسا ہے؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"خود سے بھی زیادہ۔"
"میرا ساتھ دو گی؟" اسفند نے یک لخت اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔
سلوٰی کی سہمی ہوئی نگاہیں اس کی چوڑی ہتھیلی سے ہوتی اس کی منتظر نظروں پہ جا ٹھہریں۔
"ا۔ اگر انہوں نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا تو؟" اس کی مراد اپنے گھر والوں سے تھی۔ اسفند استہزائیہ انداز میں مسکرا دیا۔
"تم نے کیا مجھے اتنا کمزور اور لاوارث سمجھ رکھا ہے؟"
اس کی بات پہ سلوٰی نچلا لب دانتوں تلے دبائے اسے دیکھے چلی گئی۔ ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں۔ اور اس کی نہیں کا محض خیال ہی اس کے اندر قیامت برپا کرنے لگا تھا۔ بے اختیار اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے اک گہری سانس لی۔ یوں جیسے اپنی ساری ہمت، سارا حوصلہ مجتمع کر رہی ہو۔ اور پھر دھیرے سے پلکیں کھولتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ، دل و دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ، اپنی محبت کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی ماں کے ان ہاتھوں کو بھول گئی جو انہوں نے محض چند گھنٹے قبل اس کے سامنے بڑی عاجزی سے جوڑے تھے۔

☆☆☆

گردیزی ہاؤس میں تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ وقت کم اور مقابلہ سخت والا معاملہ تھا۔ چونکہ گھر کا پہلا پہلا کام تھا اس لیے آقا جان اپنے بچوں کی خوشی کو بہت دھوم دھام سے منانا چاہتے تھے۔ مہمانوں کی ایک طویل فہرست تھی جو اس موقع پر شریک ہونے والی تھی۔ ایسے میں دعوت ناموں سے لے کر

دینے والے تحائف تک اس قدر کام تھے کہ سب ہی گھر والے مسلسل بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔
ایسی صورت حال میں ایک واحد سلوٰی تھی جو لبوں پر خاموشی کا قفل لگائے اس سارے ہنگامے میں یوں تھی جیسے کوئی غیر ہو۔ اس کے رویے نے حیا اور خولہ کو الجھا دیا تھا۔ مگر وہ ان کے پوچھنے پر صاف دامن بچا گئی تھی۔ البتہ منیرہ کے اطمینان کو یہی کافی تھا کہ ان کی بیٹی نے ان کا مان اور باپ کی عزت رکھتے ہوئے اپنی ضد کو چھوڑ کر محض ان کی خاطر جزار سے اپنے رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ وہ ہر لمحہ اس کی بلائیں لیتے اور اسے دعائیں دیتے نہ تھکتی تھیں۔
اس کا یوں بجھا بجھا اور ہونا سلوٰی کو اندر ہی اندر نادم کیے دے رہا تھا۔ اس روز اس کے اقرار کے بعد اسفند یار نے اپنے ایک وکیل دوست کو فون کیا تھا جس کے بعد وہ دونوں سیدھا ڈسٹرکٹ کورٹ چلے گئے تھے جہاں پر آدھے پونے گھنٹے کی کارروائی کے بعد جب وہ باہر آئی تھی تو سلوٰی گردیزی سے سلوٰی اسفند یار بن چکی تھی۔ اس کے برابر میں کھڑا شخص اس کے محبوب سے اس کے شوہر کے درجے پر فائز ہو چکا تھا۔ سب کچھ اپنی جگہ پر ہوتے ہوئے بھی اپنی جگہ سے ہل چکا تھا۔ اس کی زندگی محض پلک جھپکنے میں ایک بالکل نئے مدار میں داخل ہو چکی تھی۔
اسفند اسے کورٹ سے واپس لے کر یونیورسٹی آیا تھا۔ جہاں سے وہ معمول کے مطابق حیا اور خولہ کے ساتھ گھر لوٹ گئی تھی۔ اس کے پلٹتے قدموں کے ساتھ کتنا بڑا طوفان لپٹ کر گردیزی ہاؤس کی دہلیز پار کر گیا تھا کسی کو احساس بھی نہ ہوا تھا۔
اسفند کی ہدایت کے مطابق سلوٰی دن رات اپنے جذبات اور اپنے اعصاب پر قابو رکھنے کی بڑی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا توں توں اس کے لیے اپنے گھر والوں، خاص طور پہ اپنے والدین کا سامنا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ صحیح اور غلط کی ایک بڑی عجیب سی جنگ اس کے اندر چھڑ چکی تھی۔ کبھی اسے اپنا آپ ان کا گنہگار لگنے لگتا اور کبھی وہ سب اسے ظالم لگتے جن سے اپنا حق چھین کر اس نے ایک بالکل جائز اور صحیح قدم اٹھایا تھا۔
اس کشمکش نے اسے جیسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات کسی سے بھی کرنے سے قاصر تھی۔ اوپر سے یونیورسٹی سے چھٹیاں لینے کی وجہ سے اسفند سے اس کا رابطہ بھی صرف فون تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بھرے پرے گھر میں یک لخت تنہا ہو گئی تھی۔ اسفند کی خاموشی ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی پریشانی اور گھبراہٹ میں اضافہ کر رہی تھی۔ مگر وہ اسے مسلسل صبر کی تاکید کیے ہوئے تھا۔
یہ معاملہ بے حد نازک تھا۔ ایک چھوٹی سی غلطی اور جلد بازی بھی ان دونوں کو بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اور وہ آخری وقت میں اپنے لیے کوئی مشکل نہیں کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا اگلا قدم تب اٹھانا چاہتا تھا جب سلوٰی کے گھر والوں کے پاس سنبھلنے اور پلٹ کر وار کرنے کا نہ تو موقع رہتا اور نہ ہی ہمت۔ جب خود ان کی عزت ان کے ہاتھوں پیروں کی زنجیر بن جاتی اور جب حالات پوری طرح سے ان پر غالب آ جاتے۔

☆☆☆

جانے تیار ہو کے ایک آخری نظر خود پر ڈالی۔ کاہی مائل گہرے سبز رنگ کے لیے فراک اور چوڑی دار پاجامے میں وہ مناسب میک اپ اور کمر تک آتے اسٹائلش سے کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ اپنی تیاری سے مطمئن ہو کے اس نے پورشن بند کیا اور باہر چلی آئی۔ اس کا رخ گھر کی مرکزی عمارت کی طرف تھا جس کی آج سج دھج ہی نرالی تھی۔
پورا گھر مع لان میں لگے درختوں کے، چھوٹے چھوٹے سنہری قمقموں سے سجا بے حد خوب صورت اور سحر

انگیز لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خوشیاں چاروں اور سے گردیزی ہاؤس پر برس رہی ہوں۔ اس نے لمحہ بھر رک کر اس دلفریب منظر کو سراہتی نظروں سے دیکھا اور پلٹ کر آگے بڑھنے لگی۔ لیکن ایلیا کو گیٹ سے اندر داخل ہوتا دیکھ کر اس کے اٹھتے قدم اپنے آپ تھم گئے۔

"آئیے جناب......" وہ مسکراتے ہوئے اپنی سہیلی کے استقبال کو آگے بڑھی۔ "مامی کہاں ہیں؟" اس نے اس کے پیچھے نظر ڈالی۔

"امی نہیں آئیں۔ ان کا آج صبح سے بلڈ پریشر کچھ ہائی تھا اس لیے بھائی نے منع کر دیا۔"

"اور بسیط بھائی؟"

"وہ مجھے ڈراپ کر کے باہر سے ہی چلے گئے ہیں۔" ایلیا کی بات پہ حیا دل گرفتہ سی خاموش ہو گئی۔

"کئی بار میرا دل کیا کہ ان سے بات کروں، مگر پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ کیا کہوں گی؟ سب کچھ تو ختم ہو گیا۔" حیا کے پژمردگی سے کہنے پر اک بوجھل سی سانس ایلیا کے لبوں سے ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔

"جب سے انہیں نکاح کا پتا چلا ہے اک چپ سی لگ گئی ہے۔ گو کہ وہ کچھ ظاہر نہیں کرتے مگر مجھے بھلا کب ان کے لفظوں کی ضرورت ہے؟ ان کا چہرہ، ان کی آنکھیں بتانے کے لیے کافی ہیں کہ وہ کتنے غم زدہ ہیں۔" ایلیا کے لہجے میں اپنے بھائی کے لیے ملال اور فکرمندی تھی۔ "کاش کہ میں ان کا یہ درد بانٹ سکتی۔ ان کا حوصلہ بڑھا سکتی۔ مگر میں نے ان پر یہ ظاہر ہی نہیں کیا کہ میں ساری حقیقت جان چکی ہوں۔"

"بہت اچھا کیا۔ ورنہ ان کے دکھ میں اس بات کا افسوس بھی شامل ہو جاتا کہ میں نے ان کے جذبوں کا پردہ نہیں رکھا۔" اس کے انداز میں ندامت تھی۔ ایلیا نے اک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

"پھپھو کہاں ہیں؟"

"اندر مہمانوں کے پاس بیٹھی ہیں۔" وہ اسے ساتھ لیے آگے بڑھی۔

"خولہ اور سلوی پارلر سے واپس آ گئیں؟"

"نہیں۔ وہ دونوں سیدھا ہال میں پہنچیں گی۔"

"تم کیوں نہیں ان کے ساتھ گئیں؟" ایلیا نے اپنے ساتھ چلتی حیا کو دیکھا۔

"بس میرا دل ہی نہیں کیا۔" وہ بے دلی سے بولی۔ "ان کے ساتھ ان کی ننھیالی کزنز اور بھابیاں وغیرہ تھیں اس لیے میں نہیں گئی۔ اور پھر تمہیں پتا ہے کہ میں بھلا کب اتنا ہیوی میک اپ کرتی ہوں۔" اس کی بات پہ ایلیا مسکرا دی۔

"ہاں بھئی کہہ سکتی ہو۔ ضرورت جو نہیں ہے۔"

"اور تمہیں جیسے بڑی ضرورت ہے؟" حیا نے مسکراتے ہوئے بلیک اور گولڈن امتزاج کے خوب صورت سے سوٹ میں اپنی کزن کے دمکتے چہرے کو دیکھا۔ "ماشااللہ سے غضب ڈھا رہی ہو۔"

"عنایت ہے آپ کی۔ ورنہ میں ناچیز کہاں آپ کی برابری کر سکتی ہوں؟" وہ ڈرامائی انداز میں بولی تو حیا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

تب ہی لاؤنج کا داخلی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور پریشان حال سے سبحان گردیزی تیزی سے باہر آئے۔ ان کے پیچھے جرار، آقا جان اور گھر کے باقی مرد بھی تھے۔ ماحول میں اچانک ہی افراتفری سی مچ گئی۔ اندر سے بھی شور کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔

حیا اور ایلیا نے سہم کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ بیٹھے بٹھائے اچانک کیا ہو گیا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

مردوں کو گاڑیوں کی جانب لپکتا دیکھ کر وہ دونوں اندر کو بھاگی تھیں۔ لاؤنج میں اک کہرام برپا تھا۔ حیا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لمحے میں ہزار طرح کے وہم اسے بری طرح خوف زدہ کر گئے۔ وہ بے چین سی سلوی کے کمرے کی جانب لپکی لیکن طیبہ پہ نظر پڑتے ہی اس کے قدم ساکت ہو گئے۔

"مما جان یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سارے مرد کہاں گئے ہیں؟" اس نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ماں کا چہرہ دیکھا جو لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ حیا بے اختیار پریشان ہو گئی اور ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام گئی۔

"بیٹا سلوی کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ وہ۔ وہ پارلر میں نہیں ہے۔" وہ متوحش سی بولیں تو حیا پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"کیا؟ ل۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ سلوی بھلا کہاں جا سکتی ہے؟" اسے لگا جیسے زمین اس کے پیروں تلے سے نکل گئی ہو۔

"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ وہ سب کے ساتھ پارلر گئی تھی۔ ایسے میں وہ اچانک کہاں غائب ہو گئی کسی کو پتا ہی نہیں۔" وہ گھبرائے لہجے میں بولیں۔ حیا نے اپنا چکراتا سر تھام لیا۔

"ان لوگوں نے باہر نکل کر آس پاس کی دکانوں سے پوچھا؟"

"سب دیکھ لیا، سب پوچھ لیا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں۔ پارلر میں اک تماشا کھڑا ہو گیا ہے۔ خولہ اور باقی بچیوں کا رو رو کے برا حال ہے۔ سارے مرد وہیں گئے ہیں۔" انہوں نے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے تفصیل سے آگاہ کیا تو حیا پتھرائی سی اپنی جگہ پہ گنگ کھڑی رہ گئی۔ یہ ان کے ساتھ کیسی انہونی ہو گئی تھی اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

سلوی نے ایک نظر اپنے برابر میں بیٹھے اسفندیار کو دیکھا جس کی چوکس نگاہیں ونڈ اسکرین کے پار نظر آتے روڈ پر جمی تھیں۔ ان کے پیچھے باڈی گارڈز کی گاڑی تھی جبکہ آگے دو گاڑیاں اور تھیں۔ چاروں گاڑیاں شام کے دھندلکے میں ہوا سے باتیں کرتی تیزی سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھیں۔

سلوی نے اپنے دل میں امڈتے دکھ اور ندامت کے طوفان کو دباتے ہوئے بے چینی سے اپنا سینہ مسلا۔ کتنی ذلت، کتنی جگ ہنسائی اور کتنا بڑا صدمہ وہ اپنے پیاروں کے نصیب میں رقم کر آئی تھی۔ سب سے بڑھ کر جو تکلیف، جو چوٹ اس نے اپنے ماں باپ کو پہنچائی تھی اس کا ازالہ تو وہ شاید اب مر کر بھی کبھی نہ کر سکتی تھی۔ اپنی خود غرضی اور بے حسی کا احساس اس کے اندر کچوکے لگانے لگا تو اس کی آنکھیں زار و قطار برس پڑیں۔ وہ کھڑکی میں منہ دیے گھٹ گھٹ کر رو دی۔

"اپنا موبائل آف کر کے سم نکال دو۔" گاڑی کی خاموش فضا میں اچانک اسفند کی آواز ابھری تو سلوی کا تڑپتا وجود ایک پل کو ساکت ہو گیا۔

اس نے پلٹ کر آنسوؤں بھری شکایتی نظروں سے اپنے شریک سفر کو دیکھا۔ اس کی نگاہیں خود پر مرکوز پا کر اسفند نے آن کی آن سڑک پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ سلوی کے چہرے پر پھیلا درد اور گلہ اسے نادم کر گیا۔ آخر یہ سب اسی کا تو پلان تھا۔ وہ بے اختیار اک گہری سانس لیتا رخ موڑ گیا۔

"اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا سلوی۔ میں اگر یہ قدم پہلے اٹھاتا تو وہ ہماری تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیتے۔"

وہ پشیمان سا بولا تو سلوی کا ضبط جیسے جواب دے گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے با آواز بلند

رو پڑی۔ اسفند نے ندامت سے اپنی پیشانی مسلی۔ سلوی کی سسکیاں اس کے دل پہ چھائے بوجھل پن میں اضافہ کر رہی تھیں۔

وہ چپ چاپ اسے اپنا کرب آنکھوں کے رستے بہاتا دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس کا درد خود ہی ٹھہرنے لگا۔ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے پرس میں رکھا موبائل نکالا اور اک نڈھال سی سانس لیتے ہوئے اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

یہ اس کی اپنے پیاروں سے تعلق کی آخری کڑی تھی۔ یہ بھی ٹوٹ جاتی تو سمجھو کہانی ختم تھی۔ ان سے دائمی جدائی کا خیال اس کی رگ و جاں میں حشر برپا کرنے لگا۔ نجانے قسمت میں آگے کیا لکھا تھا؟ لیکن ایک بات تو طے تھی کہ سلوی اسفندیار میں اب ساری زندگی اپنوں سے سامنا کرنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ ان سے رشتے کے نام پہ جو کچھ بھی بچا تھا اس پل بس اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اور وہ یہ آخری موقع کسی صورت گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

سوا اپنے وجود کی تمام تر ہمت اور حوصلوں کو مجتمع کرتے ہوئے اس نے کانپتے ہاتھوں سے بامشکل تمام اپنا موبائل تھاما تھا اور فقط ایک جملہ لکھ کر اپنے ماں باپ کے نام بھیج دیا تھا۔

☆☆☆

ایک جملہ۔۔۔اور ساری تلاش، ساری فکر اپنے آپ ختم ہو گئی تھی۔

سبحان گردیزی دونوں ہاتھوں میں سر تھامے یوں گرے تھے گویا اب کبھی نہ اٹھ پائیں گے۔ وہ تو اس بدبخت کا نام تک نہ جانتے تھے جس کے ساتھ مل کر ان کی اکلوتی، نازوں پلی بیٹی نے ان کی عزت کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ منیرہ کی چیخوں اور آہوں کی آوازیں پورے گھر میں سنائی رہی تھیں۔ بے اختیار انہوں نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

"میں آپ کی گنہگار ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔"

ان کی بند پلکوں تلے اس کے آخری الفاظ ایک بار پھر ان کا مذاق اڑانے کو آٹھہرے تو انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

کاش کہ وہ اسے بتا سکتے کہ معافی غلطی کی ہوتی ہے، ظلم کی نہیں۔ اور جو اس نے ان کے ساتھ کیا تھا وہ ظلم کی بدترین قسم تھی۔ اس سے بڑی زیادتی کوئی بیٹی اپنے والدین کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ اگر انہیں اس کے سیاہ ارادوں کی خبر پہلے ہو جاتی تو وہ اپنے ہاتھوں اسی بے رحمی سے اس کا گلا گھونٹ دیتے جس بے رحمی سے اس نے ان کے مان، ان کے بھروسے اور ان کے اعتبار کا قتل کیا تھا۔ انہیں زمانے بھر کی ذلت و رسوائی سمیٹنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ غم و غصے کی شدید لہر تھی جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

جرار کے سر پہ تو جیسے خون سوار تھا۔ اس کے سامنے جو چیز آئی تھی اس نے تہس نہس کر ڈالی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سلوی کو زمین میں زندہ گاڑ دیتا۔ اس کی بچپن کی منگیتر کا عین نکاح والے روز، اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو جانا اس کی غیرت پہ ایسا شدید تازیانہ تھا جس کی گونج کچھ ہی دیر میں پورے شہر میں سنائی دینے والی تھی۔ ایک قیامت تھی جو گردیزی ہاؤس پر آکر بیت چکی تھی اور ایک قیامت ابھی آنے کو تیار کھڑی تھی۔

خولہ کے سسرال والے، اپنے سب ہی رشتے داروں کے ساتھ، جلد ہی گاؤں سے پہنچنے والے تھے۔ صرف یہی نہیں، آج ایک دنیا کو انہوں نے اپنے ہاں مدعو کر رکھا تھا۔ ایسے میں اگر یہ بات طشت از بام ہو جاتی تو وہ عمر بھر کے لیے کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ سب کا مارے پریشانی کے برا حال تھا۔ شاہ مخدوم گردیزی کو نا صرف اپنے بزرگوں کی بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کی عزت بھی داؤ پہ لگتی نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں ایک خیال ان

... کے ذہن میں کوندے کی مانند لپکا تو اپنے کمرے کا طول و عرض ناپتے ان کے قدم اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ انہوں نے ایک پل کو رکتے ہوئے پوری تسلی سے اپنے اس خیال پر غور کیا۔ کوئی شک نہ تھا کہ ایسے کڑے حالات میں اس سے بہترین حل اور کوئی نہ نکل سکتا تھا۔ ان کے چہرے پر اک طویل اذیت بھری کشمکش کے بعد اطمینان پھیل گیا۔ انہیں آگے کیا کرنا تھا وہ اچھی طرح سے جانتے تھے۔

☆☆☆

ساکت بیٹھی طیبہ نے پتھرائی نظروں سے اپنے مقابل بیٹھے سسر کو دیکھا جو آج پہلی بار ان سے ہم کلام ہوئے تھے اور اس شرف کے بدلے انہوں نے سیدھے سیدھے ان سے ان کی سب سے پیاری اور قیمتی چیز مانگ لی تھی۔

انہیں اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے حیا کا رشتہ درکار تھا۔ دوسرے لفظوں میں انہیں اپنی ہلتی ہوئی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ان کی بیٹی کی قربانی چاہیے تھی۔ کتنی عجیب بات تھی، کل تک جو وجود شاہ مخدوم گردیزی کے نزدیک کسی صورت عزت کے لائق نہ تھے آج وہی ان کی عزت کو سہارا دینے کے لیے ناگزیر بن چکے تھے۔ بے شک اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ بڑے سے بڑے سورما کے کس بل نکالنا بخوبی جانتا ہے۔ مگر طیبہ کی مجبوری یہ تھی کہ وہ حقیقت کے اس آئینے کو ان کے روبرو نہیں رکھ سکتی تھیں کیونکہ بدلے میں ان کی سالوں کی ریاضت اور قربانیاں داؤ پہ لگی تھیں۔

"میں نے اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا جو تم اتنی گہری سوچ میں پڑ گئی ہو۔" وہ طنزاً مسکرائے تو طیبہ کے اندر ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔ رسی جل گئی تھی مگر بل نہیں گیا تھا۔

طیبہ کی نظریں بے اختیاری کے عالم میں ساکت بیٹھے شوہر پر آٹھہریں جن کی خاموشی اس بات کی غماز تھی کہ آج انہیں بھی اپنے والد کی بات سے اختلاف نہ تھا۔ یک لخت طیبہ کو اپنے گرد دائرہ تنگ ہوتا محسوس ہوا۔ اس شخص کی محبت، عزت اور وفا کا دین تو وہ کبھی مر کر بھی نہیں دے سکتی تھیں پھر بھلا آج جب انہیں ان کے ساتھ کی اشد ضرورت تھی تو وہ کیسے پیچھے ہٹ سکتی تھیں؟

اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے انہوں نے اک گہری سانس لی۔

"جیسے آپ چاہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

دھیرے سے کہتے ہوئے انہوں نے اختیار کا تمام تر حق شاہ مخدوم گردیزی کو سونپ دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا یہ فیصلہ ان کی بچی پر قیامت بن کر ٹوٹنے والا تھا۔ وہ اپنے جگر کا ٹکڑا اس شخص کے حوالے کرنے چلی تھیں جس نے آج تک انہیں ماں تو دور سرے سے ان کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ جو زینب گردیزی کا بیٹا تھا۔ وہ زینب جنہیں اپنے گھر پہ طیبہ کا سایہ تک برداشت نہ تھا۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی طیبہ کو اس گھر اور اس خاندان سے بے دخل کرنے میں صرف کر دی تھی مگر جن کے لاڈلے اور عزیز ترین شہزادے کے لیے اللہ نے اسی طیبہ کی بیٹی کا انتخاب کر لیا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

میمونہ صدف

ساون شروع ہونے کو تھا اور اللہ دتہ کالونی کے قریب سے گزرتے ریلوے ٹریک کے قریب واقع کچی آبادی میں میلہ لگنے والا تھا۔ میلے میں کھانے پینے کے ساتھ کھلونوں کے بھی اسٹالز لگا کرتے تھے۔ سرکس کے نام پہ موت کا کنواں اور آدھے دھڑ والا آدمی، جس کا اوپر کا دھڑ انسان کا اور نچلا شیر کا ہوتا، بھی شامل ہوتے۔ جھولوں میں آسمانی جھولا اور ایک چھوٹی پٹڑی والی ٹرین بھی شامل ہوتی۔ پہلے پانچ دن مردوں کا میلہ لگتا اور پھر آخری دن عورتوں کا...... عورتوں کے میلے میں مردوں کا داخلہ ممنوع ہوا کرتا۔ یہ میلہ اس علاقے کی ایک بزرگ ہستی کے مزار پہ ہر سال ساون کی پندرہ تاریخ کو شروع ہوتا تھا۔ بچے جب بھی ماؤں یا باپوں کی انگلی تھامے میلے میں جاتے تو پہلی خواہش کھلونوں کے اسٹالز پہ جانے کی ہوتی اور دوسری جھولوں پہ...... لیکن کچی آبادی سے آئے شاذ ہی بچے اپنی دونوں خواہشات پوری کر پاتے تھے اور جو کر پاتے وہ بڑے خوش قسمت ہوتے۔

مانی ملگجے سے کپڑوں میں بھی منہ ہاتھ دھو کر بابو بن کر میلے میں اکیلا گھوم رہا تھا۔ اس کی قمیص کی واحد جیب خالی تھی لیکن اسے میلے میں گھومنا ہی بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ ہر سال میلے میں گھومنے ہی آتا تھا۔ کچھ لینے یا سرکس دیکھنے کی اس کی حیثیت نہیں تھی۔ ابا جی جب اپنے ساتھ اسے اور چنی کو میلے میں لے کر جاتے تو کبھی کبھار پاؤ اندر سے خرید لیا کرتے جس میں دو چھوٹے چھوٹے اندرسے سب کے حصے میں آتے۔ کھلونے کے نام پہ ایک پلاسٹک کی سستی ترین گاڑی یا پستول اسے مل جاتی اور ایک گڑیا چنی کو...... یہ عیاشی سال کی واحد عیاشی تھی جو ابا جی اماں سے چھپ کر کروا دیا کرتے تھے اور بعد میں اماں سے خوب سنا بھی کرتے تھے۔ اور اس ایک پلاسٹک کے کھلونے کے لیے مانی اور چنی سارا سال میلے کے منتظر رہتے۔

اس وقت بھی وہ اکیلا میلے میں گھومتے ہوئے کھلونوں کے اسٹالز کے آگے جا کھڑا ہوا جہاں اب مہنگے مہنگے کھلونے سجے ہوئے تھے اور پلاسٹک کے وہ دو تین روپے کے کھلونے نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ شاید وقت کی دھول ان کھلونوں کو بھی چاٹ گئی تھی۔ وہ سب سیلوں سے چلنے والے پوں پوں کرتے مہنگے کھلونے تھے جنہیں خریدنے کی ابا جی کی بھی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے فکرمندی سے سبھی اسٹالز دیکھے لیکن مطلوبہ کھلونے تو کہیں دکھائی نہیں دیے۔

''اب ابا جی ہمیں کیا لے کر دیں گے......؟''

اس سال وہ سال کا واحد کھلونا بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

''اللہ جی، ہمارے کھلونے کہاں چلے گئے۔ اللہ جی، میری وہ گاڑی جو میں دھاگے سے باندھ کر چلاتا تھا، وہ کہاں گئی اور چنی کی گوٹے کنارے والی وہ گڑیا......؟ اب ہم کس سے کھیلیں گے......؟''

سسکتا ہوا کھلونوں کو دیکھتا جاتا تھا لیکن یہ اس کے مطلوبہ کھلونے نہیں تھے۔

تب ہی اس کی ایک سسکی سے آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب کا ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کر سائیڈ ٹیبل سے پانی کی بوتل اٹھا کر پانی پیا۔ حلق میں اگے کانٹے دور ہوئے تو سکون محسوس ہوا کہ یہ سب خواب تھا۔ خواب جو حقیقت کی پرچھائی تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ اپنا آخری مریض دیکھ کر ڈاکٹر حماد نے مسکرا کر اپنے ایک جونیئر ڈاکٹر کو دیکھا۔

''میں اب نکلوں گا شعیب۔ آج ڈاکٹر سارہ اور آپ کی کال (ڈیوٹی) ہے۔ وارڈ اور رومز وزٹ کرتے رہیے گا۔ ڈاکٹر رشدہ بھی آن کال ہیں۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں انہیں کال کر دیجیے گا۔''

وہ اپنے کالے جستی بیگ میں سامان اور کچھ اہم کاغذات ڈال رہا تھا۔ اوور آل اور اسٹیتھ اس نے بازو پہ ڈال لیا اور خدا حافظ کرتے ہوئے سرجری ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ ہسپتال کے بڑے سرجنز میں شمار ہوتا تھا۔ گو کہ یہ ایک سیمی گورنمنٹ ہسپتال تھا جو ایک خاص ادارے کے لیے مختص تھا۔ لیکن وہ اس کے علاوہ بھی شام میں ایک پرائیوٹ ہسپتال میں پریکٹس کرتا تھا۔ شادی کے چھ سال گزر جانے کے باوجود اس کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ اکثر ہی ہسپتال سے نکلتے ہوئے وہ پیڈز (بچوں) ڈیپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرتا تو بچوں سے ہیلو ہائے کرنے رک جاتا۔ بچے اسے ہمیشہ سے بے حد پسند تھے اور اسی پسندیدگی میں ہی اس کی آزمائش تھی۔

ہسپتال سے نکلتے ہوئے اسے یکدم تاریخ یاد آئی تھی۔ ہسپتال کی پارکنگ میں آتے ہی اس نے گاڑی کا لاک کھولا، اپنا بیگ، اوور آل اور اسٹیتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ رکھتے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس وقت اسے سیدھا گھر جانے کے بجائے مارکیٹ جانا تھا۔ وہاں سے کھلونوں والی دکان کا رخ کرتا تھا جہاں سے وہ پچھلے بارہ سال سے انہی تاریخوں میں کھلونے خریدا کرتا تھا۔ نہ ان کھلونوں کی کوئی تعداد مقرر تھی اور نہ ہی مالیت۔۔۔ بس جو کچھ پسند میں آتا وہ خرید لیتا۔۔۔ ڈگی اور گاڑی کی پچھلی سیٹ بھر لیتا اور گھر روانہ ہو جاتا۔

اس دن بھی یہی ہوا۔ کھلونوں کی مخصوص دکان سے کھلونے لیتے ٹھیک ٹھاک بل کی ادائی کرتے دکان کے لڑکوں کے ساتھ سامان گاڑی میں بھروا کر وہ گھر روانہ ہو گیا۔

شہر سے قدرے باہر ایک نئی سوسائٹی میں اس کا سنگل اسٹوری گھر تھا جو چھوٹا لیکن بے حد خوب صورت تھا۔ گھر کے باہر ایک چھوٹا سا لان زرمین نے اپنی مرضی سے بنوایا اور سجایا تھا۔ اسے ہمیشہ سے لان والے گھر بڑے پسند تھے۔ وہ روزانہ باقاعدگی سے لان میں بیٹھا کرتی تھی۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے اس نے کوئی مالی نہیں رکھا تھا۔ وہ خود ہی دیکھ بھال کرتی اور اپنی مرضی سے تبدیلیاں کرتی رہتی۔ اپنے گھر کو اپنے ہی ہاتھوں سے بنائی اشیاء سے سجاتی سنوارتی رہتی۔ اس نے فائن آرٹس میں ماسٹرز کر رکھا تھا اور اپنی ڈگری کو استعمال کرنا وہ خوب جانتی تھی۔

گاڑی گھر کے چھوٹے سے گیراج میں داخل ہوئی تو لان میں بیٹھی کافی پیتی زرمین خوش اخلاقی سے مسکرائی۔ ڈاکٹر حماد گاڑی سے نکل کر اسے دیکھ کر جواباً مسکرایا اور اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ زرمین کافی کا مگ وہیں میز پہ رکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔ گاڑی کی ڈگی کھل چکی تھی۔ اندر نظر پڑتے ہی زرمین کے چہرے کی رنگت ایک پل کو بدلی اور پھر گہری سانس بھرتے اس نے خود کو نارمل کیا۔ یہ کوئی ابھی سے تو ہو نہیں رہا تھا۔ یہ تو اس کی شادی سے بھی کئی سال پہلے کی کہانی تھی شاید تب کی جب سے حماد برسر روزگار ہوا تھا۔ تب لائے جانے والے کھلونوں کی تعداد کم تھی۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ ہو چکی تھی اور شاید وقت کے ساتھ مزید زیادہ ہی ہو تھی۔

''یہ میرے ساتھ اسٹور روم میں شفٹ کروا دو'' وہ بڑے ڈبے نکال کر اب باہر فرش پہ رکھ رہا تھا۔ زرمین نے سر ہلایا اور کچھ ڈبے اٹھا کر وہ اندر لے جانے لگی۔ مدد کے لیے گھر پہ کوئی نوکر نہیں تھا۔ ایک کام والی صبح صفائی کے لیے آتی تھی۔ باقی گھر کے تمام کام زرمین اپنے شوق سے خود کرتی تھی۔ یہ اس کا شوق تھا کہ وہ مکمل ہاؤس وائف ہے تو اسے ہاؤس وائف بن کر بھی دکھانا چاہیے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ صفائی والی ماسی کو بھی نہ رکھنے دیتی لیکن حماد نے اسے صفائی کی ذمہ داری اٹھانے سے روک رکھا تھا۔

کھلونوں کے تمام ڈبے بحفاظت اوپر چھت پہ بنے اسٹور روم میں پہنچا دینے کے بعد زرمین نے تھکا سا سانس لیا۔

''چینج کر لیں پھر چائے لگاتی ہوں۔'' چائے وہ باہر لان میں ہی پیتے تھے۔ موسم اچھا ہوتا تو کھانا بھی باہر لان میں ہی کھاتے تھے۔ لان کوئی بہت بڑا نہیں تھا لیکن ان کے بیٹھنے کے لیے بہت تھا۔

''ہاں ذرا جلدی کر دو پھر مجھے نکلنا بھی ہو گا۔'' وہ شام میں ایک پرائیوٹ ہسپتال میں پریکٹس کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ باقاعدگی سے نہیں کھاتا تھا۔ بس جو سینڈوچ اور سلاد زرمین ساتھ بھیجتی وہی لنچ ٹائم میں کھا لیا کرتا تھا۔ آج بازار میں کافی ٹائم لگ گیا تھا ورنہ اس وقت تک وہ چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔

جب تک ڈاکٹر حماد چینج کر کے لان میں آیا، زرمین چائے لا چکی تھی۔ چائے کے ساتھ اس نے کیک بیک کر رکھا تھا۔ رولز بھی فرائی کر لیے تھے۔

''واؤ۔ آج تو چائے پہ اسپیشل اہتمام ہے۔'' اس نے لوازمات سے سجی میز دیکھ کر تبصرہ کیا۔ زرمین مسکرا دی۔ کبھی کبھار ایسا اہتمام کرنے کا دل چاہتا تھا۔ حماد کو زرمین کے ہاتھ کے بنے کھانے بے حد مرغوب تھے اور وہ کھانے کے ساتھ تعریف کرنے میں بالکل کنجوسی نہیں کرتا تھا۔

''رات واپس آؤں گا تو گفٹس پیک کریں گے۔'' زرمین نے پھیکا سا مسکرا کر چائے کی چسکی بھری۔

''تم بھی اس مرتبہ میرے ساتھ چلنا۔'' زرمین نے سر ہلایا۔

''میں وہاں ایک قریبی گراؤنڈ میں جھولے لگوانا چاہتا ہوں۔ اسی سلسلے میں مجھے تمہاری رائے درکار ہے۔'' زرمین کتنی دیر اسے دیکھتی رہی۔

''ایک بات پوچھوں......؟'' حماد نے سر اثبات میں ہلایا۔

''کیا آپ ان بچوں سے ایسی محبت اس لیے کرتے ہیں کہ ہمارے بچے نہیں ہیں......؟'' وہ بہت عرصے سے اپنے دل میں مچلتے سوال کو روک نہیں پائی تھی۔ پہلے حماد کے چہرے کا رنگ بدلا پھر وہ شاکڈ سا زرمین کو دیکھنے لگا۔ اس بات کی اسے ایک فیصد بھی زرمین سے توقع نہیں تھی۔

''تم ایسا سوچتی ہو۔۔۔؟''

وہ شاکڈ تھا، یہ زرمین کو دکھائی دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے اسے اپنے سوال پہ بھی افسوس ہوا تھا۔

''مجھے لگا کہ......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ اب مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔

''تمہیں لگا کہ میری اولاد نہیں ہے تو میں دوسرے بچوں پہ اپنے ارمان پورے کر رہا ہوں۔'' اسے یہی لگا تھا اسی لیے وہ خاموش تھی۔ حماد کا موڈ خراب ہو چکا تھا اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ تم میرے بارے میں ایسا سوچتی ہو۔'' اسے دکھ تھا۔ صدمہ تھا۔ کیا وہ اس کو بس اتنا ہی سمجھتی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے سالوں میں بس اتنا ہی جان پائی تھی۔ زرمین خاموش تھی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ اسے یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی اگر وہ ایسا سوچتی بھی تھی تو۔

''تم بالکل غلط سوچتی ہو۔ بچے مجھے پسند ہیں۔ لیکن یہ سب میں اس لیے نہیں کرتا کہ میری اولاد نہیں ہے۔''

"تو آپ بتاتے کیوں نہیں کہ ہر سال آپ کیوں ان بچوں میں یہ کھلونے لے جا کر تقسیم کرتے ہیں۔۔۔؟"

"کیونکہ بہت سال پہلے میں نے ایک دن خود سے یہ وعدہ کیا تھا۔ میں وہ وعدہ پورا کرنے جاتا ہوں۔" زرمین نے گہری سانس بھری۔ حماد کچھ دیر خاموش رہا۔ زرمین بے چینی سے انگلیوں کے کڑاکے نکالتی رہی۔

"اس دفعہ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ میں نے تمہیں ان بچوں سے ملوانا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ ایسے نارمل ہو چکا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

"کون سے بچے۔۔۔؟" زرمین بہ مشکل مسکرائی تھی۔ جب بھی کوئی ناخوشگوار بات ہوتی تھی تو وہ اتنی جلدی نارمل نہیں ہو سکتی تھی جتنی جلدی حماد خود کو کر لیتا تھا۔

"وہ تین بچے...... چنی، مانی اور ننھی۔" زرمین اس کی بات پہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

کچے کمروں کے کونے کھدروں میں جتنے بھی ٹوٹے پھوٹے کھلونے تھے وہ سب ہی دونوں نے جمع کر کے ایک ڈبے میں بند کر دیے تھے۔ ان میں سے چند ایک ابا جی نے دلائے تھے اور کچھ ابا جی کے فیکٹری والے صاحب اپنے بچوں کے بھجوا دیتے تھے جو کہ زیادہ تر ٹوٹے ہوئے ہی ہوتے تھے لیکن ان کے لیے تو یہ ٹوٹے ہوئے کھلونے بھی کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ ہوتے تھے۔ ابا جی بھلا طرح طرح کے کھلونے کہاں دلوا سکتے تھے۔

"اب ان کھلونوں کا کیا کرو گے بھائی......؟"

چنی اپنی پسندیدہ گڑیا بغل میں دبائے اس سے پوچھ رہی تھی جس پہ مانی کی نظریں لگی تھیں۔ یہ ان سب کھلونوں میں سب سے شاندار تھی اور اس کے دام بھی اچھے مل جانے تھے۔

"میں انھیں ڈبو چاچا کو بیچوں گا۔ اس سے جو پیسے ملیں گے ان سے ہم اس بار میلے سے جا کر نئے اور اچھے کھلونے کافی ساری تعداد میں خرید سکیں گے۔" اس کی بات سن کر چنی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ڈبو چاچا اس آبادی کا کباڑیہ تھا جو ہر طرح کا مال خرید لیتا تھا۔

"سچ میں بھائی......؟" اسے اپنے بھائی پہ ہمیشہ سے مان رہا تھا جو آبادی کے بچوں کا لیڈر مانا جاتا تھا۔ ذہین تھا تو دماغ خوب چلتا تھا اور ایسی تراکیب تو خوب ہی سوجھتی تھیں۔

"اور نہیں تو کیا......؟ ان سب ٹوٹے کھلونوں کے بدلے اچھے پیسے مل جائیں گے۔ اس سے ہم اپنی پسند کے کھلونے خرید سکیں گے۔ ان ٹوٹے کھلونوں کا ہم نے کیا کرنا اب۔۔۔؟" چنی متفق تھی۔ کسی گاڑی کے ٹائر نہیں تو کسی گڑیا کا سر نہیں۔ کوئی برتن سوراخ شدہ تھا اور کوئی چوں چوں والی بلی بغیر سیٹی کے...... اس سے اچھا تھا کہ وہ انہیں بیچ کر نئے اور من پسند کھلونے خرید لیتے۔

"میں اس بار گڑیا کا وہ گھر لوں گی جس میں اس کے کپڑے اور سرخی پاؤڈر کا سامان بھی ہوتا ہے۔" وہ سوچ کر ہی پرجوش تھی۔ آخری دفعہ اس نے بڑی حسرت سے وہ گڑیا میلے میں دیکھی تھی جو ہر دوسرے دن اس کے خواب میں آتی تھی۔ جاگتے میں بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔

"اور میں اس بار تلوار اور گولیوں والی بندوق لوں گا۔" مانی کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ وہ اپنی خواہشات کو سوچتے خوش ہو رہا تھا۔

"اور اگر تم یہ گڑیا دے دو تو اس کے اور بھی اچھے پیسے مل جائیں گے۔" وہ اب پھر سے اس کی گڑیا کو دیکھ رہا تھا جو چنی نے جھٹ سے پیچھے چھپا لی۔

"یہ تو میں کبھی نہیں دوں گی۔" اس نے سر نفی میں ہلایا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی پسندیدہ گڑیا ہے۔ لیکن وہ تین سال پرانی تھی۔ اسے اب ریٹائر کر دینا چاہیے تھا اور اس کی جگہ کسی اور کو دے دینی چاہیے تھی لیکن چنی اپنے کھلونے اتنا سنبھال کر رکھتی تھی کہ کھلونا بھی نیا ہی دکھتا تھا۔ وہ یا تی کسی کام کا ثبوت نہیں دیتی تھی سوائے کھلونوں میں اس کی جان بستی تھی۔

"میں جب افسر بن جاؤں گا تو تمہیں اس سے بھی زیادہ کھلونے دلواؤں گا۔" چنی نے گڑیا لے کر اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"اتنے پیسے کہاں سے لاؤ گے......؟" مانی نے سر پہ ہاتھ مارتے اس کی عقل کو کوسا۔

"جب افسر بن جاؤں گا تو ڈھیر پیسے ملیں گے ناں پاگل لڑکی۔"

چنی کو اب اس کی بات سمجھ میں آئی۔ کچھ دیر سوچا پھر دل بڑا کیا۔ پھر پیچھے سے ہاتھ نکالا جس میں گڑیا تھام رکھی تھی اور اس کی جانب بڑھا دی۔

"اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" مانی مسکراتے ہوئے اب اس گڑیا کو بھی ڈبے میں بند کر رہا تھا۔

ڈبا لیے وہ ڈبو چاچا کی دکان پہ چلا گیا جو آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ دکان میں موٹے پیٹ والا ڈبو چاچا بیٹھا پیسوں کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ وہ جب بھی ہنستا تھا اس کا پیٹ تھل تھل ہلتا تو مانی کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑتا۔

"ہاں بھئی لڑکے، کیا لائے ہو اس ڈبے میں......؟" اسے آتا دیکھ کر چاچا نے جلدی سے پیسے اپنے باوا آدم کے زمانے کی میز کی دراز میں ڈال کر کھٹ سے بند کر دی۔ مانی نے ڈبا میز پہ ہی دھرا جو چاچا کی ریسپشن تھی اور خود اسے کھولنے لگا۔

"یہ چند کھلونے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ان کی قیمت لگا دو۔"

ڈبو چاچا نے ڈبے کے اندر جھانکا، اس کی بات سنی اور حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر ایک ہنسی کا فوارہ بلند ہوا اور موٹے پیٹ کے ساتھ وہ تھل تھل ہنسنے لگا۔

"کھلونے۔۔۔۔۔ تمہارا مطلب کہ یہ ٹوٹے ہوئے کھلونے......"

وہ بار بار کھلونوں کا نام لے کر پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا جو مانی کو برا لگ رہا تھا...... بہت ہی برا...... اتنا کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک سوئی اس کے پیٹ میں مار کر اس کے غبارے جیسے پیٹ سے ہوا نکال دے۔

"یہاں اس دکان پہ کیا چیز ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔ جب چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں تو ہی ڈبو چاچا کی دکان پہ لائی جاتی ہیں۔ اس آبادی میں کوئی ٹھیک چیز یہاں کیوں لائے گا بھلا جہاں لوگ بہ مشکل چیزیں جوڑ پاتے ہیں۔" وہ غصے سے تیز تیز بولتے دکان میں پڑی ہر چیز پہ نظریں دوڑانے لگا۔

"لیکن وہ قابل استعمال ہوتی ہیں۔" ڈبو چاچا کو شاید ایک بچے سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ ذرا ہکلایا۔

"تو یہ کھلونے بھی بچوں کے لیے اتنے ہی قابل استعمال ہیں جتنے بڑوں کے لیے یہ بنا گدے کی کرسی، یہ دو پروں والا پنکھا، یہ زنگ آلود پیٹی، یہ لولی لنگڑی الماری، یہ بنا شیشے کے سنگھار میز۔" ڈبو چاچا نے تیکھے چتوں لڑکے کو دیکھا جو بڑا زبان دراز تھا۔

"اس کی کیا گارنٹی ہے کہ کوئی بچہ اسے خریدے گا......؟"

"بچے بڑوں سے زیادہ قدر دان ہوتے ہیں۔"

ڈبو چاچا نے حیرت سے اس پستہ قد لڑکے کو دیکھا جو جتنا زمین سے باہر تھا اتنا ہی اندر تھا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں ان ٹوٹے کھلونوں کے تمہیں دس روپے دے دیتا ہوں۔" مانی کو کرنٹ لگا۔

"دس روپے۔" وہ چلا اٹھا۔ "بس س س س س س س س۔" اس نے "بس" کو خاصا لمبا کھینچا۔

"تو کیا اب دس ہزار دوں......؟"

مانی نے غصے سے ڈبا بند کیا۔

"اس سے بہتر قیمت میں تو ردی چھان بورے والے خرید لے گا۔"

[illegible] گاؤں کے لوگ [illegible] رہا تھا کہ ان سے [illegible] اور مرغی کے کھلونے خرید سکے۔ اب جب اتنے پیسے بھی نہیں مل رہے تھے تو اس نے اونٹ بوتلے [illegible] کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابا جی دکان سے نکل رہا تھا۔ [illegible] کا ہاتھ سے جاتے دیکھ کر ڈبو چاچا پکارا۔

'' اے لڑکے۔ پندرہ روپے۔'' اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔

مانی نے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ ہوا میں بلند کر کے نفی کا اشارہ کیا اور ابا کے پیچھے لپکنے لگا۔

'' چلو ٹھیک ہے دس روپے لے لو۔'' اس بار مانی نے ہاتھ ہلانا بھی ضروری نہیں سمجھا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

'' بڑا ہوشیار لڑکا ہے۔ ضرور کوئی بڑا کام کرے گا۔'' اور ڈبو چاچا کی اس بات پہ قدرت بھی مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

شام کو وہ اپنے سارے کھلونے اسی ڈبے میں رکھ کے ایک کونے میں ٹھکانے لگا رہا تھا تو ابا جی اپنے ساتھ ایک نحیف و نزار لڑکی کو لگا کر آتے دکھائی دیے جو ان کی قمیص کا دامن پکڑے ایسے چلی آ رہی تھی جیسے شیر کی کچھار میں داخل ہو رہی ہو۔ ابا جی دو دن پہلے ہی دینو چاچا کی وفات پہ سرگودھا گئے تھے۔ دینو چاچا ابا جی کے ماموں کے پتر تھے۔ بیوی اس کی تیسرے بچے کو پیدا کر کے فوت ہو گئی تھی۔ یہ کوئی تین سال پرانی بات تھی اور اب دینو چاچا بھی ٹرک تلے آ کر اتنا زخمی ہوئے کہ دو دن ہسپتال میں زندگی موت کی کشمکش سے لڑتے رہے لیکن لڑتے لڑتے بالآخر ہار ہی گئے۔ ابا جی انہی کی وفات کا سن کر دو دن پہلے سرگودھا گئے تھے اور اب نجانے واپسی پہ کسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

'' تو کیا کرتا.... ؟ اکبر کو اس کا تایا ساتھ لے گیا اور گڈو کو اس کی ماسی... اس وچاری (بیچاری) [illegible] کو تیار نہیں تھا۔''

ابا جی اماں کو وضاحتیں دے رہے تھے۔ [illegible] جی کے پیچھے چھپی ہوئی کھڑی تھی۔ چنی [illegible] نظروں سے [illegible] بھی کہ اس سے وہ چھوٹی تھی اور چنی کو اپنے سے چھوٹے بہت پسند تھے۔ مانی اس کا طائرانہ جائزہ لے رہا تھا۔ اماں البتہ شیرنی کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں کہ بچی کی [illegible] لگنے والی تھیں وہ اس ہرن کے بچے کو۔

'' تو تو ہی رہ گیا تھا اسے ساتھ لانے کے لیے مانی کے ابا۔ رکھ لیتا کوئی بھی [illegible] بلا سے۔''

مانی کی عقل میں بات آ گئی تھی کہ وہ چاچا دینو کی بیٹی تھی۔ اب ماں باپ گزر چکے تھے تو اس کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ابا جی جو ازل کے رحم دل تھے اسے ساتھ لے آئے تھے اور اماں جی کا بس ایک ہی مسئلہ تھا کہ گھر کا خرچا کیسے پورا ہو گا ورنہ وہ دل کی بری نہیں تھیں۔ شاید کہ ان کے حالات اچھے ہوتے تو وہ ابا جی کے اس عمل کو سراہتیں لیکن وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھیں کہ ابا جی ایک چھوٹے درجے کی فیکٹری میں مزدور ہی تو تھے۔ وہاں وہ سامان اٹھانے کا کام کیا کرتے تھے۔ ایسے میں اپنے دو بچے ہی پالنا ان کے لیے مشکل ہو چلا تھا تو اس بچی کی ذمہ داری کیسے اٹھاتے...؟

'' یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھنے والے کو خدا بوت (بہت) دیتا ہے۔'' ابا جی نے بچی کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ پھیرا تو اس کی ہرن جیسی آنکھیں بھر آئیں۔

'' قارون کا خزانہ ہی نام نہ کر دے خدا کہیں خوش ہو کر۔'' اماں منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں کہ ابا جی کو وہ زیادہ باتیں نہیں سنا سکتی تھیں۔ ان کی بڑبڑاہٹ مانی ہی سن سکا اور دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

'' چنی ادھر آ پتری۔ یہ دیکھ تیری بہن آئی ہے۔''

وہ بیٹی کو اشارہ کر کے بلانے لگے جو جھٹ سے چلی۔ چنی کے پاس آنے پہ ابا جی نے اس کا ہاتھ بچی کے ہاتھ میں تھما دیا جس کا نام وہ نہیں جانتی تھی۔

'' اس کا نام ننی ہے۔'' ابا جی نے چنی سے اس کا تعارف کروایا تو مانی بھی اس کے پاس چلا گیا۔ چنی تو اس کا ہاتھ تھامے ایسے مسکرا رہی تھی جیسے وہ گڑیا ہو اور چنی اسے کھلانے چلی ہو۔

'' اب اس کا ہاتھ چھوڑ دو چنی۔'' مانی نے ٹھوکا دیا تو چنی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا جو مسکین سی صورت بنائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

'' کل سے یہ چنی کے اسکول جائے گی۔'' چنی خوش ہو گئی۔ اماں کا پھر سے منہ بن گیا حالانکہ چنی جس سرکاری اسکول جاتی تھی وہاں اس کی فیس معاف تھی اب ننی کی بھی معاف ہو جاتی۔

ابا جی فیکٹری جاتے اسے سائیکل پہ آگے بٹھا لیتے اور چھوڑ دیتے۔ واپسی پہ وہ ماسی کوبراں کی پوتی کے ساتھ پیدل ہی آ جاتی۔ سوائے اسکول کا یونیفارم اور کتابوں کاپیوں کے اس کا کوئی خرچا نہیں تھا۔

مانی بھی پہلے اسی اسکول میں پڑھتا تھا پھر ایک دن وہ ابا جی کے ساتھ فیکٹری گیا تھا جہاں اس نے فیکٹری کے گودام کے میز پہ پڑے کسی حساب کتاب کے رجسٹر میں کوئی غلطی تلاش کی تھی۔ اور اس کی اسی ذہانت کو دیکھ کر فیکٹری کے مالک نے، جس کی بہن کا اپنا اسکول تھا، مانی کا بہن کے اسکول میں داخلہ کروا دیا تھا۔ فیس اس کی انہی کے کہنے پہ معاف بھی ہو گئی تھی۔ آنے جانے کے لیے ابا جی نے رکشا لگوا دیا تھا۔ یہ سب اماں کی منشا پہ ہوا تھا کہ ایک ہی تو ان کا پتر تھا — ذہین اور سب سے سیانا...... تو وہ کیوں نا اچھے اسکول میں پڑھتا۔ اماں کا خواب تھا اسے بڑا افسر بنانے کا۔ اب جب کہیں سے کوئی امید دکھائی دے رہی تھی تو وہ اس امید کو کیوں جانے دیتیں۔

شروع میں ننی بہت ڈری سہمی رہتی تھی۔ اسکول میں چنی اس کا خیال رکھتی۔ آدھی چھٹی کے وقت اس کی جماعت میں جا کر اس کی خبر لیتی۔ ایک آدھ بار کسی جماعت کے بچے نے اسے تنگ کیا تو چنی نے اس کی خوب ہی خبر لی۔ پھر سب کو پتا چل گیا کہ ننی کی بڑی بہن بڑی ہوشیار ہے جو آتے جاتے دو لگا بھی دیتی ہے تو سب ننی کو تنگ کرنے سے باز آ گئے۔ ننی کو چنی کی وجہ سے کافی حوصلہ ہوا۔ جو خوف اتنے بڑے سرکاری اسکول میں آنے سے اس پہ طاری رہتا تھا وہ جاتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ اس بڑے سرکاری اسکول سے مانوس ہو گئی۔

گھر میں وہ اماں کے ڈر سے خاموش رہتی۔ اماں اسے مانی اور چنی کی نسبت کم کھانے کو دیتی تھیں۔ لیکن جتنا کھانے کو دیتیں وہ اتنا ہی کھا لیتی۔ خود سے کبھی نہیں مانگتی تھی۔ مانی یہ بات نوٹ کرتا۔ اماں سے نظر بچا کر اس کی پلیٹ میں اضافی چیز ڈال دیتا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتی تو مانی اشارہ کرتا کہ وہ کھا لے۔ وہ چپ چاپ کھا لیتی۔ اس نے کبھی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھار تو مانی کو لگتا کہ وہ کوئی کٹھ پتلی ہے کہ جو اسے جس طرف لگاتا ہے، جیسا کرنے کو کہتا ہے وہ ویسے ہی کرنے لگ جاتی ہے۔ اس کے اپنے کوئی احساسات یا جذبات نہیں ہیں۔ رات میں وہ چنی کے ساتھ ہی سوتی تھی۔

شروع کے دنوں میں وہ اکثر ہی چھپ چھپ کر رویا کرتی تھی جس پہ چنی اور مانی کو اس پہ بڑا ترس آتا۔ پھر اسے صبر آ گیا تو رونا بھی جاتا رہا لیکن اس کی خاموشی اور اداسی ویسی ہی رہیں۔ اماں کو خوش کرنے کے لیے وہ ان کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی۔ لیکن اماں پھر بھی اس سے خوش نہیں ہوتی تھیں کہ وہ ایک اضافی بوجھ بنی ان کے بچوں کا حق کھا رہی ہے۔ اماں کے کوسنے اور طعنے وہ چپ چاپ سن کر بھی ان کا ہاتھ بٹاتی رہتی۔ کبھی تو وہ اپنی عمر سے بھی بڑے کام کر دیا کرتی لیکن اماں نے نہ خوش ہونا تھا نہ ہوئیں۔ ان کے سینے میں وہ ایک پھانس بن کر چبھ گئی تھی جو ہر دم انہیں ٹیس دیتی تھی۔

'' اتنی تھڑدل (تھوڑے دل کی) نہ بن صفیہ۔ کیا خبر اسی کی وجہ سے ہمارے بچوں کو رزق مل رہا ہو۔''

ابا جی دوسری سوچ کے مالک تھے اور اماں

روایتی سوچ تھی۔ وہ اباجی کی کسی ایسی بات کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ نہ ہی کوئی بات سمجھنے کو تیار تھیں۔ ابا جی بھی شریف شوہروں کی طرح ان سے بحث سے بچتے تھے لیکن سمجھانا اپنا فرض ضرور سمجھتے تھے۔

مانی، چنی اور نینی ...... تینوں بچوں کے تین سروں جیسے تھے ...... ایک دوسرے تک جاتے، ایک دوسرے سے بندھے۔ مانی جو اپنے محلے کے بچوں کا سردار تھا ہر کھیل میں نینی کو بھی شامل کرنے لگا۔ نینی کو یہ کھیل نہیں کھیلنے آتے تھے لیکن مانی اسے سب کھیل سکھا رہا تھا۔ چنی کی نسبت وہ جلدی سیکھ جایا کرتی تھی۔ پڑھائی میں وہ بہت اچھی نہیں تھی لیکن چنی جیسی نکمی بھی نہیں تھی۔ چنی کا زیادہ تر دھیان کھیل کود پہ لگا رہتا تھا۔ اسی لیے کھلونے پہ اس کی جان جاتی تھی۔ دیگر بچے نینی سے تنگ بھی پڑ جاتے کہ وہ کوئی کھیل کھیلنا نہیں جانتی لیکن مانی کی بدولت اسے رعایت مل جاتی۔ وہ مانی کے کہنے پہ اسے کھیل میں شامل ہونے کا موقع دے دیتے۔

"تمہیں کچھ بھی کھیلنا نہیں آتا ......؟" چنی اس کی کھیلوں میں ایسی ناقص کارکردگی پہ منہ بناتی تو نینی سر نفی میں ہلا دیتی۔

"ہمارا گھر چھوٹا سا تھا۔ اس میں کھیلنے کی زیادہ جگہ نہیں تھی اور امی کے بعد ابو نے کبھی ہمیں گلی میں نکلنے کی اجازت نہیں دی۔" وہ اداسی سے اپنا ماضی دہراتی۔ اسے جب بھی ماضی میں جھانکنے کا موقع ملتا وہ بڑا طویل قیام کرتی کہ اسے وہاں سے گھسیٹ کر نکالنا پڑتا۔

"لیکن میرے پاس کھلونے بہت تھے۔ ابو ہمیں اکثر بازار سے اچھے کھلونے دلا دیتے تھے جو سیل سے چلتے تھے۔" وہ اشتیاق سے بتانے لگی تو چنی اپنی جگہ ہی جھٹکا کھا کر سیدھی ہوئی۔ کھلونے اس کی سب سے بڑی کمزوری تھے۔

"تو وہ سارے کھلونے اب کہاں گئے...؟" نینی اس سوال پہ مزید اداس ہو گئی۔ اسے اپنا گھر، بہن بھائی، ماں باپ اور کھلونے سب یاد آنے لگے۔

"ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے۔ جیسے میرے بھائی ادھر ادھر ہو گئے۔"

مانی کو اس وقت نینی پہ بہت ترس آیا تھا۔ پانچ سالہ وہ بچی ماں اور باپ دونوں سے محروم ہو کر در در کے دھکے کھانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"لیکن اب یہاں سے تم کہیں ادھر ادھر نہیں ہو گی۔ اب ہم ہی تمہارا سب کچھ ہیں۔" مانی نے جس ٹھوس لہجے میں یہ بات کہی تھی نینی کو یقین ہو گیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب یہی اس کا مستقل گھر ہے اور اسے ساری عمر یہیں گزارنا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ وہ مانی اور چنی کے ساتھ کھیل کھیل کر ان کھیلوں میں بھی ماہر ہو گئی جو اسے نہیں آتے تھے۔ وہ جلدی سیکھنے والوں میں سے تھی۔ گلی ڈنڈا، پٹھو گرم، ٹھنڈی سڑک، پکڑن پکڑائی، چھپن چھپائی، چینجو، کنچے ...... سب کھیلوں کی وہ ماہر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"دکھاؤ یہ کیا بنا رہی ہو...؟"

گھر کے باہر کچی زمین تھی جس میں سایہ دار کئی درخت لگے ہوئے تھے۔ ان ہی درختوں کے نیچے ایک پتھر پہ بیٹھی نینی ایک دن سلیٹ پہ کچھ بنا رہی تھی جب مانی اس کے پیچھے جا پہنچا۔ مانی کو سر پہ کھڑا دیکھ کر وہ ڈر گئی اور سلیٹ چھپا لی۔

"دکھاؤ بھی۔ کچھ نہیں کہوں گا۔"

اس نے سلیٹ اس کی طرف یوں بڑھائی جیسے کوئی چوری کی ہوئی چیز بڑھائی ہو۔ مانی کے ہاتھ میں موجود سلیٹ پہ بہت خوب صورت منظر بنا ہوا تھا۔ مانی کو یقین نہیں آیا کہ یہ اس نے بنایا ہے وہ بھی ایک سفید رنگ کی سلیٹی سے۔

"تم اتنی خوب صورت پینٹنگ کرتی ہو۔" نینی اس تعریف پہ جھینپ گئی۔ اس سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ مانی پہلا تھا جو یوں اس کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے اپنی ایک کاپی سے کاغذ پھاڑ کر لے آیا۔

"... منظر بناؤ۔" نینی اس کے کہے پہ عمل کرنے لگی تب تک وہ اندر سے اپنے ... بھی نکال لایا تاکہ وہ اس میں رنگ بھی ... جب اس کی پینٹنگ تیار ہوئی تو مانی حیران ... نہیں ہے بھی پانچ سالہ بچی کی پینٹنگ نہیں ... کے برس چنی تو ڈھنگ سے ایک سیدھی ... بھی نہیں کھینچ سکتی تھی۔

"تم تو بورن آرٹسٹ (پیدائشی فنکار) ہو۔" نینی کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کی بنائی تصویر سے خوش بھی ہے اور متاثر بھی۔

پھر اکثر ہی مانی اس سے تصاویر بنوانے لگا۔ رنگ والے اماں سے چھپ کر دے دیتا تھا کہ یہ صرف اسکول کے استعمال کے لیے اباجی نے اسے دلائے تھے۔ گھر میں انہیں استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور وہ بھی اگر اماں کو پتا چل جاتا کہ نینی انہیں استعمال کر رہی ہے تو وہ مانی کا سر کھول دیتیں اور نینی کے ہاتھ توڑ دیتیں۔

"ابا جی! اگر نینی کو میرے اسکول میں داخل کروا دیں تو وہ بھی بہت اچھا پڑھ سکتی ہے۔ وہ بہت جلدی ہر بات سیکھ لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی اچھے اسکول میں جانے سے وہ بھی میری طرح افسر بن جائے۔"

اباجی مانی کی بات سن کر خاموش رہے۔ اس کے اسکول میں نینی کو داخل کروانے کی ان کی استطاعت نہیں تھی۔ وہ اتنا بھی کر رہے تھے کہ ایک یتیم بچی کو "ہوم منسٹر" کی مخالفت مول کر پال رہے تھے تو ان کے لیے بہت تھا۔

مانی ان کی خاموشی پہ مزید کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اسے اب خاموش رہ کر باپ کی خاموشی کا بھرم رکھنا تھا۔

جو تھوڑی بہت رقم وہ میلے میں جانے کے لیے بچا لیتے تھے اس سال وہ بھی نینی کی کتابوں کاپیوں، وردی اور جوتوں پہ لگ گئی۔ سو اس سال لگنے والے میلے میں جانے سے اباجی نے انکار کر دیا۔ بچے اس انکار پہ بہت اداس تھے۔ اسی لیے مانی کی دن رات سوچ اسی نہج پہ بھٹکتی رہتی کہ کیسے وہ تھوڑے سے پیسے جمع کر لے اور چند کھلونے ان تینوں کے لیے خرید لائے۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ نینی جو تصاویر بناتی ہے وہ کوئی ہم سے خرید لے......؟"

چنی کا دماغ ایسی باتوں پہ اکثر چل پڑتا تھا جو دو جمع دو سے متعلق ہوتیں۔ مانی کو اس کا یہ خیال بے حد پسند آیا۔ کبھی کبھی وہ ثبوت دے بھی دیتی تھی کہ وہ مانی کی بہن ہے اور کسی کام میں اس کا دماغ بھی چلتا ہے۔

اس نے اسی شام کافی سارے صفحات نینی کو تھمائے اور اپنے رنگوں والی ڈبیا بھی تاکہ وہ سکون سے بیٹھ کر ڈھیروں ڈرائنگ بنا سکے۔

"لیکن ہم انہیں بیچیں گے کہاں...؟" چنی کو اگلی فکر ستا رہی تھی جو پتھر پہ بیٹھی نینی کے ہاتھوں کو تیزی سے چلتے دیکھ رہی تھی۔ نینی "کیوں، کیسے، کس طرح" جیسی ہر فکر سے آزاد تھی۔ اسے بس کام کرنا اور حکم ماننا آتا تھا۔ مانی نے کہا تھا کہ پورا زور لگا کر بہترین تصاویر بنا کر دو تو وہ اپنا پورا زور لگا رہی تھی...... زور بھی اور ذہانت بھی۔

"آبادی سے باہر جو بڑی سڑک شہر کی طرف جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف درختوں کے جھنڈ ہیں۔ وہاں بیٹھ کر ہم ان تصاویروں کو بیچ سکتے ہیں۔ اس سڑک سے ہر طرح کے لوگ گزرتے ہیں۔ امید ہے کہ ہماری کچھ تصاویر بک جائیں گی۔" چنی اس بات پہ مطمئن اور خوش ہو گئی۔

ہفتہ لگا کر نینی نے بارہ پندرہ تصاویر بنائی تھیں۔ مانی نے انھیں گتوں پہ چپکا دیا تاکہ وہ ایک پینٹنگ کی شکل اختیار کر لیں۔ پھر بہت دھیان سے چھٹی والے دن تینوں انھیں لے کر بڑی سڑک تک گئے تھے۔ بڑی سڑک کے کنارے کچھ بڑے پتھر جوڑ کر وہ تینوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے۔ نینی نے

ان تصاویر کو دھیان سے تین قطاروں میں تقسیم کر کے اوپر نیچے سجا دیا۔ چنی نے آواز لگائی۔
"پینٹنگ خرید لو بھائی۔ ایک روپے میں پینٹنگ خرید لو۔"
پھر اس نے مانی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"ایک روپیہ کم قیمت نہیں ہے ــــــ؟"
"کوئی مشہور فنکار نہیں ہے یہ ابھی کہ لوگ ہاتھوں ہاتھ منہ مانگی قیمت پہ اس کی تصویریں خرید لیں گے۔" مانی نے بہن کی عقل پہ ماتم کیا تو وہ دوبارہ سے آوازیں لگانے لگی۔
کوئی رک کر دیکھتا کہ وہ کیا بیچ رہے ہیں تو دیکھ کر ہنس دیتا۔ ایسے میں مانی کا دل چاہتا اس کی بتیسی نکال دے۔ کبھی کوئی رک کر دیکھتا اور محض ان کا کام سراہ کر چلا جاتا۔ چنی ایسے کسی کو دعاؤں گالیوں سے نوازتی جو ان ننھے منے بزنس مین اور وومن کا وقت برباد کرنے اور چسکے لینے آتے تھے۔ کوئی رکتا، سراہتا اور حوصلہ افزائی کر کے چلتا بنتا تو ان تینوں کی ابھرتی امیدیں دم توڑ دیتیں اور مانی کا دل کرتا کہ اس شخص کا "تھوبڑا" توڑ دے۔ بس وہ ایک ہی تھا جو رکا تھا، اپنی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ان تک آیا تھا۔ تصاویر کو بغور دیکھا اور ان میں سے دو اٹھا کر ان کے کام کو سراہتے ہوئے جیب سے دو روپے نکال کر مانی کی ہتھیلی پہ رکھے۔ مانی کھل اٹھا تھا اور چنی کی تو ہنسی ہی اندر نہیں ہو رہی تھی۔ ننی معصومیت سے بس ان دونوں کا ساتھ دے رہی تھی ـــ نہ ہوں نہ ہاں ـ یہ اس دن کی پہلی کمائی تھی جس نے انہیں امید تھمائی تھی۔
"دیکھو، پہلے ہی دن ہم نے کچھ دیر میں دو روپے کما لیے۔" اپنا آپ اسے اب کاروباری سا دکھائی دے رہا تھا۔ "تم بہت اوپر جاؤ گی۔" اس نے ننی کا شانہ تھپکا۔
"کہیں زیادہ اوپر مت چلی جانا۔" چنی کھی کھی ہنسنے لگی۔
گھر جا کر مانی نے وہ رقم اپنے اس گلے میں ڈال دی جو نجانے کب کا اس نے خرید رکھا تھا اور وہ اب تک خالی ہی پڑا تھا۔ جیب خرچ کے طور پہ اسے کچھ ملتا تو وہ بچت کے طور پہ اس میں کچھ ڈال پاتا۔
اگلے دن بھی چھٹی کی بدولت وہ تینوں اسی طرح سڑک کنارے موجود تھے لیکن اس روز ان کی ایک بھی تصویر نہیں بکی تھی۔ چنی کا منہ بن گیا تھا۔ وہ جلد مایوس ہو جانے والوں میں سے تھی۔
"ہر روز تو کوئی نہیں خریدتا نا۔ کاروبار تو ایسے ہی چلتا ہے کہ کبھی کمائی ہوتی ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتی۔" دو دن میں ہی وہ آٹھ سالہ لڑکا خود کو کاروباری سمجھنے لگا تھا۔
پورا ہفتہ وہ اسکول جاتے اور اس دوران ننی شام میں پڑھائی بھی کرتی، اماں کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے چھوٹے موٹے گھر کے کام بھی اور ساتھ میں ڈرائنگ بھی ـــــ پھر ہفتے اور اتوار کو وہ تینوں اپنے کھیل کی قربانی دے کر بڑی سڑک کنارے جا کر ان تصاویر کو بیچا کرتے۔ کبھی کسی دن ایک آدھ بک جاتی، کسی دن وہ بھی نہ بکتی۔
"یہ ایسی تصاویر کون خریدے گا۔ ایک روپیہ بھی ان کے لیے بہت ہے۔" ایک اوباش نوجوان نے پھبتی کسی تو مانی کا دل کیا کہ پاس پڑا پتھر اس کے سر پہ بجا دے۔ یکدم اسے اپنا کاروبار ٹھپ ہوتا دکھائی دیتا۔
"اتنی اچھی تصویروں کی ایک روپیہ قیمت بہت کم ہے پیارے بچو۔ جلد تم دیکھو گے کہ یہ دس روپے میں بک رہی ہوں گی۔"
کوئی ایسا بھی گزرتا جو اتنی حوصلہ افزائی کر جاتا کہ چنی جھٹ سے خود کو کسی بڑی آرٹ گیلری کی مالکن محسوس کرتی۔ بس ان میں ننی ہی ہر احساس سے عاری بنی ہوتی تھی جو پتھر پہ بیٹھ کر ساتھ ساتھ مہارت سے ہاتھ چلاتے ہوئے ڈرائنگ کرتی جاتی تھی۔ اس نے کبھی کسی تعریف یا تنقید پہ کان نہیں دھرے تھے۔ اس کا کام اپنے کام سے کام رکھنا ہی تھا
میں کوئی ایسا بھی ہوتا جو خریدتا ـــ جب ان بچوں کا جذبہ دیکھ کر مدد ضرور ... منع کر دیتا۔
... تصویر خریدنی ہیں تو ... ہم بھکاری نہیں ہیں۔
... پیسے مت دیں۔
... اس بچے کی خودداری پہ خود بخود ... ہو جاتا اور کبھی آدھی تو کبھی ساری ... خرید لیتا۔
آہستہ آہستہ ان کا چھوٹا سا مٹی کا گلا بھرتا چلا ... کھلونے خریدنے کے خواب پل پل کر جوان ہونے لگے۔
☆☆☆
ایک دن اسی طرح جب ان تینوں نے بڑی سڑک پہ جانا تھا تو اماں نے بڑی خالہ کے گھر جانے کا ... خالہ چند میل کی مسافت پہ ہی رہتی تھیں ... کبھی کبھی جاتی تھیں۔ ابا جی کی فیکٹری ... تھی، وہی انہیں چھوڑ آتے۔ سو بچا تھا آٹھ سالہ مانی، جس کا ... اسہارا تھا کہ وہ اتنا تو سمجھ دار تھا کہ اماں کو خالہ کے گھر چھوڑنے لینے کا کام کر سکتا۔ جب تک اماں تیاری پکڑتیں تب تک وہ بڑی سڑک کے کنارے چنی اور ننی کو بٹھا آیا تھا تاکہ وہ وقت ضائع کیے بنا کام شروع کریں۔
"دھیان رکھنا چیزوں کا ـــــ چنی طریقے سے پیش آنا گاہک کے ساتھ۔ کسی سے بحث مت کرنا۔ تصویریں دھیان سے دکھانا اور واپس لینا۔ پیسے گن کر رکھنا ـــ میں یوں گیا اور یوں آیا۔" وہ ایسے ہدایات دے رہا تھا کہ چند گھنٹوں میں وہاں گاہکوں کی قطار لگنے والی تھی۔ چنی بھائی کا یوں اس پہ اعتماد ظاہر کرنے پہ یکدم خود کو بڑی ذمہ دار محسوس کرنے لگی۔ ننی بھی جھٹ سے عادی ہو گئی جو یوں بھی نہ تین میں ہوتی نہ تیرہ میں۔
"ایک روپے کی تصویریں لے لو ـــــ پیاری پیاری تصویریں لے لو۔" چیختی ہوئی آواز میں وہ وقفے وقفے سے چلا رہی تھی۔
"واہ! بڑی اچھی تصویریں ہیں۔" وہ ایک پیدل شخص تھا جو ان کے قریب سے گزر کر گیا، ٹھہرا اور واپس پلٹا تھا۔ ایک سرسری نگاہ ساری تصویروں پہ ڈالی اور ان دونوں کو بغور دیکھا۔
"کیا میں یہ ساری خرید سکتا ہوں ــــ؟" چنی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دن کے آغاز پہ ہی ایسا گاہک مل جانا جو سب تصویریں خرید لے بڑی بات تھی۔
"کیوں نہیں ــ" تھی تو وہ بچی ہی جس سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔
وہ باری باری سب تصویروں کو دیکھ کر پوچھنے لگا ـ
"تو کل ملا کر ان تصویروں کے کتنے بنے ــــ؟" چنی نے جلدی سے انگلیوں پہ حساب لگایا۔
"بیس روپے۔" وہ خوشی سے پھٹنے کو تھی۔ اس نے سر ہلایا اور جیب سے اپنا بٹوہ نکال کر دیکھنے لگا۔
"میرے پاس سو کا نوٹ ہے۔ کھلے پیسے ہوں گے کیا ـــ؟" چنی یکدم گھبرا گئی۔ کھلے پیسے اتنے تو اس کے پاس کیا ہونے تھے۔ مانی تھوڑے سے بھی رکھ کے اسے دینا بھول گیا تھا۔ چنی نے بے چینی سے سر نفی میں ہلایا۔ اب ننی بھی اپنا ہاتھ روک کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی ـــــ بنتا کام بگڑ رہا تھا۔
"اوہو۔ پھر تو میں یہ سب نہیں خرید سکتا۔" آس پاس میں کوئی دکان بھی نہیں تھی کہ چنی بھاگ کر وہاں سے کھلے پیسے پکڑ لاتی۔ وہ رو دینے کو تھی۔
"آپ کہیں سے نوٹ کھلا کروا لیں۔ پھر لے جایئے گا۔" سامنے کھڑے شخص نے کچھ سوچا اور پھر منہ کے ٹیڑھے میڑھے زاویے بنائے۔
"ایسا ہو سکتا ہے کہ چھوٹی لڑکی کہ تم میرے ساتھ چلو اور میں کسی دکان سے پیسے کھلے کروا کر تمہیں دے دوں۔ اب میں پہلے جاؤں پھر واپس آؤں ایسے تو میں لیٹ ہو جاؤں گا اور وہاں نہیں پہنچ سکوں گا جہاں مجھے جانا ہے۔" گاہک خاصا مہربان دکھائی دیتا تھا اسی لیے چنی اس کی پیشکش پہ

جانے دیتا تھا جو تمام تصاویر خریدنے پہ آمادہ تھا۔ ایسا گاہک کبھی کبھی ہی ملتا تھا اور وہ خوش قسمتی کا دن تھا۔ مانی کو پتا لگتا تو وہ اسے کتنی باتیں سناتا کہ وہ کیسی بری دکان دار ہے جس نے اچھا بھلا گاہک ہاتھ سے جانے دیا۔

"ٹھیک ہے میں ساتھ چلتی ہوں۔" وہ تمام تصاویر ایک لفافے میں ڈال کر ساتھ رکھ چکی تھی۔ یہ اسے تب تھمانا تھیں جب وہ اسے رقم تھماتا۔ اس نے نِنّی کو دیکھا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

نِنّی نے سرنفی میں ہلایا۔

"تمھیں نہیں جانا چاہیے چنی۔" اسے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اسی لیے دبی آواز میں وہ اسے روک رہی تھی۔

"تم خود ہی سوچو کہ صبح ہی صبح ایک ایسا گاہک مل رہا ہے جو ہماری تمام تصویریں خرید رہا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہوگا کہ میں کہوں کہ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔۔۔؟ یکدم تمام تصویریں بک جائیں گی اور بھائی کتنا خوش ہوگا۔ ہفتوں کا کام دن کے ایک حصے میں ہونے جارہا ہے اور میں اسے نہ ہونے دوں کیا......؟ کیا تم نہیں چاہتیں کہ اس بار ہم میلے سے اچھے کھلونے لے سکیں......؟"

چنی کی آنکھوں کے خواب اسے ہمیشہ ہی بے چین رکھتے تھے۔ نِنّی کو پھر بھی یہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے چنی کا ہاتھ تھام کر روکا۔ چنی نے آہستگی سے نِنّی سے ہاتھ چھڑاتے اسے تھپکا۔ یہ اس کی تسلی تھی کہ وہ جو کر رہی ہے ٹھیک کر رہی ہے۔ نِنّی کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو تھے۔ اس کا چنی پہ بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ اس آدمی کے ساتھ جاتی ہوئی چنی کو دیکھ رہی تھی...... دیکھتی رہی، دیکھتی رہی حتیٰ کہ وہ خاصی دور ہوتی گئی اور پھر وہ ایک نقطے کی مانند اسے دکھائی دینے لگی۔

تبھی مانی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

"چنی کہاں ہے......؟" نِنّی نے ابھی نظریں اس نقطے سے ہٹائی نہیں تھیں کہ اگر نظر ہٹ جائیں تو نقطے کی مانند چنی اس سے کہیں ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ اسی طرف دیکھتے اس نے ہاتھ سے اسی سمت اشارہ کیا۔ مانی نے ناسمجھی سے وہاں دیکھا جہاں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

"وہ اس شخص کے ساتھ چلی گئی۔ اسے واپس لے آؤ ورنہ وہ واپس نہیں آئے گی۔"

مانی بے یقینی سے نِنّی کو دیکھتا رہا اور پھر کسی بھی سوال کے بنا اس نے اسی جانب دوڑ لگا دی جہاں نِنّی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ اپنی پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے فاصلہ کم ہوا تو اسے چنی ایک شخص کے ساتھ جاتی دکھائی دی جو خاصا محتاط اور تیز قدموں سے چل رہا تھا۔

"چنی...... رک چنی......"

وہ پورے حلق سے چلایا تو چنی نے مڑ کر دیکھا اور اس شخص نے بھی۔ مانی بھاگتا ہوا، ہوا میں بازو لہراتا ہوا دوڑا چلا آرہا تھا۔ چنی کے ساتھ چلتا وہ شخص اسی وقت چنی کو چھوڑ کر سرپٹ دوڑنے لگا۔ چنی حیران سی پہلے بھائی کو بھاگتا دیکھ کر اب اس گاہک کو بھاگتا دیکھ رہی تھی۔

"ارے یہ تصویریں......" وہ حیران تھی کہ کیا پل بھر میں کیا ہوا......؟

تب تک مانی اس تک پہنچ چکا تھا۔

"رک بے غیرت کی اولاد......" چنی تک پہنچ کر اس کے قدم تھمے اور منہ میں نجانے کیا کیا بکتے اس نے زمین پہ تھوک دیا تھا۔ پھر چنی پہ ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے اس نے خود پہ قابو پالیا کہ وہ پہلے ہی ساکت سی سب دیکھ رہی تھی۔

"تیرا دماغ خراب ہے چنی...... کیسے کسی انجان شخص کے ساتھ چل پڑی۔ کہا تھا نا کہ دھیان سے رہنا۔ یہ دھیان ہے تیرا کہ نِنّی کو وہاں اکیلا چھوڑ کر اس کے ساتھ منہ اٹھائے جارہی ہے۔ تیرے کو جو بھی کوئی کہے گا تو چل پڑے گی۔۔۔"

وہ غصے سے چلا رہا تھا۔ چنی روہانسی ہوگئی۔ اس کی بات درست تھی۔ اسے نِنّی کی بات مان لینا چاہیے تھا۔ اسے اس گاہک کے ساتھ نہیں چلنا چاہیے تھا۔

"وہ ساری تصویریں خرید رہا تھا تو میں اسی لیے......"

"وہ کوئی تصویریں نہیں خرید رہا تھا۔ وہ تجھے اپنے ساتھ بہلا پھسلا کر لے جا رہا تھا احمق۔ ابھی میں وقت سے نہ پہنچا ہوتا تو گئی تھی تو۔" اس کی عقل پہ ماتم کرنے کو دل کر رہا تھا۔

"مجھے لگا وہ سب تصویریں خرید لے گا تو ہم زیادہ پیسے جمع کر کے اچھے کھلونے لے سکیں گے۔ وہ جو بابا سے نہیں بیل سے چلتے ہیں۔" وہ پھپھک کر پھپھک رو دی۔

مانی اسے تاسف سے دیکھتا رہا اور پھر اسے خود سے لگا لیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کھلونوں کی کتنی دیوانی تھی۔ شوق اسے بھی بہت تھا لیکن اس جیسا جنون نہیں تھا۔

"تم چھوٹی سائیکل خرید سکو گے...... میں سیلوں والی گڑیا اور اس کا گھر اور نِنّی میک اپ کا سامان......"

ان کھلونوں کے پیچھے آج وہ اپنی بہن کو کھو دینے والا تھا۔ غلطی تو اس سے بھی ہوئی تھی جو اتنی چھوٹی بچیوں کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ ان سے بڑا تھا، سمجھ دار تھا، ان کا ذمہ دار تھا۔ اصل غلطی اس سے ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنی لاپروائی کے لیے فسوس اتر آیا اور چنی کے لیے ہمدردی جو اپنا بچپن دوسرے بچوں کی طرح کھلونوں سے کھیل کر گزارنا چاہتی تھی لیکن ان کی اتنی حیثیت نہیں تھی۔۔۔

بچوں کو دنیا اور اس کے مسائل سے کیا لینا دینا، انھیں تو بس اپنا معصوم بچپن کھل کر جینا ہوتا ہے اور اس کے لیے انھیں کھیل کود کے ساتھ اپنی معصوم خواہشات کی تکمیل بھی چاہیے ہوتی ہے۔ انھیں دنیا کی ہر وہ چیز چاہیے ہوتی ہے جو انھیں بھاتی ہے۔۔۔ وہ تینوں بھی آخر بچے ہی تو تھے۔

"جب میں افسر بن جاؤں گا تو اپنی بہن کو ہر کھلونا لے کر دوں گا۔"

"سچ میں تم سب کھلونے لے دو گے......؟"

وہ خوشی سے اپنے آنسو پونچھ کر پوچھ رہی تھی۔

"بالکل سچ۔۔"

"بھائی! جب تم افسر بن جاؤ گے تو مجھے بولنے والی گڑیا لے کر دینا۔" رات وہ کھلے آسمان تلے چارپائی پہ لیٹے تارے گن رہا تھا اور چنی اپنے خواب بن رہی تھی۔

مانی نے اس کی فرمائش پہ "ہوں" کر دیا۔

"اور گڑیا کا گھر بھی جس میں اس کا سارا سامان ہوتا ہے۔" وہ دیکھ تاروں کو رہی تھی لیکن سوچ کھلونے رہی تھی۔

انہی تاروں میں اسے اپنے کھلونے بنتے بگڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ چند تاروں کے جھرمٹ میں ابھرتے ڈوبتے کھلونے......

"نِنّی کو رنگوں کے ڈبے اور کاپیاں لے کر دینا تاکہ وہ خوب رنگ بھر سکے۔"

مانی نے جمائی لی اور "ہوں" کر دیا۔

"اور اپنے لیے سائیکل لینا۔ بلکہ گاڑی لینا بھائی تاکہ میں اور نِنّی بھی اس میں بیٹھ سکیں۔" اب مانی کی طرف سے کوئی ہوں ہاں سنائی نہیں دی۔ چنی نے پکارا۔

"اور ہاں بھائی...... پھر ہم میلے سے وہ ڈاکٹر کی والا سیٹ بھی لیں گے۔ تم ڈاکٹر بننا، میں نرس اور نِنّی کو مریض بنا دیں گے۔ وہ کمزور سی مریض اچھی لگے گی۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ ہولے سے ہنسی۔ پھر مڑ کر ساتھ والی چارپائی پہ سوتے مانی کو دیکھا۔

"بھائی سو گئے کیا......؟" اور اس سے وعدے کرتا بھائی سو چکا تھا......

اور وہ وعدہ کرتے اور چنی وعدہ لیتے ہوئے

...حالات نے اس کی جیسے ...آسان نہیں تھا۔ ... بھی سیکھے نہیں ...کی تھی وہ یہ سب چاہتے ہوئے...

"کیا تم تیار ہو......؟" وہ ہسپتال سے جلدی ...آیا تھا اور آتے ہی کسی ضروری فون کال کو سننے ...میں چلا گیا تھا۔ خود وہ بہ مشکل دس منٹ میں ہی ...ہو جایا کرتا تھا۔ زمین قریباً تیار ہی تھی۔ حماد اسے ...مسکراتے خود بھی تیار ہونے چلا گیا۔ بچوں کے ...کھلونے وہ کب کا گاڑی میں رکھوا چکا تھا۔

"مدیحہ کی کال تھی۔" گاڑی کو گیٹ سے نکال ...نے کے بعد وہ اسے بتا رہا تھا۔ زمین کرید نے والی ...بیویوں میں سے نہیں تھی۔ اسی لیے وہ جو بات بتا دیتا ...سن لیتی اور جو بتانا مناسب نہیں سمجھتا تھا وہ اسے ...پوچھنا گوارا نہ کرتی تھی۔

"کیسی ہے وہ اور بچے کیسے ہیں......؟" مدیحہ ...حماد کی چھوٹی بہن تھی۔ اس کی شادی ان سے تین ...سال پہلے ہوئی تھی جب حماد کے والد صاحب حیات ...تھے۔ مدیحہ حماد کے ہی ایک کولیگ سے بیاہی گئی تھی ...اور اب شادی کے بعد کینیڈا منتقل ہو گئی تھی جہاں اس ...کا میاں مزید تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ...نوکری بھی کر رہا تھا۔ تاہم وہ مکمل ہاؤس وائف تھی ...اور اپنے دو جڑواں بچے سعد اور جواد اور ایک پیاری ...سی بیٹی حمنہ کے ساتھ مصروف رہتی تھی۔

حماد ہمیشہ سے پڑھائی میں اچھا تھا اسی لیے ...اپنی محنت کے بل بوتے پہ ڈاکٹر بن گیا۔ وہ واجبی سی ...تعلیم ہی حاصل کر پائی اور اپنی شوق کی تکمیل کے لیے ...اس نے فائن آرٹس رکھ لیا جبکہ مدیحہ نے بہ مشکل ہی ...پاس کیا تھا اور اماں کی ہزار خواہش پہ بھی وہ آگے ...پڑھ کر نہ دی۔ مدیحہ کی شادی کے بعد ابا جی اور حماد ...دونوں کی خواہش تھی کہ زمین ہی اس گھر کی بہو بنے ...لیکن اماں نے بہت مخالفت کی۔

"میں نے زمین کے علاوہ کسی کے بارے میں ...کبھی سوچا بھی نہیں اماں۔ نہ ہی زمین کو میں اس گھر سے ...کہیں جانے دوں گا۔ وہ ہمیشہ سے میری تھی اور میری ہی رہے گی۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا جو زمین کو اچھا اور اماں کو بے حد برا لگا تھا۔ لیکن جوان اولاد کی خواہش کی بدولت اماں کو مانتے ہی بنی۔ یوں زمین اور حماد کے بچپن کا ساتھ زندگی کے ساتھ میں ڈھل گیا۔

"بالکل خوش باش ہے اور بچوں کو بگاڑے جا رہی ہے۔" وہ خوش مزاجی سے زمین کو بتا رہا تھا۔

"کہتی ہے کہ یہ ٹیکنالوجی کے بچے ہیں۔ موبائل، ٹیب پہ چلنے والے۔ یہ عام کھلونے خرید کر دوسری بار ان کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے اور کھیلوں سے تو ان کا دور دور تک واسطہ نہیں ہے۔"

زمین حماد کی بات پہ مسکرا دی۔ یہ آج کل کی ہر ماں کے منہ سے بیان کیا جانے والا دکھ تھا۔

"یار! مجھے اپنا دور یاد آتا ہے۔ کیسے ایک ایک چیز کی قدر تھی۔ اپنی چیزوں کو کیسے ہم سنبھال سنبھال کر رکھتے تھے۔ اور آج کل کے بچے ہیں کہ......"

وہ اکثر زمین سے اپنے بچپن کی باتیں کیا کرتا تھا۔

"شاید اس لیے کہ ہمیں بیٹھے بٹھائے سب کچھ نہیں مل جاتا تھا۔ آج کل کے وہ بچے جن کے پاس اب بھی سہولیات، زندگی محدود ہیں انہیں اب بھی اپنی چیزوں کی قدر ہے اور وہ اب بھی گلی کوچوں میں کھیلے جانے والے اپنے کھیلوں کو پسند کرتے ہیں۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کو قیمتی متاع کی طرح رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے کہ وہ کس مشکل سے انہیں حاصل کر پاتے ہیں۔"

اسے زمین کی بات سے اتفاق تھا۔ وہ ہر سال ایسے ہزاروں بچوں سے کچی آبادیوں میں ملتا تھا جو اس کی جانب سے دیے جانے والے تحائف کو کسی تمغے کی مانند سینے سے لگا کر رکھتے تھے۔ کھلونے محدود ہونے کی بدولت کھلے میدانوں اور گلیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے تھے۔

کچی آبادی میں پہنچ کر وہ مختلف ٹوٹے پھوٹے راستوں سے ہوتا ہوا ایک میدان کی جانب چلا گیا تھا۔ زمین کو وہ جگہ دیکھی دیکھی سی لگی تھی لیکن وقت

گزرنے کے ساتھ ہر مقام میں اتنی تبدیلیاں آ چکی ہیں کہ انسان پرانے رستوں سے گزرتا ہے تو انہیں ایسی اجنبی نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے کبھی یہاں سے اس کا گزر نہ ہوا ہو۔ میدان سے دوسری جانب دور اسے میلہ دکھائی دیا تو اب جگہ کی شناخت آسان ہو گئی۔

کچھ بچے جو میدان میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے، اپنا کھیل چھوڑ کر بھاگتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ یقیناً وہ ڈاکٹر حماد کو پہچانتے تھے جو ہر سال ان کے لیے کھلونے بطور تحائف لاتا تھا۔ وہ اسی آبادی کے چند غریب ترین لیکن ذہین بچوں کو اچھے اسکولوں میں تعلیم بھی دلوا رہا تھا۔ کچھ قرض تھے جان پہ جو وہ اتار رہا تھا۔

تحائف انہیں دے کر وہ انہی کے ساتھ مل کر اب گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ زرمین وہیں ایک مٹی کے ٹیلے پہ بیٹھ کر دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھ رہی تھی۔ اپنی جامنی رنگ کی مہنگی شرٹ کی آستین چڑھا کر، جیل سے جمے بالوں کو مٹی میں دھول دھول کرتے حماد بہت مہارت سے کھیلتے ہوئے ان بچوں کو ہرا رہا تھا۔ زرمین کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ اسے پرانا حماد یاد آ رہا تھا جو کبھی کھیلوں کا ایسا ہی دلدادہ تھا۔

تبھی ایک طرف سے بچوں کی ایک پلٹون بھاگتی ہوئی اس کے پاس چلی آئی۔ وہ انہیں ایک طرف لے جا کر ان کے تحائف ان میں تقسیم کرنے لگا۔ پھر تین بچوں کو ایک طرف کرتے وہ انہیں زرمین کے پاس لایا۔ وہ جانتی تھی کہ وہی تینوں مانی، چنی اور ننی ہوں گے۔

"ان سے ملو بھئی۔ یہ میری پیاری بیگم ہیں۔" وہ وہیں اس کے ساتھ ٹیلے پہ بیٹھ گیا۔

"زرمین! یہ مانی ہے جو آج کل آبادی سے باہر مٹی کے برتنوں کی ریڑھی لگاتا ہے۔ اس کی امی بہت پیارے مٹی کے برتن بناتی ہیں جنہیں یہ چھوٹی چنی اپنے ننھے ہاتھوں سے سکھاتی ہے اور یہ ننی ان پہ روغن کرتی ہے۔ جب مانی انہیں بیچ کر گھر لاتا ہے تو امی ان تینوں کو اس میں سے ایک ایک روپیہ دیتی ہیں جنہیں یہ سب اپنے مٹی کے گلے میں جمع کرتے ہیں۔ مانی اس سے اپنے لیے ایک سائیکل خرید کر میلے میں ہونے والے مقابلے میں شرکت کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس کا خواب ہے..... چنی ان پیسوں سے اپنے لیے گڑیا خریدے گی، اس کے میک اپ کا سامان اور جہیز بنائے گی.....اور ننی اس سے اپنے لیے بڑے والے رنگ خریدے گی کیونکہ اسے رنگوں سے پیار ہے۔" زرمین مسکراتی رہی۔

"لیکن ہمارے اور خواب بھی ہیں۔ میں بڑا ہو کر ڈاکٹر انکل کی طرح ڈاکٹر بنوں گا۔ یہ....." اس نے اپنی بہن کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ٹیچر بنے گی۔ اور یہ....." اس نے اپنی کزن کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ برتنوں پہ رنگ سازی کرے گی۔" وہ ان اونچے عزائم پہ دل کھول کر مسکرائی تھی۔

"یہ ان پیارے بچوں کی محنت، خواب اور خواہشات کی کہانی ہے۔" وہ محبت سے ان تینوں کو دیکھتے کہہ رہا تھا۔ زرمین جان گئی تھی کہ حماد اسے کیوں ان سے ملوانے لایا تھا۔

"ڈاکٹر انکل! آپ ہر سال اتنے پیارے کھلونے لاتے ہیں کہ ہمارا دل نہیں کرتا ان سے کھیلنے کو۔ امی کہتی ہیں کہ انہیں سنبھال کر رکھ دو۔ توڑ دو گے لیکن میں چھپکے چھپکے ان سے کھیلتی ہوں کیونکہ مجھے کھلونے بہت پسند ہیں۔" یہ چنی تھی۔

"بہت اچھا کرتی ہو۔ یہی کھیلنے کے دن ہیں۔ اس لیے اپنے کھلونوں کو دھیان سے رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے کھیلنا بھی ضروری ہے۔" اس کے گال پہ ہلکی سی چپت لگاتے وہ خوش تھا، بہت خوش تھا۔

"لیکن انکل! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ ہمیں مانی، ننی اور چنی کیوں کہتے ہیں۔ ہمارا نام تو ببلو، پمی اور منی ہے۔" ننی سوال کر رہی تھی۔

حماد اور زرمین نے ایک ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ ایک دوسرے کی نظروں کی تحریر خوب سمجھ

"یہ تم تینوں انہی تینوں کی طرح ہو۔"

"بچپن وہ ہیں کون.....؟" مانی عرف ببلو پوچھ رہا تھا۔

"یہ تینوں کوئی..... جن کا بچپن بھی انہی گلیوں میں کھیلتے کھیلتے جوان ہوا۔ جنہوں نے اسی مٹی کے کھلونوں کی محبت دل میں پالی لیکن بس وہ محبت ادھوری ہی رہی۔ پھر ان میں سے ایک نے وعدہ کیا کہ اپنے خواب تو ادھورے رہ گئے لیکن دوسرے بچوں کے خواب وہ ضرور پورے کرے گا کیونکہ بچپن زندگی کا حسین ترین حصہ ہے اور ہر بچے کو زندگی کا یہ حسین ترین حصہ مکمل کر کے جینے کا حق ہونا چاہیے۔" "ڈاکٹر حماد اور زرمین..... مانی، چنی اپنے بچپن کو یاد کرتے اسی میدان میں بیٹھے دور سے میلے کو دیکھ رہے تھے۔

زرمین سامنے میلے کے تمبو سے آتے شور کو سن رہی تھی۔

"کیا آپ میلے میں نہیں جائیں گے.....؟"

میلے سے ان کے بچپن کی ڈھیروں یادیں تھیں وہ ان دنوں اسی لیے بھی آبادی میں آتا تھا کہ یہاں کے ڈھیروں بچے میلے میں جاتے ہیں چند پلاسٹک کے کھلونوں کے لیے لیکن پھر اسی طرح واپس لوٹ آتے ہیں کیونکہ کھلونے بہت مہنگے اور خواب سستے ہو چکے تھے۔ ایسے میں ان کے ننھے منے خوابوں میں رنگ بھرنے وہ ان کے لیے کھلونے خرید کر لایا تھا۔ وہ کھلونے جس تک ان کی کبھی رسائی نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہاں کی آبادی بہ مشکل اپنا پیٹ پالتی تھی، بچوں کے خواب کیسے پالتی.....؟

"میں بس ایک بار میلے میں گیا تھا ننی اور وہاں جا کر ہر اسٹال پہ جاتے، گھومتے، پھرتے میں ایک بات سوچ رہا تھا کہ آج میری مٹھی میں اتنی ... ہے کہ میں پورے پورے اسٹال خرید سکتا ہوں کئی کئی بار جھولوں میں بیٹھ سکتا ہوں..... جی بھر کر ... دیکھ سکتا ہوں لیکن اب اس بچپن کو کہاں سے لاؤں جس میں یہ سب کرنے کی خواہش تھی۔۔۔ اب وہ بچپن اور بچپن کے ساتھی کہاں سے لاؤں جو وقت کے بہاؤ میں بہہ کر کہیں کے کہیں نکل چکے ہیں۔۔؟ بس بچپن تو گزر گیا اب۔۔اب نہ وہ خواہشات ہیں، نہ وہ معصومیت اور نہ وہ سادہ سی چاہت......"

زرمین نے میلے کے دکھائی دیتے تمبو سے نظریں ہٹا کر شوہر کو دیکھا جس کی آنکھوں کی لالی گزرے ماضی کو ڈھونڈ کر بھی ڈھونڈ نہیں پائی تھی اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کے شانے سے سر ٹکا دیا۔ وہ دونوں اب میلے سے بلند ہوتی ہوئیں آوازیں سن رہے تھے......

"آجاؤ بھائی جان، قدردان...... موت کا کنواں دیکھ لو۔۔سائیکل اور گاڑی کی سواری پیاری دیکھ لو۔"

"جل پری کی باتیں ہو رہی ہیں......آدھے دھڑ والے آدمی کی باتیں ہو رہی ہیں۔"

"دودھ سوڈا پی لو......ٹھنڈی ملائی قلفی کھالو۔"

اور حماد اس میدان میں بچوں کو کھلونوں سے کھیلتے، خوشی سے چلاتے دیکھ رہا تھا......

ایک چھوٹا سا لڑکا تھا میں جن دنوں
ایک میلے میں پہنچا ہمکتا ہوا
جی مچلتا تھا ایک اک شے پر مگر
جیب خالی تھی، کچھ مول لے نہ سکا
لوٹ آیا لیے حسرتیں سینکڑوں
ایک چھوٹا سا لڑکا تھا میں جن دنوں
خیر محرومیوں کے وہ دن تو گئے
آج میلہ لگا ہے اسی شان سے
آج چاہوں تو اک اک دکاں مول لوں
نارسائی کا اب جی میں دھڑکا کہاں
پر وہ چھوٹا سا، الہڑ سا لڑکا کہاں۔
پر وہ چھوٹا سا، الہڑ سا لڑکا کہاں۔

☆☆

مکمل ناول

منعم ملک

نمکین پانیوں کا سفر

پچھلی قسط کا خلاصہ:

خضر زخمی حالت میں گھر پہنچتا ہے۔ یمی اس سے معافی مانگتی ہے۔

کرم الٰہی پچھتاوے کا شکار ہو کر ثانیہ سے کہتا ہے کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ثانیہ انکار کر دیتی۔

شمائلہ بہادر کو ادارے کی طرف سے ایک معذرتی میل وصول ہوتی ہے جس میں اس کے ناول کی آخری قسط کو شائع کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

شمائلہ معین کو جا کر بتاتی ہے کہ یمی کی شادی خضر دستگیر سے ہوئی ہے اور وہ اسی کے پاس ہے۔

صدام غصے میں دستگیر کے ڈیرے پر جا کر اس کا سر پھاڑ دیتا ہے شکیلہ پولیس اہلکاروں کے ساتھ صدام کے گھر پہنچتی ہے اور صدام حسین کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔

خضر کو جب معلوم ہوتا ہے کہ ناول یمی لکھ رہی تھی شمائلہ کا تو بس نام استعمال ہو رہا تھا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے جذبات اور احساسات کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ وہ یمی سے ناراض ہو جاتا ہے۔

شمریز کھانے کی میز پر سب سے کہتا ہے کہ وہ ثانیہ سے شادی کرے گا تو اس وقت شمائلہ پر انکشاف ہوتا ہے کہ نقصان صرف اس کا نہیں بلکہ اس کا بھائی بھی اسی کشتی کا سوار ہے۔

خضر کو شمائلہ سے فون پر باتیں کرتا دیکھ کر شمائلہ کے قدموں میں آگ دہک جاتی ہے۔ دونوں میں جھگڑا ہوتا ہے اور بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ خضر کا ہاتھ بلند ہو جاتا ہے۔ اس وقت شکیلہ کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔

بیسویں قسط

اس کے سر پر کبوتروں کا غول اڑا تھا۔ پھڑ پھڑاتیں اس کی سماعتوں کا چیرتی گئیں پیچھے فضا میں پرندوں کا شور تھا۔ فلک کے رنگ برنگے پنچھی......

خضر کو دنیا کا کوئی خاموش کونا درکار تھا۔ اس کا فون بار بار بج رہا تھا، تنگ آ کر اس نے فون کان سے لگایا تھا۔

"خضر! کہاں ہو تم؟" حنا عجلت میں پوچھ رہی

خضر بمشکل کوفت سے بولا۔

"... میں ٹھیک نہیں ہوں۔"

"مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"خضر! پلیز تم واپس آ جاؤ۔"

"مجھے تنہائی چاہیے۔"

"خضر! میرے بھائی اماں جان کو ... بہت محبت کرتی ہیں تم سے۔"

"میں نے کہا ناں یار......" وہ بے طرح جھنجلایا۔

"کیا میں کچھ دیر تنہا نہیں رہ سکتا؟" اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ پیدل چل رہا تھا۔ ایک پتھر سے اس کا پاؤں ٹکرایا۔ ایک ٹیس اٹھی۔

"اماں یمی کو لے کر بہت حساس ہیں۔" وہ بے بسی سے بول رہی تھی۔

"مجھے منع کیا گیا تھا تمہیں بتانے سے...... لیکن اب یہی صحیح وقت ہے۔"

"مجھے نہیں سننا کچھ حنا! فار گاڈ سیک......" اس کے انگوٹھے سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ فون بند کرنا چاہتا تھا کہ حنا نے بے قراری سے بولنا شروع کر دیا تھا۔

سی ہماری خالہ زاد ہے خضر ...... ہماری کی کزن ...... اماں جان کی بھانجی!"

حنا نے زور دینے کے لیے ایک بات تین زاویوں سے کی تھی۔ خضر ٹھہر گیا۔ کبوتروں کا غول اس کے سر پر دوسرا چکر کاٹ رہا تھا۔ مگر شور تھم گیا ...... ہر سمت خاموشی گھومنے لگی۔

"انہوں نے تمہیں کبھی نہیں بتایا۔ وہ ان کی سگی بہن کی بیٹی ہے اس لیے تم شاید ان کی یمی سے محبت کی گہرائی نہیں ماپ سکتے ...... سن رہے ہو خضر۔ وہ ہرٹ ہیں۔ واپس آ جاؤ۔"

خضر کے انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر اسے انگلی میں ٹیسیں محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ سن رہ گیا تھا ...... اس انکشاف نے اسے برف کا مجسمہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

"کیا خضر تم سے ایسے اونچی آواز میں بات کرتا ہے ...... اس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں یمی، تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

وہ یمی کے سامنے بیٹھے ہوئے ایسے پوچھ رہی تھیں جیسے ایک ماں کسی کے گھر چھوڑ گئے اپنے بچے سے واپسی پر پوچھتی ہے۔

یمی کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا اور وہ عرق عرق ہو رہی تھی۔

"میرا یقین کرو اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہوتا، میں کبھی تمہیں خضر کے ساتھ اکیلا نہ چھوڑتی۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا۔" ان کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ یمی نے بے چینی سے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"وہ ایسے نہیں ہیں۔ میں نے انہیں غصہ دلایا تھا۔ خضر سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ واقعی بہت اچھے ہیں۔"

یمی کے یقین دلانے کے باوجود ان کی آنکھوں میں بے یقینی کے بادل لہراتے نظر آتے تھے۔ وہ اس کے چہرے پر جیسے جھوٹ کی لکیر کھوجتا

چاہتی تھیں۔

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"آپ اپنے بیٹے پر یقین رکھیں ...... بری نہیں تھی، بے وجہ بری ہو گی۔"

"میں نے اپنی بہن کو بہت تکلیف ...... دیکھا ہے، میں تمہیں ذرا سی تکلیف میں بھی ...... سکتی۔ ورنہ تاجور سے نظریں ملانے کے قابل ...... رہوں گی۔"

اس کی ماں کی کتنی اہمیت جھلک رہی تھی ...... کے لہجے سے ...... یمی کو یقین نہ آتا تھا کہ ...... کیسے دور رہی تھیں۔ اور یہ دوری بھی دلوں ...... نہ لا سکی۔

"یہاں میرا بہت خیال رکھا گیا ہے۔" سر جھکا کر شرمندگی سے بول رہی تھی۔

شکیلہ نے اس کی ٹھوڑی چھو کر چہرہ اوپر ...... تھا۔ پھر حسرت زدہ نگاہوں سے وہ چہرہ دیکھے ......

"جانتی ہو تم مجھے اتنی عزیز کیوں ہو یمی؟" ...... کی آنکھوں میں شفاف نمی تیر رہی تھی۔ یمی ...... نظروں سے دیکھے گئی۔

"کیونکہ تم ہم دونوں بہنوں کو ملانے کا ...... بن گئی ہو۔ ہم بہنوں کا رشتہ انمول ہے، ...... دوسرے نام کا محتاج نہیں۔ مگر اس نے ...... دل بہت ٹھنڈا کر دیا ہے۔ یہ میری بہن کا ...... آنے کا راستہ کھولے گا ایک دن۔" انہوں نے ...... کی پیشانی چوم لی تھی۔ یمی کے حلق میں آنسو ...... ہونے لگے۔ گلا بیٹھنے لگا۔

"میری ماں نے بہت تنہا سی زندگی گزاری ...... ہے خالہ! وہ ساری زندگی اکیلی رہیں ......" انہیں سامنے پا کر ٹوٹنے لگی تھی۔ اس نے ...... رشتے سے انہیں مخاطب کیا تھا۔ دونوں ...... تھیں اور بیک وقت جذباتی بھی۔

"میں جانتی ہوں میری بچی! تاجور ...... ایسی ہی رہی جیسے اس نے اپنے ساتھ ...... بھی خود پر لے لی ہوں۔" وہ آنسو پونچھ ......

کا دکھ مشترکہ تھا۔ اور ان کی گفتگو کا ...... دونوں ...... سکتی تھی۔ ...... بولی ہے لے کر اب تک اماں کا دکھ، ابا کا ...... دکھ، اولاد کا دکھ اور نجانے کتنے دکھ تھے۔ وہ ...... کس کس کو ...... میں لاتیں کس کو چھوڑتیں۔ ...... ان کی آنکھوں کی اسکرین پر ایسے ہی کسی وقت ...... فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔

☆☆☆

"میں کرم الٰہی کو شہر لے جانا چاہتی ہوں۔ ...... میں پہلی ان اجنبی چہروں کے بیچ بیٹھ ...... کر دل کڑا کر کے کہہ رہی تھی۔

کرم الٰہی نے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ دن رات بخار میں جلتا رہا۔ نہ کھانا ...... نہ پانی ...... بس آنکھوں کے گوشے نم رہتے۔ ثانیہ کو لگتا تھا کہ اس نے کرم الٰہی کو موت کی طرف دھکیل دیا ہے، اس واقعے کے بعد سے جیسے اس کا بھرم ٹوٹ گیا تھا ...... ہر خول چٹخ گیا۔ نہ کسی دوا کی پروا نہ زیست کی ...... پچھلی دو راتوں سے تو بلغم کے ساتھ خون بہنے لگا تھا۔ ثانیہ بے بسی کی انتہاؤں پر تھی۔ ایک واحد سہارا۔ ایک آسرا ...... ایسا انسان جس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ ثانیہ اس کو اپنی آنکھوں سے مرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی روح پر یہ بوجھ نہیں رکھنا چاہتی تھی کہ اس نے اس آدمی کی کوئی مدد ہی نہ کی۔

"میرے ساتھ شہر چلو۔ تمہیں ہسپتال لے کر جاتی ہوں۔ یہاں تم مر جاؤ گے۔" ثانیہ اس دن گیلی لکڑی بن گئی۔ چٹختی ہوئی اور دھواں دھار ...... کڑوا کسیلا دھواں۔

کرم الٰہی نے نیم وا آنکھوں سے اس کو دیکھا جواب نہیں دیا۔

"خدا کے لیے خاموش مت رہو۔ مجھے وحشت ہوتی ہے ان در و دیوار سے، تمہاری حالت ہولا کر رکھ دیتی ہے مجھے۔ اپنا نہیں تو میرا سوچو۔ طبیعت اور بگڑ گئی تو میں اکیلی لڑکی کیا کروں گی؟" وہ چیخ اٹھی تھی۔

کرم الٰہی کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ پیاس سے اس کے ہونٹ خشک، زبان تالو سے چپکی تھی۔ پھر بھی وہ کچھ نہیں مانگتا تھا۔

"جاؤ میرے بھائی بھتیجوں سے کہو۔" اس نے یہ مختصر سی بات اتنی کم آواز میں کہی کہ ثانیہ کو کان لگا کے سننی پڑی تھی۔

"وہ نہیں آئیں گے۔" ثانیہ کے دل نے کہا تھا۔ مگر وہ گم صم سی کھڑی رہی۔ وہ اس مایوس و بیمار شخص کا یہ کہہ کر دل نہیں دکھانا چاہتی تھی کہ انہیں اس کی کیا پروا۔

"اچھا، میں جا کر کہتی ہوں۔"

ثانیہ بہت ہمت کر کے ان کے پاس آئی تھی۔ انہیں کرم الٰہی کی حالت کا بتانے، تھوڑا خدا کا خوف دلانے کہ وہ انہی کا بے اولاد بھائی تھا۔ کچھ حقوق تو تھے ان کے بھی ......

"شہر کس لیے؟" بڑی حیرانی سے پوچھا گیا تھا۔ ان کے جوان بچوں کو کرم الٰہی سے زیادہ اس لڑکی میں دلچسپی تھی کہ وہ کیا کہنے آئی ہے۔

"علاج کے لیے، گاؤں کی ڈسپنسری سے اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ وہ رات بھر تڑپتا ہے۔ جیتا جاگتا انسان ہے۔"

ثانیہ ان کی منت کرنا چاہتی تھی مگر یہ چہرے اسے مہربان نہیں لگ رہے تھے کچھ عجیب ٹھوس اور پتھریلے سے۔

"یہ عمر ہے اس کی کہ علاج اثر کرے گا؟ ساری زندگی عیش سے گزاری ہے۔ اس عمر میں بھی اپنی من مانی کی۔" اس کے بڑے بھائی نے ناگواری نظر ثانیہ پر ڈالی۔ "کچھ تو خمیازہ بھگتے گا ناں بددعائیں دیتا ہے ہماری اولادوں کو۔ اسے کہو اللہ اللہ کرے اس کے ساتھ کے تو کب کے چل بسے ...... یہاں کون اتنا فارغ ہے کہ فضول میں شہروں کے چکر کاٹے۔ سرکاری ہسپتالوں کا حال پتا ہے توبہ توبہ ......"

وہ بڑی سفاکی سے بول رہے تھے۔ ثانیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس کے جیتے جی اس کی موت کا

"نہیں! کسی اچھے ہاسپٹل میں......"

"بی بی! کسی اچھے ہاسپٹل کا خرچا پتا ہے؟" وہ کہہ کر ایک ساتھ زور سے ہنس پڑے تھے۔

ثانیہ سے بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ ان کے رویے ثانیہ کا دل چھلنی کر رہے تھے۔

"لیکن میں اس کو آپ سب کی طرح مرتا ہوا نہیں چھوڑ سکتی۔" ثانیہ نے سر اٹھایا اور مضبوطی سے کہا۔ کئی زبانیں خاموش ہوئیں۔

"کرم الٰہی کی اولاد ہوتی تو وہ آپ لوگوں کی سمت ترستی نگاہوں سے نہ دیکھتا۔" اس کی آواز صاف تھی مگر دل رو رہا تھا۔

"زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر جس تکلیف سے وہ گزر رہا ہے وہ تو کم ہو سکتی ہے اور اللہ نے چاہا تو زندگی بھی مل سکتی ہے۔"

وہ ملامتی نگاہوں سے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔ مگر یہاں کسی کے دل میں اس شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جو اپنی محرومی سے لڑتا ان سب سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

"ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟" ایک نوجوان نے پوچھا تھا۔ ثانیہ سر جھٹک کر کہنے لگی۔

"میں یہاں کسی کو نہیں جانتی، ہمارا شہر جانے کا بندوبست کر دیں۔ میں اکیلی سب کچھ کر لوں گی۔"

وہ ضبط کرتی ہوئی چادر درست کرتی تیزی سے وہاں سے نکل آئی تھی۔ کرم الٰہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ واپسی پر وہ ان سب کو ساتھ لیتی ہوئی آئے گی۔ مگر اکیلی گئی تھی۔ اکیلی لوٹ آئی تھی۔

"تم بلاوجہ ان سے نالاں رہتے ہو۔ سب اچھے ہیں، ہمارے لیے شہر جانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ انہیں تمہاری فکر ہے خصوصاً تمہارے بھتیجے۔" ثانیہ کا لہجہ گلوگیر تھا۔

کرم الٰہی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ جیسے سچ جھوٹ کو پرکھ رہا ہو۔ ثانیہ بھاگتی ہوئی اندر بند ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ لبوں پر

وہ بھی کرم الٰہی جیسی تھی۔ نہ کوئی پرسان حال... کوئی اس کی پروا میں گھلنے والا۔ کسی کے پاس... کے لیے وقت نہیں تھا۔ کوئی ان کے لیے ... نہیں تھا۔

☆☆☆

باہر گاڑی کھڑی تھی۔ کرم الٰہی چلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے اسی بھتیجے نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر کیری ڈبا کی پچھلی نشست پر لٹا دیا تھا۔ ایک کونے میں ثانیہ سکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ انہیں کہہ دیا گیا تھا کہ ڈرائیور نے سات سو روپیہ کرایہ مانگا ہے۔ وہ چاہیں تو دے دیں ورنہ وہ خود کچھ کر لیں گے۔ ثانیہ کو ان سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی۔ گاڑی اب بستی سے نکل کر ذیلی سڑک پر بھاگنے لگی تھی۔ کچھ دیر میں کرم الٰہی نے ڈرائیور کو کسی شخص کا نام بتاتے ہوئے وہاں رکنے کو کہا تھا۔ ثانیہ یقیناً اس شخص کو نہیں جانتی تھی۔ ڈرائیور نے اس سے سوال پوچھا تھا۔

"اس حالت میں پٹواری کے دفتر کیا کام؟"

وہ کرم الٰہی کو روکنا چاہتی تھی، مگر وہ اس کو کہاں خاطر میں لاتا تھا۔ لب بھینچے بیٹھی رہی۔ کرم الٰہی اس شخص کی مدد سے گاڑی سے نکل کر اندر چلا گیا تھا۔

ثانیہ کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ سوچنے کو بھی نہیں...... کچھ دیر میں کرم الٰہی اسی خاموشی سے واپس آ گیا تھا جس خاموشی سے گیا تھا۔

ثانیہ اس سے سوال کرنا چاہتی تھی، مگر اس نے خاموشی سے بند مٹھی ثانیہ کے ہاتھ پر کھول دی تھی۔ وہ کچھ رقم تھی۔ کچھ پیسے جو یقیناً ان کی ضرورت تھے۔ ثانیہ کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔ اتنی کہ وہ پانی سے لبریز ہو گئیں۔

وہ شہر کے مقامات نہیں جانتی تھی، اسے سرکاری ہسپتالوں کے سسٹم نہیں پتا تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہاں انہیں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے پاس صرف اللہ سے لگائی امید تھی۔ کرم الٰہی کی صحت کا عزم...... اور اس کی زندگی کی دعا۔

بھاگی۔

... ہوئی تیرہ ...

☆☆☆

ماضی: (تاجور کو کلہاڑی لگنے والی رات)

... ہو گئی تھی۔ ہر رات پہلے سے بڑھ کر گہری سیاہ ہو گئی تھی۔ جیسے خون خون...... تاجور کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ وجود نخ بستہ...... حاکم کو لگتا تھا کہ وہ زمین آسمان کے درمیان کہیں لٹک رہا ہے۔ تاجور کے سر پر رکھے ہاتھ سے خون بہہ بہہ کر اس کی آستین سرخ رنگ میں بھگو چکا تھا۔ اس نے پوری قوت سے حویلی کے دروازے کو ٹھوکر ماری تھی۔ بہادر باہر نکلا تو زمین پر گھٹنوں کے بل جھکا حاکم...... تاجور اگر ختم ہو چکی تھی تو حاکم حالت نزع میں تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" بہادر کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"ہسپتال ہسپتال......" حاکم گونگا تھا۔ قوت گویائی سے محروم۔

"یہ زندہ بھی ہے حاکم؟" بہادر اپنے سر پر ہاتھ مارا تھا۔ حاکم پر جیسے تیزاب ڈال دیا۔

"جلدی...... جلدی کرو۔" حاکم کے لفظوں نے نہیں حالت نے التجا کی تھی۔ بہادر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بھاگا تھا۔ مارے دہشت کے وہ دو جگہ گرا اور گر کر گاڑی تک پہنچا تھا۔

☆☆☆

اس رات ایک ساتھ دو دردناک چیخیں فضا کا سکوت چیر گئی تھیں۔ ایک ساتھ دو کرب انگیز آوازیں۔ موت کی آہٹیں سچی تھیں۔

موت تو واقعی آئی تھی۔ صحن میں چکراتی صباخان کے قدموں سے زمین ہلانے۔

جس لمحے حاکم کے وار سے تاجور کی چیخ بلند ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے وہی چیخ حاکم سے گھر سنائی دی گئی ہو۔ وہ چیخ بھی دل پر دہشت طاری کرتی تھی۔

یہ فالج زدہ انسان کی چیخ تھی۔ جس نے مہینوں سے بولنا چھوڑ دیا تھا...... اور یہ فالج زدہ بلند چیخ جتنی بھیانک ہو سکتی تھی۔ اتنی ہی خوف ناک تھی۔

"اماں......اماں۔" صبا نے تیزی سے ان کی گال تھپتھپائے۔ ان کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ تاجور کی آنکھوں کی طرح...... ان کے چہرے پر کوئی سنگین سی چھاپ تھی۔ جیسے حاکم کا وار تاجور پر نہیں ان پر چل گیا ہو۔ صبا کو تاجور کی خبر نہیں تھی۔ مگر موت نے زندگی کے لب چوم لیے تھے۔

حمیدہ اس دنیا سے جا چکی تھیں۔

صبا نے خوف کی شدت سے بیرونی دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

"کیا ہوا یہ چیخ کس کی تھی؟" صدام حواس باختہ سا اندر آیا تھا۔

"اماں...... اماں جا چکی ہیں۔" اس کی گھگھی بندھ چکی تھی۔ صدام فوراً سمجھ نہیں پایا۔

"کہاں؟"

"وہ نہیں رہیں صدام۔" صبا رو دینے کے درپے تھی۔

"اماں......" صدام کو شاک لگا۔ وہ آگے بڑھتا مگر صبا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"حاکم کو جا کر روکو...... وہ تاجور کو مار ڈالے گا۔" اس کی دوسری بات نے صدام کا دماغ گھما ڈالا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو، ہوش میں آؤ تم۔"

"وہ کلہاڑی لے کر اسے مارنے نکلا ہے۔ اسے بچاؤ۔ وہ...... وہ دونوں گھر پر نہیں ہیں۔" صبا کی ٹانگیں اس کے وجود کا بوجھ اٹھانے سے کانپ جا رہی تھیں۔ اس کی مکاری ہوا ہو چکی تھی۔

"وہ اس کو کیوں مارے گا۔" صدام چیخا تھا۔

"میں نے اسے کہا تاجور کسی اور سے ملا کرتی ہے، میں بس اسے گھر سے نکلوانا چاہتی تھی مگر

اس نے تاجور کو مار دیا تو...... تب [illegible] آواز
میں نکلتے الفاظ صدام پر انگارے اچھال گئے تھے۔ اس کا زوردار تھپڑ لرزتی صبا کو زمین پر منہ کے بل گرا گیا تھا۔

"بدبخت عورت! دو معصوم بچوں کی ماں ہے۔ میرے بھائی کو کوئی نقصان پہنچا تو میرا خاندان برباد ہو جائے گا۔" وہ چیختا ہوا اسے ٹھوکر مارتا باہر کی سمت بھاگا تھا۔ بیوی کی محبت...... ماں کی موت...... سب فراموش ہو گیا۔

دھول چاٹتی صبا زمین پر ماتھا ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

فجر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ سیاہی نیلگوں اجالے میں ڈھل چکی تھی۔ حاکم گھر آیا تو دور سے ہی سرخ رنگوں میں نہایا نظر آ رہا تھا۔ صدام اور صبا تیزی سے اس کے سامنے آئے تھے۔ وہ ہوش میں نہیں لگ رہا تھا۔

"تاجور کہاں ہے؟" صبا برآمدے میں ٹھہر گئی۔ صدام نے بے تابی سے پوچھا تھا۔
"حاکم! تاجور کہاں ہے؟"
"مار دیا میں نے اسے......" مشینی انداز میں جواب دیا۔ وہ نہ بولتا تب بھی لباس چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

"تم نے تاجور کو مار دیا......؟" صدام نے پر سراتے لہجے میں پوچھا۔ صبا کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔

"میں تاجور کو اپنے تابع کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ میرے مطابق زندگی گزارے، میری مرضی سے سانس لے۔ حالانکہ وہ جیتی جاگتی انسان تھی۔" حاکم اپنے خون رنگے ہاتھوں اور لباس کو دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ خون خشک ہو کر سیاہ دکھنے لگ گیا تھا۔

"میری بیوی بدکردار نہیں تھی، پھر مجھے اس پر شک گزرا۔ میں نے کبھی اس کی نہیں سنی ہمیشہ اس
سے خلاف کی۔ میں کی اور ہاتھوں کی گرفت [illegible]
گیا۔"

"حاکم! وہ اس وقت کہاں ہے؟" سر گھوم رہا تھا۔ گھر میں دو دو موت ایک ساتھ [illegible] کی حالت...... اس کا انجام اس کا خاندان [illegible] تھا۔

"وہ میری بیوی تھی۔ لیکن وہ مولوی [illegible] کی بیٹی بھی تھی۔ وہ چاہے مجھ سے شدید نفرت کرے مگر وہ اپنے باپ کی حرمت کا پاس ضرور [illegible] کیونکہ وہ کسی عام انسان کی بیٹی نہیں تھی۔ حاکم [illegible] آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ناقابل یقین [illegible] کی تیز دھوپ میں بارش کے امکان کی طرح [illegible] یقین...... ٹپ ٹپ کرتے آنسو۔

"اس کا باپ مر گیا مگر اس کے اندر زندہ تو [illegible] میں نے دو دو قتل کیے کیونکہ میری نگاہوں میں [illegible] آئی ہی نہیں۔ میری نگاہوں میں ایک اور عورت [illegible] اور اس ایک عورت کا کردار تھا۔"

حاکم کا وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس کے سامنے صبا کھڑی تھی۔ اور حاکم کی آنکھوں میں صبا کا کردار واضح ہو رہا تھا۔

"یہ عورت...... جس نے اپنی پاک [illegible] خیال نہیں کیا۔ جو اکیلے میرے بھائی کے ساتھ [illegible] رہی۔ میرے بھائی سے بھی پہلے نجانے کتنے [illegible] کے ساتھ...... یہ عورت جس کے نکاح کا بھی [illegible] یقین نہیں کہ......"

"حاکم!" صدام کا پورا وجود ہل گیا۔
تاجور کو لگنے والی کلہاڑی اتنی تیز دھار نہ ہو [illegible] جتنی صبا کو لگی حاکم کی یہ بات...... اس کی گردن [illegible] گئی۔ ایک جھٹکے میں اتر گئی۔

"میری آنکھوں پر اس عورت نے اپنا [illegible] باندھ دیا تھا۔ میں وہی پڑھتا رہا اور اس عورت [illegible] بھول گیا جس کے ساتھ حیات لگا تھا۔"

"صدام! میں اس عورت کی باتوں میں آ [illegible] جو میری بیوی کے قدموں کی خاک [illegible]

[illegible] کا تقدس نہیں جان [illegible]
جو عورت [illegible]
تھا۔ [illegible] نے اپنی بیوی کو مار دیا۔
[illegible] کھولتا تیل پھینک دیا گیا تھا۔ [illegible] سارے چہرے [illegible] کو نہیں بھول سکی تھی۔ نہ [illegible] کو وہ ساری زندگی [illegible] نفرت کو۔
[illegible] تاجور اور اس کی اولاد سے اونچا تصور کرتی [illegible] وہ خود کو عزت دار اور تاجور سے اونچا تصور کرتی [illegible] چونکہ وہ شوہر کی چہیتی تھی۔ حاکم کے ان الفاظ [illegible] نے جتا دیا کہ اوقات کیا ہوتی ہے۔
[illegible] وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گر کر اپنے ناخنوں [illegible] وہ انگلیوں سے زمین کھرچنے لگی تب وہ پاگل ہو رہا [illegible] تو اس کی انگلیاں زمین پر سرخ لکیریں بنانے لگیں [illegible] تو صدام کو ہوش آیا۔

"حاکم میرے بھائی۔" صدام نے آگے آ کر [illegible] اس کے ہاتھوں کو پکڑا اور اس کے کھلے گریبان میں [illegible] تو ڈال کر قمیص کو درمیان سے چیر دیا تھا۔ دامن تک [illegible] اپنی خون آلود قمیص اس کے بدن سے جدا کرتے ہوئے صدام نے اس کے کندھوں کو تھاما۔

"خود کو سنبھالو حاکم! اماں اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔ میں جنازے کا اعلان کروانے جا رہا ہوں۔"

☆☆☆

اگلی صبح حاکم کے گھر کے تمام منظر بجھ چکے تھے۔ طوفان آ کر گزر گیا تھا۔ اور یہ اس کے بعد کا وقت تھا۔ جس کے احترام میں خاموشی آنکھیں موند کر بیٹھ گئی تھی۔

حاکم تاجور کو گڑھے میں دفن کرنے گیا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ جب انسان ایک گڑھا کھودتا ہے تو اس گڑھے کے قریب ہی زمین کا منہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ یہ شگاف خود اسی انسان کے لیے ہوتا ہے۔ اور حاکم بھی اسی کھائی میں خود جا گرا تھا۔

اگلی صبح حاکم کے گھر کے صحن میں میت رکھی تھی۔ بیوہ کی میت...... اور وہاں صرف سکوت طاری تھا۔ نیلم بری طرح رو رہی تھی۔ ماں کے غم پر۔ تاجور کے غم پر۔ اور حاکم کے آنسو سوکھ چکے تھے۔ قدرت نے اسے بڑی سخت سزا دی تھی۔ اسے لگ رہا
[illegible] کا بوجھ [illegible] کی کوشش میں اس کی ماں اس سے چھین لی تھی۔ ماں بیمار سی زندہ تو تھیں۔

اک نئی کہانی کو منزل دینے کے لیے......
اک کہانی ہمیشہ کو رکی ہوئی تھی۔

☆☆☆

صبح کی روشنی چہار سو پھیل چکی تھی۔ گھنے پیڑوں پر پرندوں کی چہکار زور و شور سے سنائی دے رہی تھی۔ شکیلہ، دستگیر کے انتظار میں ٹہل رہی تھی کہ وہ اسے گلی میں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

"دستگیر! چچی وفات پا گئی ہیں۔" اسے یقیناً اطلاع تھی۔ پھر بھی شکیلہ نے تمہید باندھی۔

"ہاں! تم چادر لے لو۔" اس نے شکیلہ کو نہیں دیکھا تھا۔ شکیلہ نے گہرا سانس لیا۔

"ہاں، آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ تاجور اکیلی ہو گی۔ کچھ ہو بھی ایسے وقت میں اپنوں کی ضرورت رہتی ہے۔" وہ بولتے ہوئے پلٹ گئی تھی اور بات مکمل ہونے سے پہلے پلٹ آئی۔

"چلیں! خالہ بچوں کو دیکھ لیں گی۔" اس نے چادر سر پر پھیلائی۔

"ہم فوتگی پر نہیں جا رہے۔"
"ہاں تو......" نقاب چنتی شکیلہ کا ہاتھ تھما۔
"نہیں جا رہے؟" اسے اچنبھا ہوا۔
"آپ کیا کہہ رہے دستگیر میں تو......" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ دستگیر نے افسردہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"وہاں تاجور تمہارا انتظار کرنے کے لیے نہیں ہے۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔ وہ جتنی کوشش کرتا تھا اس کو تکلیف سے بچانے کے لیے، دکھ اتنا ہی اس لڑکی کا پیچھا کرتے تھے۔

"ہم ہسپتال جا رہے ہیں۔" توقع کے عین مطابق دستگیر کی بات نے اس کی صورت کا سارا حسن نچوڑ لیا تھا۔

پرائیویٹ ہاسپٹل کے روم کا ڈور دھکیل کر اندر

داخل ہوتی شکیلہ کو ہوش نہیں رہا تھا کہ اس کی چادر گردن سے پیروں میں جھول رہی ہے۔ اندر پہلا قدم رکھتے ہی جیسے وہ زمین میں دھنس گئی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی، ایک فلک شگاف چیخ مارنا چاہتی تھی۔ اتنی دلخراش چیخ کہ دنیا شیشے کی ہو اور چکنا چور ہو جائے۔ اتنی دور تک بکھر جائے کہ کانچ کو کانچ کی خبر نہ رہے۔

وہ اپنا دکھ پوری دنیا کو بتانا چاہتی تھی، کیسا ظلم تھا ان کے ساتھ وہ کسی کے ہاتھوں فروخت نہیں ہوئی تھیں۔ وہ ان کے خریدار نہیں تھے۔ پھر بھی ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیوں کیا جا رہا تھا۔ چوٹ اگر تاجور کھاتی تھی تو سہہ جاتی تھی۔ مگر شکیلہ بلبلا اٹھتی تھی۔

تاجور کا سر اور گردن پٹیوں میں جکڑی تھی۔ اس کی گردن اور منہ ایسا سوجا لگ رہا تھا جیسے تین دن پانی میں پڑی لاش پھول جاتی ہے۔

شکیلہ تاجور سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ دستگیر نے پورا زور آزما کر اسے تاجور سے علیحدہ کیا تھا مگر اس میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ دستگیر کی گرفت میں بار بار نکل رہی تھی۔

"میں چھوڑوں گی نہیں اس جانور انسان کو، کہاں ہے وہ؟" وہ بپھر کر باہر جانا چاہتی تھی۔ دستگیر نے اس کو سختی سے روکا۔

"سنبھالو خود کو شکیلہ، حاکم یہاں نہیں ہے۔ تاجور کی حالت پہلے ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ خیال کرو پلیز۔"

تاجور نے بوجھل پلکیں ذرا سی اٹھائی تھیں۔ وہ دوائیوں کے زیر اثر تھی۔ آنکھیں ریشہ زدہ سی لگ رہی تھیں۔

"شا......" اس کی زبان حرکت میں آئی۔ شکیلہ تڑپ کر اس کے سامنے گئی تھی۔

"تاجور! میری جان۔" شکیلہ اس کا ہاتھ چومتے رو پڑی تھی۔ تاجور نے ذرا بازو وا کیا شکیلہ اس آغوش میں سما گئی۔ تاجور کا سینہ دیر تک بھیگتا رہا تھا۔ دستگیر کی اپنی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر بھیگ رہی تھیں۔

دن کے دوسرے پہر حاکم نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ٹھٹک گیا۔ پیچھے بہادر تھا۔

"انہیں میں نے اطلاع دی تھی۔" بہادر نے پیچھے سے سرگوشی کی۔ حاکم کی آنکھیں خفگی سے ... تھیں۔

"بھابھی کے لیے اس وقت یہ ضروری ہے حاکم!" بہادر نے اس کے کندھے کو ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا۔ شکیلہ کی نظر اس پر پڑی تو وجود میں بجلی سی کوند گئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی تھی اور حاکم پر جھپٹ گئی۔

"کیا کیا تم نے میری بہن کے ساتھ وحشی انسان، میری بہن کو لاوارث سمجھ لیا تم نے۔ قسم ... میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے حاکم پر بنا دیکھے ہاتھوں اور مکوں کی بارش کر دی تھی۔ پھر آگے بڑھا کر اس کے بال نوچنا شروع کر دیے۔ دستگیر نے زبردستی کھینچ کر اسے حاکم سے دور کیا تھا۔

"باجی! پلیز یہ ہاسپٹل ہے۔" بہادر نے ... لہجے میں کہا تھا۔ دستگیر نے شکیلہ کو ڈپٹا۔

"یہاں پر تماشا مت بناؤ، اور بھی لوگ ہیں۔"

"آپ اب بھی مجھے تماشا نہ لگانے کا کہہ رہے ہیں۔" اس نے گیلی آنکھوں سے کہا۔ "اور آپ......" اس نے بہادر خان کو دیکھا۔

"اس نے میری بہن کو مارنے کی کوشش کی ہے۔ اسے اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے۔" وہ حاکم کو نفرت سے دیکھ رہی تھی۔

بہادر نے بڑی مشکل سے یہ پولیس کیس بننے سے روکا تھا اور اپنے تعلق استعمال کر کے ... پرائیویٹ ہاسپٹل میں تاجور کو ایڈمٹ کروایا تھا۔ شکیلہ کے شکوے پر نظریں جھکا کر رہ گیا۔

"یہ ایک غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔ حاکم ... ہے۔" بہادر نے نیچی آواز میں کہا مگر شکیلہ نے ... پلٹ گئی۔ تاجور جتنے دن ہاسپٹل رہی۔ شکیلہ اس کے سرہانے سے ایک انچ نہیں ہٹی تھی۔

... اس کی موجودگی میں تاجور کی شکل بھی ... نہیں تھی۔ اس سے دستگیر اور شکیلہ برداشت کرنا مشکل ہو رہے تھے۔ مگر وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ تاجور کو ڈسچارج کیا گیا تو شکیلہ نے حاکم کو آنے سے روک دیا۔

"میں تاجور کو اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔"

حاکم یہ سن کر غصے سے اکھڑ گیا۔ اس نے غلطی کی تھی اس لیے شرمسار تھا، مگر شکیلہ اس کی اہمیت کو ... کرنے پر تلی تھی۔

"میں تاجور کو نہیں جانے دوں گی حاکم کے ساتھ۔ ان ظالموں میں کون اس کا خیال رکھے گا۔" وہ دستگیر سے الجھ پڑی تھی۔ دستگیر بھی اس کا ہم خیال تھا۔ بہادر خان نے اب کی بار بھی حاکم کو سمجھایا۔

"بھابھی کی حالت نازک ہے۔ ذہنی طور پر وہ ... شاک میں ہیں۔ انہیں جذباتی سہارے کی ضرورت ہے۔ ان کی بہن ساتھ ہوگی تو وہ سنبھل جائیں گی۔ ورنہ بہت خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

اس کی بات ٹھیک تھی مگر حاکم کا دل نہیں مان رہا تھا کہ تاجور اس کے گھر سے دور جائے۔ بہادر کے اصرار پر لب بھینچ کر رہ گیا تھا۔

"میرا بچہ......" تاجور نے مزاحمت کی تھی۔ شکیلہ نے ایک نہیں سنی۔

"وہ اس کا بھی بچہ ہے پالنے دو۔ بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے ہم نے حاکم کو......"

دستگیر اور شکیلہ تاجور کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وہ اسے اپنے گھر لے جانا چاہتے تھے مگر تاجور کے لب ہل اٹھے تھے۔

"اپنے گھر چلو شکیلہ۔"

"ہم اپنے گھر ہی جا رہے ہیں تاجور۔" اس نے محبت سے ہاتھ دبایا تھا۔

"تمہارے گھر نہیں...... ہمارے گھر۔" وہ پھر مدھم سا بولی تھی۔ شکیلہ کچھ سمجھ نہیں سکی۔

"ابا کے گھر......" اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ غیر متوقع تھے۔ انہیں اس وقت تاجور کی ذہنی حالت کا ٹھیک سے اندازہ ہوا تھا۔

سالوں بعد مولوی حیات کا چھاؤں جیسا وہ گھر کھولا گیا تھا۔ دستگیر نے ضرورت کی ہر چیز وہاں پہنچا دی تھی۔ دونوں بہنیں کچھ وقت کے لیے اس گھر کو آباد کر کے رہنے لگی تھیں۔ پرانے وقت میں پرانی یادوں کے دامن میں!

☆☆☆

ایک ماہ بعد تاجور اپنے گھر واپس آئی تو حاکم اور اس کے درمیان مزید دوریاں آ چکی تھیں۔ گو کہ مولوی حیات کے گھر وہ ننھے مظفر سے ملنے روزانہ آتا تھا۔ پھر بھی دونوں خاموش رہتے۔ مظفر سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے وہ چپ چاپ چلا جاتا۔ تاجور بھی اسی طرح خاموشی سے تکتی رہتی۔ لیکن یوں لگتا نہ وہ بول سکتی ہے نہ سن سکتی ہے۔

حاکم بہت مشکل آدمی تھا۔ وہ اندر سے جم گیا تھا۔ سب کچھ جیسے اندر ہی رہ گیا۔ تاجور سے ندامت، اس کی محبت، اس سے معافی سب کچھ ہی اندر ہی اندر پتھروں کا ڈھیر بن گیا۔

شکیلہ اس کو نہیں جانے دینا چاہتی تھی، حاکم کے کانوں میں ادھر ادھر سے سنی باتیں پڑتیں تو اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ عجیب سا رشتہ تھا دونوں میں، اتنی ناپسندیدگی کا کہ دونوں ہی نفرت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔

نیلم تاجور کو منت کر کے گھر لے آئی تھی۔ حالانکہ منت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تاجور تو گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ صبر کی حالت نہیں لگتی تھی۔ یہ کوئی اور ہی کیفیت تھی۔ نیلم حاکم سے خوب لڑی تھی۔ بار بار وہ اسے جتاتی کہ تاجور کی دوسری بہن کتنی خوش ہے۔ اس کا شوہر اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ مولوی حیات نے کتنا درست فیصلہ کیا تھا۔ حاکم کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ان دونوں کو یہاں سے غائب کر دے یا

خود اتنی دور چلا جائے کہ ان دونوں کا ذکر اسے کبھی نہ سننا پڑے۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا چلا گیا تھا۔ ان کی زندگی کے مزید کچھ سال جو سنہری تھے اور اتنی قیمتی بھی کہ کبھی نہ واپس آنے والے..... ان کی آنگن میں پھول کھلاتے ہوئے بیتتے چلے گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضروریات پوری کر رہے تھے مگر دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے بے ضرر ہوتا چلا گیا تھا۔ جس میں نہ خوشی تھی..... نہ گرم جوشی فقط خاموشی۔

یونہی ایک دن بیٹھے بیٹھے نیلم کو نجانے کیا خیال آیا تھا کہ اس نے تاجور سے وہ سوال پوچھ لیا تھا جس نے حاکم کے قدم پل بھر کے لیے ساکت کر دیے تھے۔ حاکم جانتا تھا وہ ایک اچھا شوہر نہیں ہے۔ نہ ہی وہ اپنی بیوی کو ایسی زندگی دے سکا ہے جس سے وہ اس کے ساتھ پر فخر کرے۔ پھر بھی اس کے دل میں ایک خواہش نے شدت سے سر اٹھایا تھا۔

نیلم ان دنوں ماں بننے والی تھی اور اپنے شوہر کے لاڈ نے اس کی زندگی باغ و بہار کر دی تھی۔ نجانے کیا سوچ کر اس نے پوچھ لیا تھا۔

"ایک شادی شدہ عورت کی زندگی اس کے شوہر کے سلوک اور رویے سے بندھ کر رہ جاتی ہے۔ اگر آپ کا جیون ساتھی اچھا ہو تو وقت انسان کو کبھی بوڑھا نہیں کر سکتا۔" نیلم کی آنکھیں محبت کے احساس سے جگمگا رہی تھیں۔ تاجور نے چونک کر دیکھا۔ پھر پھیکا سا مسکرا دی۔

"ماشاءاللہ!" اس نے یوں کہا گویا وہ کہہ رہی ہے تو ٹھیک ہی کہتی ہوگی۔ اس کے جواب میں اس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو۔

"تاجور! تم سے ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں۔" تاجور نے اجازت دی تھی۔

"جانتی ہوں حاکم بھائی بہت زیادتیاں کرتے ہیں۔ مگر تم بھی دل میں شکوے پال کر چپ کی چادر اوڑھ لیتی ہو، کیا تمہارا دل نہیں کرتا کہ....."

"میں اس بارے میں نہیں سوچتی نیلم۔" تاجور نے بالکل معمولی لہجے میں اس کی بات کاٹ دی تھی۔ نیلم اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

"تم اپنی بہن کو دیکھتی ہوگی تو سوچتی ہوگی کہ تمہاری زندگی میں بھی اتنی خوشیاں ہوتیں..... کاش میرا بھائی بھی تمہارے لیے ویسا ہوتا ہے ناں؟"

حاکم اس بات پر جہاں تھا وہیں رک گیا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوئی تھی کہ تاجور کہے وہ اپنی زندگی میں خوش ہے۔ کاش وہ کچھ حاکم کے حق میں اچھا بول دے۔

"خوشیوں پر تمہارا بھی حق ہے۔"

حاکم کا دل لحظہ بھر کو تھم گیا تھا۔

"نہیں نیلم!" تاجور نے گہری سانس لی تھی۔ "میں ایسی خواہش نہیں کر سکتی۔ اس ڈر سے کہ اگر میری حسرت میری بہن کے لیے نظر بن گئی تو؟" میں خود کسی بھی حالات سے گزر سکتی ہوں، مگر اپنی بہن کو کانٹا لگتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ میں انہی سے تو آکسیجن کشید کرتی ہوں۔ میری زندگی میں میری اولاد اور ان دو رشتوں کے علاوہ اور کیا ہے؟"

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بتا رہی تھی۔ اور شاید وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ مگر حاکم وہ یہ جواب نہیں سننا چاہتا تھا۔

اس کا دل ٹوٹا تھا یا زعم..... مگر ایک اور معصوم انسان اس کے زیر عتاب آ گیا تھا۔

☆☆☆

حال:

سیمی کی غمگین صورت اس خاتون کی نگاہوں کے حصار میں تھی جس کا اپنا چہرہ مارے کرب کے سرخ ہو رہا تھا۔ سیمی اپنی ماں کے حالات سے واقف تھی کیونکہ وہی تاجور کے سب سے قریب رہی تھی۔ پھر بھی خالہ سے سن کر جیسے وہ از سر نو اس آگ کے دریا میں جل رہی تھی۔

"آپ نے خضر کو ہمارے بارے میں کبھی نہیں بتایا؟" سیمی نم آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ یہ کوئی

شکوہ نہیں تھا۔ نہ دکھ..... شکیلہ نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"نہیں..... کبھی نہیں۔"

"کیوں خالہ! آپ اتنی محبت کرتی ہیں ماں سے..... کیا آپ کا دل نہیں کرتا تھا۔"

"ہماری زندگی ہمارے دل کے مطابق چلی کب ہے۔" وہ افسردہ سا مسکرا دیں۔

"میں نے یہ بات ہمیشہ خضر اور حنا سے چھپائی خضر تو اب بھی لاعلم ہے..... کیونکہ۔"

"کیونکہ؟" سیمی نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"ایک وقت ایسا آیا کہ میری اندر سے ساری بہادری، ساری ہمت نکل گئی۔ یہ خوشی یا مرضی کا فیصلہ نہیں تھا۔ میں ایک چیز کے زیر اثر آ گئی۔ خوف شدید خوف میں بہت ڈر گئی تھی سیمی....." کہتے ہوئے شکیلہ جیسے اب بھی خوف کے سارے جہاں کا سفر کر آئی تھیں۔

☆☆☆

ماضی:

یہ باسی صبح کا منظر تھا۔ بچوں کے اسکول پہنچنے کا وقت ایسے ہی ایک سنہری اور خوب صورت منظر کا حصہ وہ دونوں بچے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کی سر پر چوٹی بنائے اور باقی ترتیب سے بال ماتھے پر پھیلے تھے۔ وہ کیوٹ سی بچی سیمی تھی جس کے مسکرانے پر گالوں میں گڑھے پڑتے تھے۔

اور اس کے ساتھ کھڑا ہلکے بھورے بالوں والا بچہ خضر تھا جس کی ہنسی سے روشن آنکھیں اور بڑی بڑی ہو رہی تھیں۔ سیمی کے ہاتھ میں پھولا ہوا غبارہ تھا جو خضر اس سے لینا چاہ رہا تھا۔ سیمی بار بار ہاتھ پیچھے کرتی۔ پھر وہ غبارہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ خضر نے فوراً اسے اٹھایا اور اس ڈر سے کہ سیمی اس سے چھین نہ لے مضبوطی سے دونوں ہاتھ میں جکڑا۔ غبارہ ٹھاہ کی آواز کے ساتھ پھٹ گیا تھا۔ خضر ڈر گیا۔ اگلے ہی پل دونوں کی کھنک دار ہنسی پوری گلی میں گونج رہی تھی۔ اب ایک ٹکڑا خضر کے ہاتھ میں تھا دوسرا سیمی کے..... اور دونوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

حاکم کی نظر اس منظر پر پڑ گئی۔ اس کی بھنویں اکٹھی ہوئیں۔ خضر سیمی کی چٹیا پر غبارے کا ٹکڑا لپیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دونوں معصوم سے بچے تھے مگر شکیلہ اور دستگیر کی اولاد کو دیکھ کر حاکم کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

"کیا کر رہے ہو تم دونوں؟" حاکم کے سر پر پہنچ کر چلانے پر دونوں خوف سے اچھل پڑے تھے۔

وہ دونوں پرائمری سکول کی بالکل ابتدائی کلاس میں داخل ہوئے تھے اور اسکول حاکم کے گھر کے نزدیک تھا۔ ان کی اوطاق سے ٹھہر کر دیکھو تو سامنے نظر آتا ہوا۔

"بابا....." سیمی نے باپ کو دیکھ کر اٹکا سانس لیا تھا۔ گویا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

"ڈر رہا ہے تم سے؟" حاکم نے سر سے پیر تک دھلے دھلائے، صاف ستھرے اور خوب صورت کپڑوں میں ملبوس خضر کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ جس کے کپڑے، جوتے سے لے کر بیگ تک مہنگا اور توجہ سے خریدا لگ رہا تھا۔ شکل و صورت اور حلیے پر ماں باپ کی خاص توجہ سے وہ گاؤں کے عام بچوں جیسا نہیں دکھتا تھا۔

"اس نے میرا غبارہ پھاڑ دیا۔" سیمی نے منہ بسور کر باپ سے شکایت لگائی۔

وہ دونوں اکثر کلاس میں بھی جگہ کا ایشو بنا کر لڑ پڑتے تھے۔ سیمی اس کو ڈانٹ پڑوانا چاہتی تھی۔

"یہ جھوٹ بولتی ہے۔ یہ مجھے دے نہیں رہی تھی۔" خضر نے انگلی ہلاتے ہوئے اس سے زیادہ منہ بنایا۔ حاکم نے سختی سے جھڑکا۔

"یہ جھوٹ نہیں بولتی، جھوٹے تم ہو۔ پھر بکواس کرتے ہو۔ تمہارے ماں باپ کہاں مر گئے ہیں جو دوسروں کی چیزیں چھینتے ہو۔"

حاکم کی غصیلی آواز سے یمی بھی دبک کر رہ گئی تھی۔ مگر خضر کی آنکھوں میں خفگی اترنے لگی۔

"آپ بہت گندے ہیں۔ گندی بچی، گندے بابا۔" وہ ضدی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ یمی کو گھورتے ہوئے حاکم کو پتنگے لگ گئے۔

"دفع ہو جاؤ تم یہاں سے......" اس نے خضر کو دھکا دیا تھا۔ خضر گرتے گرتے بچا۔ حاکم یمی کی انگلی تھامے جانے لگا تھا جب خضر پیچھے سے چلایا تھا۔

"میں اپنے بابا کو بتاؤں گا۔ آپ واقعی بہت گندے والے انکل ہیں۔ میرے بابا کسی سے ایسے بات نہیں کرتے۔ وہ بہت اچھے ہیں، آپ بہت برے۔"

حاکم کو یہ بابا کا قصیدہ برا لگا تھا یا شاید تاجور کی باتیں ذہن میں آئی تھیں کہ وہ دانت پیستا ہوا مڑا اور خضر کا بازو پکڑا۔ ایک لمحے کو بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ وہ اپنا زور ایک معصوم سے بچے پر آزما رہا ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے بازو سے خضر کو دور جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔

خضر حاکم کی پوری قوت سے اچھالنے پر اڑتا ہوا کئی قدم آگے گیا تھا۔ ایک پل کو حاکم کا دل بھی ڈوبا۔ خضر کی دلخراش اور فلک شگاف چیخوں نے آس پاس کے کئی گھروں کو دہلا دیا تھا۔ کچھ قدموں کے فاصلے پر تعمیراتی کام کے لیے پڑی اینٹوں کے ڈھیر پر خضر جا ٹکرایا تھا۔ جب تک اس کے اچھے بابا پہنچے۔ خضر کے دو دانت، ایک بازو ٹوٹ چکا تھا۔ منہ خون سے تر بتر۔

☆☆☆

حال:

یمی کی روح کانپ اٹھی تھی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ سینے پر رکھ کر مٹھی بھینچ لی تھی۔ اس کا دل لرز رہا تھا، سامنے بیٹھی ماں نجانے کس دل سے وہ منظر بیان کر رہی تھی۔

"حاکم نے اتنی مہربانی کی کہ خضر کی فوراً پٹی کروا دی۔ میری کائنات ہل گئی تھی۔ مجھے لگا حاکم میرے بچے کو مار ڈالے گا۔ جب دستگیر خضر کو لے آئے تو میں زمین پر گر کر روتی رہی تھی۔ خضر درد سے رات دن چیختا تھا میرا بچہ تڑپتا رہتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے، پٹی اس کی نازک جلد کو گلانے لگتی تھی۔"

وہ اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھیں۔ یمی کا دل درد سے پھٹ رہا تھا۔ وہ جاں کنی کے عالم سے گزر رہی تھی۔ خضر جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے بلک بلک کر رو رہا تھا۔

"میرے دل سے حاکم کے لیے شدید بددعا نکلتی تھی۔ مگر بددعا کس کو دیتی۔ حاکم کو، اپنی بہن کے گھر کو یا ان بچوں کے باپ کو جو میری بہن کی اولاد تھی۔"

"ایم سوری!" یمی دبی دبی سسکیاں لینے لگی تھی۔ شکیلہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر اونچا کیا۔

"میں بہت خوف زدہ ہوگئی تھی یمی! تم ایک ماں کا ڈر نہیں سمجھ سکتیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر خضر کو دیکھتی تھی۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے بچوں پر حاکم کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیں گے۔ میں خضر اور حنا کو لے کر اپنی نند کے گھر رہنے آ گئی اور ان کی اسکولنگ شروع کر دی۔ دستگیر کے لیے مستقل شہر رہائش اختیار کرنا مشکل تھا۔ وہ آتے جاتے رہتے اور میں بھی...... جب حنا اور خضر اپنی پھپھو کے عادی ہو گئے تب میں نے جانا کم کر دیا تھا۔"

"ہاشم بھائی کی ماں؟" یمی نے بھیگی آواز میں پوچھا۔

"ہاں! بعد میں زری آپا نے اپنے بیٹے کے لیے حنا کو مانگ لیا تھا۔ دونوں بچوں کی اپنی بھی پسند تھی۔ دستگیر ہاشم کو بہت عزیز رکھتے ہیں بالکل خضر کی طرح۔ لیکن یمی، میرے بچوں نے زیادہ وقت مجھ سے دور ہی گزارا۔ صرف حاکم کی وجہ سے۔"

"میں نے اس لیے ہمیشہ ان سے یہ بات چھپائی۔ میں بتا دیتی تو وہ بنا کسی خطرے کی پروا کیے اپنی خالہ سے ملنے کو تیار رہتے۔ ہر ممکن طریقہ آزماتے، کیونکہ یہ عمر ہوتی ہی جوشیلی ہے۔ کچھ بھی کر گزرنے کی دھن۔ جس طرح تم تجسس کے ہاتھوں مجھے دیکھنے میرے گھر تک چلی آئی تھیں۔ میں نہیں چاہتی تھی خضر حاکم کے روبرو ہو۔ جانتی ہو خضر اپنا ٹوٹا بازو آج تک ایک عام انسان کی طرح پورا سیدھا نہیں کر سکتا۔ اس کا بایاں بازو ایک حد تک اوپر جاتا ہے۔"

یمی سانس نہیں لے سکی۔ وہ اپنے سارے دکھ یمی کو سنا رہی تھیں۔ وہ دکھ جیسے وہ تاجور کو سنا رہی ہوں۔ یمی دم بخود سی بیٹھی تھی۔

"آپ نے اچھا کیا، نہیں بتایا۔ میں تو آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتی۔"

یمی کو وہ واقعی حق بجانب لگ رہی تھیں۔ وہ ان سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

کتنا کچھ کیا تھا اس کے باپ نے...... اس کے باوجود سب کتنے اچھے تھے اس کے ساتھ اور وہ ماں بیٹے کا دل دکھانے کا کارن بن گئی تھی۔

"ہماری قسمت دیکھیں، جس انسان سے آپ خضر کو زندگی بھر بچاتی رہیں اسی انسان کی بیٹی سے خضر کا نکاح کر دیا...... ایک بار پھر دشمنی پال لی خالہ!"

"تم میری تاجور کی بیٹی ہو۔ میرا دل ہو، میرا جگر...... مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میں تم دونوں پر آنچ نہیں آنے دوں گی میری جان...... مگر آج یہ منظر دیکھ کر......" وہ تاسف سے کہتے ہوئے چپ ہو گئی تھیں۔

یمی نے قدرے بے چینی سے ان کی تسلی کرائی تھی۔

"خالہ! آپ خضر سے ناراض نہ ہوں، شروعات میں نے کی تھی...... وہ تو بہت اچھے ہیں میرا یقین کریں، پلیز۔"

"جانتی ہوں!" وہ پھیکا سا مسکرائیں۔ "تم بھی اپنی ماں کی بیٹی ہو مجھ سے چھپاؤ گی اپنے شوہر کی باتیں...... مگر میں خضر کی اس حرکت کو نظر انداز نہیں کروں گی۔"

"نہیں۔ میں ان کی طرف داری نہیں کر رہی حقیقت بتا رہی ہوں۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ میں نے سخت الفاظ استعمال کر کے انہیں مشتعل کر دیا۔"

"میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہوں یمی!" انہوں نے اچانک یمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے بہت پہلے یہ باتیں کلیئر کر دینی چاہیے تھیں۔ لیکن مزید دیر نہیں کروں گی...... خضر نے تمہاری چادر تمہارے گھر نہیں پہنچائی تھی یمی۔ وہ اس بات سے بالکل لاعلم ہے، ایسی گری ہوئی حرکت وہ کبھی نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے یہ باتیں سنی تھیں۔ اس لیے وہ پورے یقین کے ساتھ بول رہی تھیں۔ یمی کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر ابھرا۔

"مطلب؟"

"تاجور نے بھی یہ بات بتائی تھی مجھے۔ افراتفری میں بس نکاح ہوا میں خضر سے بھی نہ تصدیق کر سکی۔ مگر بنا تصدیق کے مجھے یقین تھا خضر پر...... تمہاری چادر نگار نے پہنچائی تمہاری تائی یمی...... وہ چادر اسی نے اٹھائی تھی۔ خضر کی تمنائی تھی وہ، اسی حسد میں اس نے یہ کیا۔ میں نے سارے معاملے پر غور کیا تو مجھے شک گزرا...... اور نگار سے پوچھنے پر اس نے اعتراف بھی کر لیا تھا۔"

یمی منہ کھولے ان سے یہ نئی داستان سن رہی تھی۔ آج ایک ایک کر کے بدگمانیوں کے سارے پردے سرکتے جا رہے تھے۔ دل صاف شفاف اور سچائیوں کی روشنی سے پُررونق ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

خضر بالوں میں انگلیاں پھنسائے بیٹھا تھا۔ حنا نے اس کے زخمی انگوٹھے پر مرہم لگا دیا تھا۔ پھر اسے پانی کا ٹھنڈا گلاس تھمایا۔

"کوئی بات نہیں خضر! میاں بیوی کے رشتے

نہیں یہ تو چلتا ہے۔ تم، ہاشم اور مجھے آئیڈیل کپل کہتے ہو مگر ہم دونوں بھی اکثر الجھ پڑتے ہیں۔ رشتہ نیا نیا ہو تو اعتماد بنانے اور سنبھالنے میں اور بھی محنت لگتی ہے۔" حنا نے اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا تھا۔ مظفر نے سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا۔

"تم نے بھی اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔ مجھے تو اماں جان پر حیرت ہے، صرف ان کی بہن نہیں...... ایک پوری یمیلی ہے ان کی۔ پھر بھی انہوں نے ساری عمر چھپا کر رکھا ہم سے۔" وہ ابھی تک بے یقینی کی فضا میں جھول رہا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ان کے ساتھ بھی ڈرامائی سچویشن پیش آسکتی ہے۔

"مجھے اماں جان نے بتانے سے منع کیا تھا۔ ان کی بھانجی سمجھ کر خود پر جبر کرکے سمجھوتا نہ کرو۔ یہ ان کی سوچ تھی۔" وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ "یمی بھی یہ سب جانتی ہے۔"

"اس سے تو کوئی توقع کرنا فضول ہے۔ سب کچھ جان بوجھ کر میری لاعلمی پر لطف لیتی ہے۔" وہ نروٹھے پن سے بڑبڑایا تھا۔ "پہلے کون سا کوئی بات بتائی تھی، جو یہ بتا دیتی۔"

حنا اس کی بڑبڑاہٹ پر بمشکل ہنسی دبا پائی تھی۔

"لیکن یار! اس سارے میں اماں جو ناراض ہوگئیں۔" مظفر کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

"ان کی فکر نہ کرو، یمی کو منالو، وہ تو خود بخود مان جائیں گی۔" حنا نے چٹکی بجائی۔

"مائیں مان جاتی ہیں، بیویاں نہیں مانتیں۔" وہ اٹھ کر چکر کاٹنے لگا۔

"بیویاں؟" حنا نے خاصا لمبا کھینچ کر آنکھیں نکالی تھیں۔ "یمی سن نہ لے کہیں......"

"اُفوہ! تم بھی یار......" وہ جھنجلا گیا۔

"جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔" حنا مزے سے بولی۔

"ٹھیک ہے، منالوں گا اس کو...... مگر سنو! یہ بات اس کو مت بتانا۔ ورنہ بات بات پر بلیک میل کرے گی۔" مظفر نے رازداری سے سمجھایا تھا۔ حنا کی ہنسی چھوٹی۔

"ماں کی بھانجی ہونے کا نقصان...... احتیاط سے رہنا مسٹر مظفر۔" حنا نے یمی کے انداز میں چڑایا۔

"ویسے مت بھولو کہ خالہ بھانجی کا ساس بہو بننے کے بعد، اکثر حالات جنگ کا منظر پیش کرتے ہیں۔ بس تھوڑی سی سیاست......" مظفر کی شرارت پر دونوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔

"ان تلوں میں تیل نہیں اے خوش فہم!" حنا نے انگوٹھا لہرا دیا تھا۔

☆☆☆

"میرے گھر میں سب کیسے ہیں خالہ؟" وہ دل میں بار بار امڈتا سوال لبوں پر لے آئی تھی۔ شکیلہ نے ایک بار اس کی پلکوں پر چمکتے سکون کو دیکھا تھا۔ ان کی پلکیں ایک پل کو لرز دی تھیں۔

"مجھے وہ بہت یاد آتی ہیں۔" یمی رو دی تھی۔

"سب ٹھیک...... سب بہت اچھے ہیں۔ ویسے ہی جیسے تم چھوڑ آئی تھیں۔ تمہاری ماں تمہیں یاد کرتی ہوگی مگر اس تسلی کے ساتھ کہ تم خوش ہوگی۔"

"مجھے وہ بہت یاد آتی ہیں۔" یمی رو دی تھی۔

"اب تو سب کچھ ٹھیک ہونے کا وقت آیا ہے میری جان...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مستقبل میں ہماری اولادیں ہمیں ایک کردیں گی۔"

یمی ان کی بات پر خاموش ہوکر رہ گئی تھی۔ شکیلہ نے والہانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچا۔ پھر انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"مظفر کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گی یمی...... مجھ سے وعدہ کرو۔" وہ یمی کے دونوں ہاتھ تھامے التجا کررہی تھیں۔ وہ پہلے سے مظفر کے ساتھ تھی، وہ انہیں ایک نئے وعدے میں باندھنا چاہ رہی تھیں۔

"وعدہ کرو...... دل سے، ایمانداری کے ساتھ۔" وہ منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں جلتی بجھتی آس کی لو......

"میں وعدہ کرتی ہوں خالہ۔" یمی نے ان کی گرفت سے ہاتھ نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھا۔ "اب میں یہ رشتہ نبھاؤں گی۔ سارے خدشے سارے گمان ساری غلط فہمیاں بھول کر...... میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ اپنی رضا سے...... دل کی خوشی کے ساتھ۔ زندگی کا کیسا بھی موڑ آئے۔ وقت آنے پر دیکھ لیں گے......" یمی نم آنکھوں سے مسکرائی۔ اس کا دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا۔

شکیلہ خوشی کی شدت سے بار بار یمی کے ہاتھ چومتی تھیں اور پیشانی پر بوسہ دیتی تھیں۔

یمی کے ساتھ زندگی میں یہ پہلی بار ہوا کہ وہ ہر خوف، ہر خطرے اور ہر انجام سے بے نیاز ہوگئی تھی۔ اس کے ذہن نے ہر بری چیز فراموش کردی۔ ہر سوچ جھٹک دی۔ مظفر کو قبول کرتے ہوئے وہ باقی سب بھول گئی تھی...... سب اللہ کے سپرد۔

☆☆☆

گورنمنٹ ہاسپٹل میں خواری اٹھانے پڑے گی، یہ اسے اندازہ تھا مگر اس قدر شدید اٹھانے پڑے گی اس کے لیے ثانیہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ گھر سے وہ اگر تیار ہوکر نہیں آئی تھی تو یہاں آکر اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے ذہنی و جسمانی مشقت سے گزرنا پڑے گا، اس لیے اسے اپنے اندر از سر نو ہمت جمع کرنی پڑے گی۔ شام تک کرم الٰہی کو مردانہ وارڈ میں بستر ملنے تک وہ تھکن سے چور اور بھوک پیاس سے نڈھال ہوچکی تھی۔ کرم الٰہی چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا۔ دو قدم پر ہانپ جاتا تھا...... ثانیہ کو معلوم نہیں تھا کہ وہیل چیئر یا اسٹریچر کہاں سے ملے گا۔ کیونکہ بہرحال وہ اسے اپنے کندھے پر اٹھانے سے قاصر تھی۔ اسے سرکاری اسپتالوں کے نظام معلوم نہیں تھے۔ اس نے اسپتال کے احاطے میں ایمرجنسی وارڈ کے باہر کچھ وہیل چیئرز اور اسٹریچر پڑے دیکھے۔ مگر اس کے طلب کرنے پر وہ اسے دینے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔

"میرے ساتھ پیشنٹ ہے بزرگ۔ پلیز، مجھے اس کی ضرورت ہے۔" وہ منت کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ مگر انہوں نے اس کی درخواست کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔

وہ بغیر آئی ڈی کارڈ کے چیئر دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ یہ ان کے رولز میں شامل تھا، اسٹریچر یا وہیل چیئر کے لیے ان کے پاس آئی ڈی کارڈ امانت رکھوانا تھا، تاکہ وہ وہیل چیئر انہیں واپس بھی کی جائے...... اور اپنا کارڈ واپس لیا جائے۔ ثانیہ کے پاس اپنا کارڈ نہیں تھا۔ اس نے کرم الٰہی سے پوچھا...... یہ پوچھنا بھی بے کار ہی تھا۔ ایسی حالت میں اسے کہاں یاد رہا ہوگا کہ اپنا شناختی کارڈ اپنے پاس رکھے۔ اس وقت اسے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے دوبارہ ہمت کرکے ان سے بات کی کہ وہ بہت دور سے آئی ہے...... ان کی پرانی وہیل چیئر لے کر وہ کہاں بھاگے گی۔ اس وقت اسے کرم الٰہی کو ایڈمٹ کرانے کے لیے جگہ جگہ جانا ہے...... چیک اپ کروانا ہے، وہ اسے ایک جگہ چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔

اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے بادل ناخواستہ دوسری مرتبہ وہ مان گئے تھے۔ ثانیہ کرم الٰہی کو لیے ایک جگہ سے دوسری اور پھر تیسری جگہ گئی۔ ابتداء میں چیک اپ کے بعد ٹیسٹ بتائے گئے۔ ہاسپٹل کی اپنی لیبارٹری تھی مگر تیسری منزل پر...... ثانیہ نے اس کے بلڈ سیمپلز لیے اور کرم الٰہی کو درختوں کی چھاؤں میں بٹھا کر لیبارٹری میں جمع کروائے تھے۔

دوسرا صبر آزما لمحہ تھا رزلٹس آنے کا...... تین بجے اسے رپورٹس ملیں تو وہ دوبارہ چیک اپ کے لیے گئی تھی۔ اب کی بار اسے کچھ میڈیسنز کے ساتھ داخلہ فارم بنوانے کے لیے کہا گیا تھا۔

پچاس روپے کا ایڈمیشن فارم بنواتے بنواتے اس کی ٹانگیں شل ہوگئی تھیں۔ پانچ بجے بالآخر انہیں بیڈ نمبر دو ملا جو وارڈ کے دروازے کے قریب تھا اور کھڑکی کی راہ داری میں کھلی تھی۔ نرس نے کرم الٰہی کو اوپر لٹانے میں مدد دی اور اسے دو تین انجکشن دیے

کے بعد ڈرپ لگادی تھی۔ کرم الٰہی اب آرام سے آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔

ثانیہ نے نظر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ صد شکر کہ پنکھے ٹھیک کام کر رہے تھے اور گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا...... اس نے بیڈ نمبر تین کی خاتون سے پانی کا پوچھا جس نے اسے باہر لگے ٹھنڈے پانی کے فلٹر کے بارے میں بتایا، اور یہ بھی کہ وہ جا ہی رہی ہے تو ان کی بوتل بھی بھر لائے۔

ڈاکٹر نے فی الحال کوئی تشویش ناک بات نہیں بتائی تھی...... شاید تین چار دن ایڈمٹ رکھنے کے بعد وہ اس کی صحت ٹھیک کر دیں۔ ثانیہ حوصلہ افزا سوچتی ہوئی باہر فضا میں سانس لینے نکل آئی۔ کرم الٰہی کے اٹھنے تک پانی کے ساتھ کھانے کی بھی تلاش کرنی تھی۔

☆☆☆

جب سے تم نے مجھے بتایا ہے
کہ تم
بحری جہازوں کے سینوں پہ لہرانے والی
جل پری ہو
میں سمندر بن گیا ہوں

محبت امین مسافر کی نظموں سے نکل کر ان کے وجود میں سرائیت کر گئی ہے۔ لفظ لفظ سے رومانیت ان پر جانثار ہوئی...... اور محبت ان کے گرد دیوانہ وار رقصم...... ان پر کیف لہروں کی مانند جو اپنے جشن میں چاروں سمت گھومتی ہیں اور اپنا آپ نچھاور کر دیتی ہیں۔ یہ جگنوؤں کی ویسی ہی بارات اتر رہی تھی جو سفید چمکتے اور سنہری لو دیتے تھے۔ جل پری آب سے نکل آئی تھی...... سمندر دیوتا سے ٹانگیں مانگ کر، اور دل قربان کر کے...... جل پری اپنا سارا حسن سیاہ بالوں میں چھپائے میرس پر اپنے محبوب کے روبرو آ گئی تھی۔

موسم رومان پرور تھا، بادلوں نے جیسے رم جھم کے گیت گانے شروع کر دیے تھے۔ یمی کے کھلے ریشمی بال ہوا کے دوش پر اڑ رہے تھے۔ خضر نے ایک نگاہ اٹھائی اور سو نگاہوں سے قربان ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سبز باریک سی ٹہنی والا کھلا ہوا گلاب تھا۔ اس نے وہ گلاب اس جل پری سے چھپایا تھا۔

"جب سے مجھے معلوم ہوا تم گیت ہو میں ایک دھن بن گیا ہوں۔"

خضر نے اس شرمندہ شرمندہ سی لڑکی کو کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا تھا...... محبت کا ایک ہی اصول ہے۔ ظاہر ہو جائے، تو باقی سب فضول ہے۔ نہ معافی، تلافی۔ نہ گلے شکوے...... سب کچھ دہرا کر کیوں نئے حالات پیدا کیے جائیں؟ کچھ لمحے ہی سہی...... پرانی باتوں میں کیوں ضائع کیے جائیں۔

خضر نے سب بھول کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ غضب کی رات تھی۔ ایسی سہانی رات جو شاید دوبارہ کبھی نہ آتی۔

"خضر......" یمی کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے لب کپکپائے۔ اس کی لانبی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان پر خضر کا دل اٹک رہا تھا۔

"پکارو! میرا نام تمہارے منہ سے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"میں نے بہت بار تمہارا دل دکھایا ہے...... میں سمجھتی تھی تم نے میرے ساتھ......"

"تم نے مجھ سے جواب کیوں نہیں مانگا یمی؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اس سے پہلے تم نے میرے رویے سے کچھ محسوس نہیں کیا...... میرے لہجے سے، میری باتوں سے۔ تمہیں کیوں لگتا رہا کہ میں نے اتنی گری ہوئی حرکت کی ہوگی۔"

"میں پاگل تھی نا۔" یمی گہری اداسی سے بولی تھی۔ آسمان مکمل تاریک تھا...... بادلوں سے ڈھکا ہوا۔ ستاروں کی چھاؤں نہیں تھی...... مگر خضر کی آنکھوں میں ستاروں کا پورا آسمان جاگ رہا تھا۔

"میں تمہیں سمجھ نہیں سکی خضر! میں اعتبار نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

خضر نے اس کے اڑتے بالوں کو ہاتھ بڑھا کر کان کے پیچھے سیٹ کیا تھا۔ ہلکے سے مسکرایا۔

"تمہیں صرف کہانیوں میں ہی نہیں اصل زندگی میں بھی سپنس رکھنا پسند ہے۔ تم نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ ہم دونوں میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔" وہ یمی سے مدھم آواز، نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس یک رو ہوا کے جیسا لہجہ جو یمی کے گرد رقص کر رہی تھی۔

"میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ہم دونوں کے نانا کا ایک جیسا نام کیوں ہے۔"

خضر کی بات پر یمی ڈھیروں سے ہنس دی تھی۔ اسے یاد کر کے ہنسی آنے لگی۔

"میں کیوں بتاتی۔"

"میں نے سب بوجھ لیا۔"

"بہت دیر نہیں ہوئی؟" اس نے جتایا۔

"ابھی نہیں ہوئی۔" وہ دو قدم آگے آتے ہوئے اس کے مزید قریب آیا، اور سرخ گلاب اس کے بالوں میں اٹکا دیا تھا۔

یمی نے مسکراہٹ لبوں میں چھپاتے ہوئے خضر کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں اس کی صورت روشن ہو رہی تھی۔ ہزار جذبوں کے رنگ جھلملا رہے تھے۔

"تم اتنی حسین کیسے ہو؟" وہ مبہوت سا کئی پل اس کو تکتا رہ گیا تھا......

"ہم دونوں کا ملنا پہلے سے طے تھا۔ کتنی خوب صورتی سے قدرت نے ہمارے دل جوڑے ہیں یمی...... میرا تمہارے وجود سے محبت کرنا، تمہارے لفظوں کی خوشبو کی چاہ...... تمہارا میرا رشتہ۔ ساری کہانی خوب صورت ہے۔" خضر نے اس کی گردن کے گرد اپنے بازو حائل کیے تھے اور وہ مخمور سا آنکھیں تکا کر رہا تھا۔ یمی اس کو بنا پلکیں جھپکے دیکھے گئی۔

"ایک وعدہ کرو گی؟" ان دونوں کے بالوں پر بارش کی بوندیں اٹکنے لگی تھیں۔ خضر نے ہتھیلی پھیلا دی۔

"کیا؟"

"ثانیہ کو دوبارہ میری محبوبہ نہ کہنا۔" وہ کچھ سنجیدگی سے کچھ شرارت سے آگے بڑھائے وعدہ لے رہا تھا۔ یمی کی آنکھوں میں خفگی سمٹی۔

"محبوبہ کو اور کیا کہوں گی۔" اس نے مصنوعی تیوریاں چڑھاتے ہوئے اپنے کندھوں سے خضر کے بازو جھٹکے۔

"وہ میری محبوبہ نہیں ہے، اب تو سمجھ جاؤ...... ورنہ یہ تکرار ہوتی رہے گی۔ پھر تمہیں کیا کہوں گا؟"

خضر نے سرعت سے اس کا ہاتھ تھاما۔

وہ مائل بہ شرارت تھا...... دونوں دل ہی دل میں وقت تھم جانے کی خواہش کر رہے تھے۔ وقت حسین تھا...... ساتھ حسین تر......

"میں تو تمہاری بیوی ہوں بس، یہ لفظ کہنا بھی مت۔" یمی نے انگلی کھڑی کر کے وارننگ دی۔

خضر کا قہقہہ سنائی دیا تھا۔

"تو کیا بیوی محبوبہ نہیں ہو سکتی؟" وہ ہنسی کے درمیان بمشکل بولا تھا۔

"اس کا بہترین جواب تمہارے علاوہ اور کس کے پاس ہو سکتا ہے؟"

"اف!" خضر نے مٹھی بند کر کے دل کے مقام پر ٹھک سے بجائی جیسے یمی کی بات دل پر لگی ہو۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ ایک معروف رائٹر، جس کے لاکھوں پڑھنے والے ہیں...... اتنے رومانٹک موسم میں ٹیپکل بیویوں کی طرح طعنے دے رہی ہے۔"

اس کی بات پر یمی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکی تھی۔ اس کی کھنک دار ہنسی کئی لمحوں تک گونجتی رہی تھی......

"بیوی، بیوی ہوتی ہے خضر صاحب! ٹیپکل کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے ہنستے ہوئے اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کیے۔

"مجھے قبول کرنے کا شکریہ یمی! یہ تمہارا مجھ پر ایک اور احسان ہے۔" وہ جذبوں سے چور لہجے میں

بولا تھا۔ یسی نے سوال کیا۔
''اور پہلا احسان؟''
''مجھے معاف کرنے کا اور کسی دوسرے انسان کو اپنے شوہر سے منسوب نہ کرنے کا وعدہ کرنے کا۔''
''میں نے یہ وعدہ کب کیا؟'' وہ تیزی سے بولی۔
''تمہارے دل کی آواز میں نے سن لی۔'' خضر مزے سے بولا۔
''کتنے چالاک ہوگئے ہیں۔'' یسی گھورنے لگی تھی۔
''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں یسی! میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گا۔ ہر مشکل میں تمہارے ساتھ کھڑا رہوں گا...... کبھی تمہیں ہرٹ نہیں کروں گا۔''
''تم ناراض ہو کر بہت برے لگتے ہو خضر۔ تم ناراض مت ہوا کرو۔'' یسی کو اتنے دنوں کی اذیت یاد آ گئی تھی جو اسے اس کی بے اعتنائی کی صورت سہنی پڑی تھی۔
''تمہارے منانے کا منتظر تھا۔ لیکن تمہیں منانا نہیں آتا...... میں آئندہ تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا سویٹ ہارٹ۔'' خضر کا لہجہ لو دینے لگا تھا۔ اس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔ یسی کو شرم آنے لگی۔
''میں آئندہ تمہیں ناراض نہیں کروں گی۔'' اس نے دھیرے سے کہا تھا۔ خضر نے اسے آہستگی سے اپنے قریب کر لیا تھا۔
''اماں جان نے کہا تھا کہ ہمارا نکاح بھلے جن حالات میں ہو رہا ہو مگر زندگی میں ایک صحیح ہمسفر مل گئی ہے۔ آج میں بھی اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے تم سے بہترین اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ خضر اسے خود سے لگائے بول رہا تھا...... یسی کی دل کی دھڑکنیں جیسے اس کے دل سے ہو کر گزر رہی تھیں۔
''میں تمہیں ہر روز پہلے سے بڑھ کر چاہوں گا...... میری سنگت میں بتائے دنوں میں تمہیں کسی اور کی یاد نہیں ستائے گی۔ تم میری محبت کبھی بھول نہیں سکو گی...... یہاں تک کہ تم خود بھی مجھ سے محبت کرنے پر مجبور نہ ہو جاؤ......'' اس کے شہد آگیں لہجے کی میٹھی باتیں یسی کی سماعتوں میں رس گھول رہی تھیں...... آس پاس بارش کا شور بڑھ رہا تھا۔
''بارش...... تمہیں بارش پسند نہیں ہے نا یسی؟'' یسی کو اپنے حصار میں سمیٹے خضر کو اس کی بات یاد آئی تھی۔ یسی نے چہرہ اوپر اٹھایا...... خضر کا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔
''یہ بارش تمہارے ساتھ پسند ہے......''
ایک سرشار کرتی مسکراہٹ دونوں کے لبوں پر چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔
اس تاریک منظر میں کھلے آسماں تلے کھڑے وہ دو انسان، ایک وجود معلوم ہو رہے تھے...... یسی کا لمبا آنچل ہوا سے دور تک اڑ رہا تھا...... اس کی زلفیں بار بار خضر کے بازو سے لپٹتیں، اور چہرے کا طواف کرتی تھیں...... وہ جذبہ، جس سے زیادہ قیمتی دنیا میں کچھ نہیں...... ان دونوں پر نچھاور کر دیا گیا تھا۔ دنیا میں اور خوب صورت کچھ بھی نہیں تھا۔
ایک مکمل منظر...... زندگی مکمل تھی۔ دل مکمل تھے......
ایک خوب صورت رشتے کی خوب صورتی شروع ہو چکی تھی۔ مہکتی رات کی خوشبو اور رم جھم ان کے ارد گرد جھوم رہی تھی۔ وہ دونوں ہر چیز سے بے نیاز بارش کی پھوار اور قوس وقزح جیسے چاہت کے رنگوں میں بھیگ جا رہے تھے...... بھیگتے جا رہے تھے!

☆☆☆

شمائلہ دکھی دل کے ساتھ شمریز کو دیکھ رہی تھی، جس کی دنیا اس کے لیے جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ایک غلطی اس کے ساتھ اس کے اکلوتے بھائی کی دنیا بھی اجاڑ کر رکھ دے گی۔ اس کے دل میں پچھتاوا آہستہ آہستہ اپنے پنجے گاڑھنے لگا تھا۔ اور شمریز کی حالت تو اس کا دل چیر رہی تھی۔
''تم ثانیہ سے محبت کرتے تھے شمریز، تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔'' وہ افسردگی سے کہہ رہی تھی۔
شمریز کی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں اس بات پر پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی۔
''کرتا تھا نہیں شمائلہ! کرتا ہوں...... نجانے کب اور کیسے؟ مگر وہ میرے دل میں اتر گئی۔ وہ میری روح میں شامل ہو چکی ہے شمائلہ...... تم......'' وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا اور شمائلہ کے گھٹنوں پر رکھے ہاتھ تھام کر زمین پر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ ''امی بابا کو راضی کرو...... میری خاطر شمائلہ، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا...... وہ مجھ سے بات نہیں کرتی مجھ سے ناراض ہے میں نے جلد بازی اور غصے میں اسے......'' وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا تھا۔
شمائلہ نے اس کا چہرہ اوپر کیا۔
''بتاؤ شمریز! کیا تم نے؟''
''میں نے اسے کہا یسی جھوٹ بول رہی ہے۔ جس طرح میری محبت کا تم نے اپنی بہن کو نہیں بتایا اسی طرح اس نے بھی تمہیں نہیں بتایا ہو گا۔''
''پھر؟'' شمائلہ کے حلق میں پھانس اٹکا۔
''اس نے یسی کو بتایا ہوا تھا، یہی سوال اس نے مجھ سے کہا کہ کیا میں نے بھی تمہیں اس کے بارے میں بتایا ہے جو تم مجھے اپنے دل کی بات بتاتیں۔'' شمریز نے ایک دم نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اور شمائلہ بھونچکی رہ گئی تھی...... اسے لگا جیسے کسی نے اسے زوردار تماچا رسید کر دیا ہو۔
''شمریز......'' اس کے لبوں سے یہی نکل سکا تھا۔ دل ڈوب گیا تھا۔
''اسے لگتا ہے میں زندگی بھر اس کی عزت نہیں کر پاؤں گا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتی، میری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ جو شخص اس کے لیے اذیت سے دوچار ہے وہ سے کتنا عزیز رکھتا ہو گا۔'' اس کی آنکھیں بھر رہی تھیں۔ چہرہ گلابی پڑ رہا تھا۔ شمائلہ کا دل کوئی مٹھی میں جکڑ کر زور سے بھینچ رہا تھا۔
''شمریز! میری جان! تم، مجھے بابا جان ہم سب کو تکلیف دے رہے ہو...... تم ہم سب کے لیے بہت قیمتی ہو۔ اس حویلی کے وارث...... پلیز ایسا مت کرو۔'' اس کا دل کر رہا تھا کاش اس کے پاس کوئی ایسا جادو ہوتا جس سے اس کے بھائی کا دل تندرست ہو جاتا۔ ثانیہ کو اس کے دل سے کھرچ کر مٹا دیتا۔
''جب دل ہی سلامت نہ ہو تو میں اس پتھروں کی حویلی کا کیا کروں گا...... تم لوگ میری کیفیت نہیں سمجھ رہے۔ مجھے صرف اسی کو دیکھ کر زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ میری زندگی اس کے ساتھ جڑی ہے۔'' اس نے ناراضی سے شمائلہ کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔ وہ لڑکی اس کے لیے اتنی اہم ہو گئی تھی کہ وہ ان سب کو چھوڑنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔
''لیکن یہ کس طرح ممکن ہے...... وہ کسی اور کی بیوی ہے شمریز۔'' شمائلہ سختی سے چیخنا چاہتی تھی۔ اس کا احساس جرم اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی محبت چھیننے کی ذمہ دار تھی۔
''میں اس کا انتظار کروں گا۔ اسے اپنی محبت کا احساس دلاؤں گا...... وہ میری زندگی میں واپس ضرور آئے گی۔''
''مگر شمریز......''
''تم میرے جذبات نہیں سمجھ سکتیں۔'' وہ زخمی سا مسکرایا۔ ''تم نہیں سمجھو گی کہ کتنا مشکل ہوتا ہے لیکن...... میں اپنی بات سچ ثابت کر کے دکھاؤں گا۔'' شمریز پورے یقین سے کہتا ہوئے اس کے سامنے سے اٹھ گیا تھا۔
شمائلہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس کے احساسات سمجھ سکتی تھی...... ایک وہی تو سمجھ سکتی تھی۔ کمرے میں گھٹن کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ بے اختیار کھانستے ہوئے وہ چھاتی مسلتی گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ دماغ وزن کی شدت سے پھٹنے کو تھا۔

☆☆☆

اس دن اترنے والی صبح کا اجالا نئی نویلی دلہن

کے لبوں پر کھلنے والے تبسم کے جیسا گلابی تھا۔ آج جیسے ہر چیز بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔ بہت عام سی چیزیں بھی دلکش لگ رہی تھیں۔

یمی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ کئی لمحوں سے اپنی صورت تکتی ہوئی...... یہ اس کا اپنا چہرہ تھا، ہزاروں بار دیکھا ہوا۔ پھر بھی آج اسے اس چہرے پر ایسی چمک نظر آ رہی تھی جس سے اسے اپنا آپ بے حد حسین لگ رہا تھا۔ جانے یہ رفاقت کے کتنی اقسام کے پھول تھے جو اس کے گالوں پر کھل کر گلال بکھیر رہے تھے...... اپنے گیلے بالوں میں برش کرتے ہوئے اس نے مڑ کر بیڈ پر سوئے خضر پر ایک نظر ڈالی...... نیند میں اس کے چہرے پر معصومیت جھلک رہی تھی۔

یہ محبتوں سے مالا مال شخص اس کی قسمت تھا۔ وہ اپنی زندگی میں اس چیز کے لیے ترستی تھی...... ان محبتوں کے لیے جو وہ چاہتی تھی کہ اس کے گھر مرد اپنی عورتوں سے کریں۔ جس کے بغیر اس کے ماں باپ کی زندگی بیت گئی تھی...... اور جس کے بغیر اسے اپنی زندگی بھی ویسی لگتی۔ خضر کے لہجے میں اس کے لیے کتنی اپنائیت تھی...... اس کے اندر یمی کے لیے بے پناہ عزت۔ اور اپنی محبت پر گہرا یقین...... وہ اس کی زندگی کا پہلا مکمل مرد تھا، جو اپنے والدین سے لے کر اپنے جیون ساتھی کا فخر ہو سکتا تھا...... اس ایک رات میں اس نے یمی کو اپنے ہونے کا یقین دلا دیا تھا...... اپنے وجود کا یقین کہ وہ یمی کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ اور یمی اس کی زندگی میں کیا درجہ رکھتی ہے......
یمی کو سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس شخص کا ساتھ دے دیا تھا، جس کے ہاتھ میں یمی کا ہاتھ ہوتا تو پوری دنیا اس کے قدموں تلے آ جاتی...... اور زمین گلاب کی پنکھڑیوں سی ملائم...... پیروں کو سہلاتی ہوئی۔ مدہوش کرتی......

اس نے آج پہلی بار پوری چاہت سے خضر کا خریدا گیا ڈریس زیب تن کیا تھا۔ سفید لباس کا ہم رنگ دوپٹا جس کے باڈر پر سرخ رنگ کی پٹی تھی، اس کے کندھے سے نیچے تک پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ کسی ملکہ کی طرح بیٹھی تھی۔ پھر اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھایا اور ایک شربتی مسکان کے ساتھ لپ اسٹک اٹھائی تھی۔ مسکان میں ڈھلے لب ہلکے رنگوں میں رنگ کر اور بھی خوب صورت دکھنے لگے تھے۔

خضر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر نیم دراز ہوا۔ تو اس کی مختصر سی تیاری مکمل ہو چکی تھی...... کندھوں سے پھسلتا دوپٹا سنبھالتی وہ اٹھی۔

"اچھا ہوا آپ کی نیند پوری ہو گئی...... ورنہ میں جگانے والی تھی۔" وہ کہتی ہوئی سامنے آئی تھی۔

"ایکسکیوزمی!" خضر فوراً سیدھا ہوا پھر انگلی ہونٹوں پر رکھی۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" وہ تحیر سے پوچھ رہا تھا...... یمی ٹھٹکی۔

"میں......"

"پلیز جائیں یہاں سے، میری وائف نے دیکھ لیا تو سخت ایکشن لیں گی۔"

"خضر......" اس کی بھنویں اکٹھی ہوئیں۔

"ارے، آپ میرا نام کیسے جانتی ہیں۔ میں نے آج سے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔" خضر نے سر پر ہاتھ مارا۔

"شٹ اپ خضر!" یمی کے ڈرامے پر ضبط کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی تھی۔ خضر کا جاندار قہقہہ برآمد ہوا۔

"اچھا یہ تم ہو...... رئیلی میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ یو لکنگ سو گورجیس!" وہ باقی ماندہ ہنسی لبوں میں دبائے تعریف کر رہا تھا۔ ہنسی سے اس کے گال پھولے ہوئے تھے۔

"تم سے بڑا ڈرامے باز اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم حکم کرو تو میں اس اداکاری پر آسکر پیش کروں؟" وہ اب زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ چبا چبا کر پوچھ رہی تھی۔ خضر نے پھر سے ہنستے ہنستے منہ پر تکیہ رکھا۔

"میرے لیے کوئی فلم لکھوتاں، آسکر ضرور مل جائے گا مجھے۔" وہ پر یقین تھا۔ یمی نے ہونہہ کیا۔

"فلم اگر میں نے لکھی...... تو آسکر تمہیں جیتنے دوں گی؟ سیریسلی؟" وہ لڑنے کے موڈ میں لگ رہی تھی۔ خضر نے برا سا منہ بنا کر دیکھا۔

"یقیناً نہیں!" یمی کو گھورا۔ "جیلس لوگ......"

"اب آپ لڑتے ہی رہیں گے یا بستر سے نیچے تشریف لائیں گے...... اماں جان بیٹھی ہیں، ناشتا ان کے ساتھ کریں۔"

"ویسے ایک بات تو بتاؤ...... تم بڑی چالاکی سے ایک اچھی بہو بننے کے سارے کام کر رہی ہو تاکہ اماں جان کے دل میں گھر بنا لو۔ ارادے کیا ہیں تمہارے؟" خضر نے بھنویں اچکا کر اس کی خبر لی۔ یمی کو دل میں خوب ہنسی آئی...... مگر وہ شاطرانہ انداز میں بولی۔

"آپ کے دشمنوں کا کوئی بگ باس ہو، اور ان کا آپ کی طرف جھکاؤ بھی ہو تو ہاتھ ملانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" وہ ہاتھ مسلتے مسلتے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی تھی۔ خضر کا منہ کھل گیا۔

"کتنی خطرناک ہو تم...... مگر یاد رکھنا میرے اور میرے بگ باس کے درمیان کی بونڈنگ بہت اسٹرونگ ہے۔"

"آف کورس! ایک مظاہرہ تو ہم دونوں نے کل دیکھ ہی لیا۔" یمی نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے معصومیت کے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ خضر جل کر رہ گیا۔

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" خضر نے تلملا کر کہا۔

"جیسا آپ حکم کریں۔" سینے پر ہاتھ رکھ کر وہی معصومیت۔ اف۔ تلملاہٹ۔

"تم کبھی "آپ" اور کبھی تم پر کیوں آ جاتی ہو۔ کیا ایک پٹری پر نہیں چل سکتیں۔" خفت مٹانے کو ڈانٹنے لگا۔ یمی کون سا رعب میں آنے والی تھی۔ متاثر ہوئے بغیر بولی۔

"جب آپ اچھے بن جاتے ہیں تو آپ کو عزت سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ مقابلے پر اتریں گے تو اسی طرح بات کی جائے گی ناں؟" یمی بہت مہربان ہوئی۔

"یہ کیا اسکیم ہے؟" وہ ضدی بچے کی طرح بولا۔

"یہی اسکیم ہے۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "رات بہت بڑے دعوے کر رہے تھے...... تو وہ نبھانے کا وقت شروع ہو چکا ہے۔" وہ آگے آ کر چادر تہ کرتے ہوئے بیڈ شیٹ ٹھیک کرنے لگی۔

"چلو فٹافٹ اٹھ جاؤ! تمہاری بہت ساری عادتیں ٹھیک کرنے والی ہیں...... وہ ہم ناشتے کے بعد ڈسکس کرتے ہیں۔" وہ پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ خضر کو شاک لگا۔

"مثلاً؟" آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"آنکھ کھلنے کے بعد دیر تک کسل مندی سے بستر پر دراز رہنا۔"

"دیکھو تم بہت زیادہ فری ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔" خضر نے فوراً بستر چھوڑتے ہوئے ناراضی کے عالم میں کہا۔ "وہی بہتر تھا کہ تم چپ چاپ رہتیں اور اپنے کام سے کام رکھتیں۔" مصنوعی خفگی سے کہہ کر وہ فوراً واش روم غائب ہو گیا۔ پیچھے یمی دل کھول کر ہنستی رہی تھی۔

خضر کی شخصیت کی طرح اس کی باتیں بھی دلچسپ تھیں...... یمی کو یہ نوک جھوک بہت پرلطف لگ رہی تھی۔

خضر شاور لینے کے بعد فریش سا ہو کر جب یمی کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار تھا۔ تب اس نے ہلکا سا گلا کھنکار کر اسے مخاطب کیا تھا۔

"اماں جان خفا ہیں، مجھے ان کا سامنا کرنے سے ہچکچاہٹ ہو رہی ہے۔"

یمی نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ واقعی فکرمند نظر آ رہا تھا۔ یمی کو اس پر پیار آ گیا۔

"میں ہوں ناں...... تمہارے بگ باس کی

فیورٹ!'' یمی نے کندھے جھاڑتے ہوئے ہنس کر اسے تسلی دی تھی۔ خضر نے اس انگلی سے اس کے بال اڑائے۔

''چلو، میرے ونڈر لینڈ کی ایلس......''

دونوں ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے، دبی دبی ہنسی چھپاتے آگے پیچھے سیڑھیاں اترتے نک سک سے تیار...... جب چل رہے تھے تو ڈائننگ ٹیبل پر موجود گھر کے افراد کی اٹھتی نگاہوں میں خوش گوار حیرت سموگئی تھی۔ یمی کی نظر سامنے پڑی تو مسکراہٹ روک کر وہ دوپٹا سر پر لینے لگی تھی۔

ان دونوں کا اتفاق دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا جیسے اس خوب صورت رشتے میں موجود بدصورت غلط فہمیاں ڈھل چکی ہوں...... شکیلہ کے دل میں بے پناہ ٹھنڈک اترتی چلی گئی تھی۔ اور یہ سکون دیکھ کر حنا نے بے اختیار سوچا تھا کہ اس کی ماں کو بہت پہلے ان سے ملنے آجانا چاہیے تھا۔

''السلام علیکم!'' یمی نے دھیرے سے مشترکہ سلام کیا تھا۔ شکیلہ نے اٹھ کر اسے گلے سے لگایا اور ماتھا چوما۔

یمی نے نظر بچا کر خضر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ دیکھ لو یہ محبت کا مظاہرہ...... خضر اس کو گھور کر رہ گیا تھا۔

''میرا سیروں خون بڑھ گیا تم دونوں کو ایک ساتھ خوش دیکھ کر...... پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا جب یہ منظر میری آنکھیں ہر روز دیکھا کریں گی۔''

شکیلہ نے بیٹھتے ہوئے یمی کو دیکھ کر کہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمگیں سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ خضر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''آپ ہمارے ساتھ رہ لیں نا یہاں۔'' یمی نے محبت سے جواب دیا تھا۔ خضر نے ٹیبل کے نیچے سے زور سے اس کا ہاتھ دبایا۔

''میرا تو اپنا دل چاہتا ہے، مگر خضر کے بابا......'' انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔ اور ایک نظر خضر پر ڈالی تھی۔ خضر کی نظر جھک گئی۔

''خالہ! آپ ان سے کیا بہت ناراض ہیں؟'' یمی نے دھیمے لہجے میں انہیں مخاطب کرکے دریافت کیا تھا۔

شکیلہ خاموش رہیں۔

''ان سے ناراض نہ ہوں۔ غلطی ساری میری تھی۔ خضر بہت شرمندہ ہے۔ پلیز، آپ ناراضی ختم کردیں، میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔'' یمی نے دل موہ لینے والے انداز میں اس کی طرف داری کی تھی۔

خضر نے دل میں اش اش کرتے ہوئے اسے اکیلے میں داد دینے کا پکا ارادہ کیا تھا۔ آخر تھی نا لفظوں کے کھیل سے واقف اماں جان بھی اس کی ادا سے متاثر ہوگئی تھیں۔ ہولے سے مسکرا اٹھیں۔

''ناراض میں خضر سے تھی، معافی وہ مانگتا تو اچھا ہوتا لیکن......'' انہوں نے سنجیدگی سے لب کشائی کی۔

خضر نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے۔

''لیکن اب جب تم نے کہہ دیا ہے تو یہ اس سے بھی بڑھ کر اچھا ہے...... اپنی بیٹی کی بات میں کیسے ٹال سکتی ہوں۔'' ان کی سنجیدہ صورت مسکراہٹ میں ڈھلتی گئی۔ اور ناشتے کی ٹیبل پر بالآخر ہنسی کے ساز گونج اٹھے تھے۔

''اماں جان! تھینک یو۔'' خضر نے فوراً اٹھ کر انہیں پیچھے سے زور سے بھینچا تھا۔ وہ جب سے آئی تھیں خضر کو گلے نہیں لگایا تھا۔

''اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ یہ آخری بار تھا سمجھے۔'' انہوں نے چومتے ہوئے، وارننگ دی تھی۔

خضر نے فوراً کان چھوئے تھے۔

اس صبح بہت خوش گوار ماحول، چہکتے چہروں اور سچی مسکراہٹوں کے ساتھ ناشتا کیا گیا تھا۔

خوشیوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

جب تھانے کے چکر کاٹ کاٹ کر ان کی جوتیاں گھس گئیں پھر بھی کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی تب پانچویں دن کے اختتام پر ذہنی و جسمانی مشقت کے بعد صدام حسین کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ پولیس کی گاڑی جس طرح اسے اٹھا کر لے گئی تھی، اسی طرح واپس چھوڑ گئی۔

حاکم صدام سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔ نظریں صدام سے بھی نہیں ملائی جا رہی تھیں۔ حاکم معین کو باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اوطاق پر چلے آئے تھے۔ حاکم کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے...... لمحہ لمحہ انگاروں پہ چلنے کے مترادف تھا۔

''تم نے کیا سوچا ہے آگے کے بارے میں؟'' حاکم نے معین کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تو معین نے گہری سانس لی تھی۔

''آپ جانتے ہیں اس کا نکاح ہو چکا ہے...... اور ظاہر ہے اس کی مرضی سے۔ ہمارا اس پر اب کوئی اختیار نہیں ہے۔''

''اختیار نہیں ہے؟'' حاکم دانت پیستے ہوئے آگے آئے تھے۔ جیسے ابھی معین پر تھپڑوں کی بارش کردیں گے۔

''کس قدر بے غیرتی سے کہہ رہے ہو۔ ایک مرد ہو کر تمہارا اپنی عورتوں پر اختیار نہیں ہے؟'' معین کے بدن کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

''چچا جان! جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب غصہ کرنے اور جذباتی قدم اٹھانے سے کیا ہوگا...... آپ جانتے ہیں اگر ابا کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو انجام کیا ہوتا تھا؟''

''اوہ! تو بزدلوں کی طرح منہ چھپانے کا سوچ رہے ہو؟''

''یہ بزدلی ہے معین! تم چاہتے ہو کہ زندگی بھر وہ ہمارے سامنے دندناتے پھریں اور جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس آئیں کہ انہوں نے ہماری عزت ہضم کرلی...... یہ سال دو سال کی نہیں نسلوں کی بات ہوتی ہے سمجھے تم۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ان کے گرجنے پر وہ تحمل سے بولا۔ ''مگر عزت اب واپس تو نہیں آسکتی؟''

''عزت اچھالنے والی تو واپس آسکتی ہے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' وہ نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔

''جو ہوگا وہ تم دیکھنا...... اس بدنامی کے داغ کو میں مٹاؤں گا۔ ان لوگوں کی ہنسی میں چھین لوں گا جو سمجھتے ہیں کہ حاکم کی گردن ساری عمر جھکی رہے گی۔'' وہ چبا چبا کر بول رہے تھے۔ اس ذکر پر ان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا تھا۔

''یمی واپس آ بھی جائے چچا جان...... پھر آپ کیا کریں گے کیا اس کی جان لیں گے؟ نہیں چچا جان۔'' معین نے رنجیدہ لہجے میں نفی میں سر ہلایا تھا۔

حاکم نے غور سے اس کے چہرے پر لکھی تحریر پڑھی۔

''تم اسے مجھ تک لے آؤ بس! میں تمہیں حکم دیتا ہوں...... ورنہ دوپٹا لے کر بیٹھ جاؤ گھر۔''

معین کی مردانگی پر چوٹ پڑی تھی۔ اس نے سر جھکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں اسے آپ کے پاس لے کر آؤں گا۔'' اس نے بہت کچھ حلق سے اتارا۔ ''لیکن آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا، آپ یمی کی جان نہیں لیں گے۔''

''وہ میری اولاد ہے میں اسے......''

''وعدہ کریں۔'' معین نے ان کی بات نہیں سنی تھی۔ حاکم نے ضبط سے دو لمحے خاموشی اختیار کی۔

''ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کتنے دن چاہییں تمہیں؟''

''زیادہ نہیں......'' معین بوجھل دماغ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ حاکم کے ذہن میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ ماضی میں انہوں نے بہت کچھ کیا تھا...... مگر ان غلطیوں کے بعد انہوں نے سب کی ضرورتوں کا خیال بھی بہت رکھا۔ تاجور کو اس عمر میں آکر حاکم سے انتقام نہیں لینا چاہیے تھا...... تاجور نے حاکم کی

...پر اتنا گہرا وار کیا تھا کہ یہ زخم انہیں قبر تک لے کر جائے گا۔

ان کی ذہن میں یہ بات نہیں آسکی تھی کہ...... اولاد اولاد ہوتی ہے وہ انتقام کے لیے کبھی استعمال نہیں کی جاسکتی۔

☆☆☆

شمائلہ نے کمرے سے باہر جھانک کر اچھی طرح تسلی کی۔ پھر اطمینان سے کال ریسیو کی تھی۔

''بولو معین! کال تمہیں میں نے کرلی تھی...... ہم نے ڈیسائڈ کیا تھا؟''

''مجھے یاد ہے۔'' معین نے اس کے تیز لہجے پر دھیمے انداز میں کہا تھا۔

''مجھے آپ سے پوچھنا تھا کہ آپ نے جو کہا تھا اس پر کتنا کام کیا...... کام کیا بھی ہے کہ مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''تم کیا کرسکتے ہو؟'' وہ چمک کر بولی تھی۔ معین کو فوری طور پر جواب نہیں سوجھ سکا۔

''تم اگر کچھ کرسکتے نا معین! تو اس وقت مجھے کال نہ کررہے ہوتے۔'' اس کی طنزیہ ہنسی پر معین نے دانت پیسے تھے۔

''آپ نے مجھے کہا تھا کہ کچھ بھی کرنے سے پہلے آپ کو آگاہ کروں۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ کو بھی میری ضرورت ہے ورنہ اس وقت میری کال نہ سن رہی ہوتیں۔'' معین کے ٹھنڈے ٹھار لہجے پر شمائلہ کی ہنسی سمٹی۔ حلق کڑوا ہو گیا تھا۔

''مجھے تمہاری کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟''

''یہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اچانک ہم سے اتنی ہمدردی کیسے ہوگئی ہے...... مجھ کو تو فائدہ آپ کا بھی ہوگا؟'' معین کو اپنی بے عزتی کا بدلہ لوٹا کر مزا آرہا تھا۔ شمائلہ نے لب بھینچے۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو معین! ورنہ......''

''اپنے کام کی غرض سے ہی رابطہ ہے۔ مجھے بتایئے کیا چل رہا ہے آپ کے دماغ میں؟''

''ہم اپنا مقصد پانے میں تھوڑی سی دوری پر ہیں۔ تم تیار رہو، یسی سے ملنے تم نے ہی جانا ہے...... میں جلد بازی میں کام بگاڑنا نہیں چاہتی۔''

''یسی مجھ سے کیوں ملے گی؟'' معین کی سوئی اس بات پر اٹک گئی تھی۔

''تم ملو گے اس سے، اب یہ تم سوچو کہ یسی کو تم بہلا کر کیسے واپس لاتے ہو...... یہاں سے تمہارا کام شروع ہوگا۔ اس کی کامیابی کا سارا دارو مدار تم پر ہوگا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ جانتی ہیں یسی کہاں رہتی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے یک لفظی جواب دیا۔

''پھر؟''

''یہی تو میرا کام ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی تھی۔ ''اور مجھے اپنا کام کرنا آتا ہے......''

''ہاں لیکن کتنی دیر؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

''زیادہ نہیں......'' شمائلہ مسکرائی۔

''میں کچھ دنوں میں شہر جارہی ہوں، واپس آکر تمہیں آگاہ کرتی ہوں...... تب تک سوچو کہ تم نے ایسا کیا کرنا ہے کہ یسی تمہاری بات سننے پر مجبور ہو جائے۔ یاد رکھنا کہ......''

شمائلہ نے آخری بات مسکراتے ہوئے مکمل کی تھی اور کال ڈراپ کردی تھی۔ معین کئی لمحے اس کی باتوں کو سوچتا بیٹھا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں شمائلہ کی آخری بات بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔

یاد رکھنا ایسی لڑکی، جس کے دل سے تم بری طرح سے اتر چکے ہو تمہاری بات سننے پر کیوں مجبور ہوگی؟ ایسی کون سی بات......؟

☆☆☆

میں ہوا ہوں۔
اور تمہارے کمرے کی۔
کھڑکی کا شیشہ۔

رات اپنے تاریک محل کھڑے کرچکی تھی۔ وہ دونوں دریہ اور بلال کے نکاح کی تقریب میں جارہے تھے۔ خضر دونوں کی طرف سے انوائٹڈ تھا۔ مسز کے ساتھ آنے کی پرزور فرمائش...... یسی نے آج سیاہ لباس کے ساتھ تقریب کی مناسب سے ہلکی پھلکی جیولری اور لائٹ میک اپ کا بھی انتخاب کیا تھا...... بالوں کو خوب صورت شیپ دی۔ پہلی بار اس کی ملاقات اچانک دریہ سے ہوگئی تھی...... اب کی بار وہ اس کے تمام دوستوں سے ملنے جارہی تھی، یسی نے بہت سارے عذر تراشے۔

''خضر! آپ چلے جائیں، مجھے جانا اچھا نہیں لگتا۔''

''فنکشن میں جانا یا میرے ساتھ؟''

''آف کورس فنکشن میں......''

''اس میں برا لگنے جیسا کیا ہے؟ برا یہ نہیں لگے گا کہ تمہارے ہوتے ہوئے میں اکیلا چلا جاؤں؟''

''وہ آپ کے دوست ہیں۔'' یسی کشمکش کا شکار ہوگئی۔

''تمہارے بھی بن جائیں گے نا...... تین چار لڑکیاں ہیں یار! اور ان کی فیملیز ہوں گی۔'' وہ اس کی ہچکچاہٹ سمجھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، وہ بات نہیں ہے۔'' یسی نے اس کے خیال کو رد کیا تھا۔

''اصل میں پہلی بار ملنا ہوگا اور پتا نہیں کس طرح......'' وہ ہلکا سا مسکرادی۔ خضر کو اب سمجھ میں آیا کہ وہ نروس ہورہی تھی۔ فائلز ایک طرف رکھتا ہوا وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

''مائی ڈیئر وائف! بی کانفیڈنٹ...... تمہیں پتا ہے وہ سب تمہارے فین ہیں۔'' خضر کی بات پر اسے زوردار ہنسی آگئی۔

''یہ تو اور نروس کرنے والی بات ہے نا۔''

''بالکل نہیں! سب شدت سے تمہارے منتظر ہیں...... یہ بہت موقع ہے کہ سب سے تمہاری شناسائی ہو جائے۔''

''بس ایسے ہی مجھے جانا عجیب لگ رہا ہے۔''

''مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' خضر رومینس جھاڑنے کے موڈ میں تھا۔ ''تمہارے ساتھ کہیں جانے کے لیے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ ان فیکٹ میرا تو آفس میں بھی دل نہیں لگتا...... میرا دل کرتا ہے تمہارے ساتھ ایک ایک جگہ پر جاؤں اور......''

''بس ہر وقت شروع۔'' یسی اس کی بات کاٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ''مسکہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے، میں چل رہی ہوں۔''

''واٹ! مسکہ؟'' خضر کی آنکھیں سکیڑ کر کہا۔ ''تمہاری میری محبت مسکہ لگتی ہے؟''

''جی! ہر دو منٹ بعد چولہے پر رکھے دودھ کی طرح ابلنے والی محبت......''

''تمہیں اس سے بری مثال اور کوئی نہیں ملی تھی؟'' خضر کا چہرہ بگڑ گیا۔ آنکھیں سکڑ گئیں۔

''میں آپ کا اس سے زیادہ برا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔'' یسی نے انگلی سے چہرے کے گرد گول دائرہ بنایا اور کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔

''ویسے منہ بسورتے بہت اچھے لگتے ہو۔ ناٹ بیڈ!''

''اڑا لو مذاق......'' خضر نے تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ ''محبت کی قدر ہر کسی کو نہیں ہوتی۔''

''اف۔'' یسی نے سر پر ہاتھ مارا۔

''ویسے تم اتنی کیوں خشک مزاج ہو، مجھ سے دو چار میٹھی باتیں نہیں کرسکتیں...... یہی مٹھاس میرے لہجے میں محسوس کرو تو تمہیں فوراً شوگر لیول بڑھنے کا خطرہ ستانے لگتا ہے۔ بھاگ جاتی ہو...... کہانیوں میں تو محبت محبت لکھتے تمہارے ہاتھ نہیں تھکتے لیکن مجال ہے کہ تمہاری اندر ذرا سا رومینس ہو۔''

خضر ایک سانس میں تیز تیز بولتا گیا اور یسی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے پہلے صوفے پر گر گئی۔ پھر آنکھوں سے بہتا پانی صاف کرتے ہوئے بھی اس کی ہنسی تھم رہی تھی۔

''اچھا خضر...... تمہیں یاایک بات بتاؤں......''

وہ بار بار ہنسی، روکی، اور بیچ میں چند الفاظ بول رہی تھی۔ غضنفر ابرو اچکا کر دیکھ کم اور گھور زیادہ رہا تھا۔

"ہماری ایک نانی ہیں .... ہماری نانی بھی تم بھی جل جل کر بات کرتے ہو مجھے ان کی یاد آجاتی ہے۔" بات مکمل ہوئی اور ہنسی کا طوفان شروع .... اس نے ان دنوں میں سیمی کو صرف ہنستے دیکھا تھا۔ اور اس کی ہنسی اتنی شفاف تھی کہ غضنفر نے سرے سے اس کے عشق میں مبتلا ہونے لگا تھا۔

اس سے اس نے مصنوعی غصے سے تکیہ اٹھا کر سیمی کی سمت پوری قوت سے پھینکا۔ پھر پاؤں پٹختے ہوئے غصے کے اظہار کے طور پر وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا جب اس نے تیزی سے آواز دی۔

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جانا .... ناراضی اپنی جگہ .... نہ ہوا کیسے چلے جاؤ۔" سیمی کی ہنسی نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس وقت جب وہ تیار ہو کر باہر آرہی تھی تو غضنفر گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا .... اس کو دور سے آتے دیکھ کر غضنفر کی نگاہ اس پر ٹھہری رہی تھی۔ وہ آکر اس کے قریب بیٹھی تب غضنفر کا سکتہ ٹوٹا تھا۔

"بیوٹی فل ...." زیرِ لب مسکراتے ہوئے اس نے ایک لفظ بولا تھا۔ سیمی نے بال کانوں میں اڑستے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"ہینڈسم ...." اسی کے انداز میں تعریف لوٹائی۔ غضنفر دلفریب انداز میں مسکرایا۔

"تم ہر بار مجھے سحر زدہ کر دیتی ہو۔ ہم کسی اور کی پارٹی میں جا رہے ہیں، محفل یہاں تم لگ رہی ہو۔" سیمی دھیمے سروں میں ہنس دی تھی۔

"یہ آپ کی نظر کا قصور ہے۔"

"یا پھر آپ کے حسن کی گستاخیاں ...."

"اب ہم کیا بولیں۔" سیمی عاجزی سے کندھے اچکا کر سامنے دیکھنے لگی تھی۔ بے نیازی نظر آنے کی کوشش ....

"تم مجھے ہر روپ میں حیران کر دیتی ہو .... سوچتا ہوں تمہیں کتنا گناہ ملے گا ان تیروں کا جو تم مجھ پہ چلا رہی ہو۔"

"آپ کے پاس کوئی اعمال بھی تو ہوں گے؟" سیمی نے لاپروائی سے دریافت کیا۔

"ہے نا دل اسی کو گھائل کرتے جا رہی ہیں۔" وہ ذرا سا سیمی کی طرف جھکا تھا۔ سیمی آنکھوں میں شرارت بھرے ذرا سی قریب ہوئی۔

"ذرا دھیان سے .... آپ کی لاپروائی روزِ کسی کو گھائل کر دے۔" سیمی نے مسکرا کے کہا تھا۔ اگر غضنفر اس کے الفاظ سنتا تو یقیناً وہ اسے اظہارِ محبت کر دیتا۔ مگر دوسرے ہی پل دونوں ہی ہنسنا شروع ہو گئے تھے۔

"ہم وہاں کھانا نہیں کھائیں گے۔" غضنفر نے میوزک پلے کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ گاڑی میں راحت فتح علی خان کی آواز دھیمی دھیمی سی گونجنے لگی۔

تیرا میرا ساتھ ہو اور پیار بھری رات ہو
کبھی بولے نہ دونوں کبھی، ایک ایسی ملاقات ہو

میں دل تو میری دھڑکن
بس تجھ سے میرا جیون
جینا نہیں جینا، تیرے بن ....

گیت کے بول جیسے سیاہ روشنیوں میں بھاگتی اس گاڑی کے اندر جادو جگا رہے تھے۔ یہ دونوں کی دل کی آواز تھی .... لبوں پر ٹھہری کسی بات کا اظہار .... سیمی نے چپکے سے غضنفر کی طرف نظر کی تھی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ .... میں آج تمہارے ساتھ ایک اسپیشل جگہ ڈنر کرنا چاہتا ہوں۔" غضنفر نے مسکراتی آنکھوں سے اس کے چہرے کے گرد طواف شروع کر دیا تھا .... اس کی باتیں، اس کے تاثرات .... اور ان کے درمیان گونجتے گیت کے بول ....

اک پل دیکھوں نہ میں جو تجھ کو
کہیں چین نہیں پاؤں
پیار تیرا دل میرا مانگے سدا

[illegible] جھک کر اس منظر سے .... سی [illegible] خواب ناک سا .... [illegible] سی ایک ایک [illegible] ماحول، اور یہاں میں ایسا [illegible] وفا کی .... کر رہے تھے۔

"کہاں غضنفر؟" اس نے [illegible] کی آواز میں پوچھا .... [illegible] مسکراہٹ .... پیاری سی غضنفر کے چہرے پر کھل رہی تھی۔

"سفر پہ اگر .... تھوڑا سا انتظار کرو۔" غضنفر نے گاڑی کی رفتار دھیمی رکھی ہوئی تھی۔ وہ جیسے چاہتا تھا کہ یہ راستہ کبھی نہ ختم ہو .... فاصلہ بھی نہ سمٹے۔ اور دونوں اسی طرح چلتے رہیں .... چلتے رہیں۔

دل کے جہاں پہ راج ہے تیرا
تجھے لیے ملاؤں
ہاں جانا ہے میرا خدا ....

غضنفر مسکرا کے دیکھنے لگا تھا۔ سیمی نے بھی رخ موڑا تھا .... گانا جیسے انہی کے لیے لکھا گیا تھا۔ ان ہی لمحوں کے لیے .... اور اس وقت کے لیے۔

غضنفر ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھامے، دوسرا ہاتھ بڑھا کر سیمی کے ہاتھ کو تھام لیا تھا .... دل کی سیمی کی دھڑکنیں جیسے اس کی ہتھیلیوں پر شور کرنے لگی تھیں۔

میں دیکھوں تیری راہیں
تیری، تیرے سنگ وفائیں
جینا نہیں جینا .... تیرے بن ....

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ غضنفر کی آنکھوں میں سوال نہیں تھا، سچائی تھی۔ سیمی کو لفظوں کی ضرورت نہیں تھی .... اس کے چہرے پر پھیلا یقین تھا۔ غضنفر کے سنگ چلنے کی .... اپنی ساری وفاؤں کی .... ایک ان کہا عہد تھا۔ دو محبت کرنے والے دلوں کے لبوں پر محبت بھری مسکان کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

"تھوڑا سا جوس پی لو۔" وہ گلاس میں تھوڑا سا انار کا جوس لیے کرم الٰہی کے سرہانے کھڑی تھی۔

اپنے حال میں انہیں آج پہچانا دن تھا۔ وہ جو کرم الٰہی کی وفا اور تندرستی کی امید لے کر آئی تھی۔ خود اس سے زیادہ بیمار اور بوڑھی لگنے لگی تھی۔ شہر کی ساری دھول اور گاڑیوں کے دھوئیں جیسے اس کی رنگت پر چڑھ آئے تھے۔

"نہیں۔" کرم الٰہی نے ذرا سی آنکھیں کھول کر نفی میں سر ہلایا۔ ثانیہ کی ہمت اس کو دیکھ کر مزید کم پڑتی جاتی تھی۔

"تم کچھ کھاؤ پیو گے نہیں تو جسم میں طاقت کیسے آئے گی۔ خالی دوائیاں تو سب کچھ نہیں کرتیں نا۔" وہ تھک ہار کر بولی تھی۔

کرم الٰہی ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ بولنا بالکل چھوڑ چکا تھا .... پیاس کے وقت اشارے سے انگلی ہونٹ پر لگاتا۔ ثانیہ چمچ سے دو تین گھونٹ پانی پلاتی۔ اس سے اٹھ کر بھی نہیں بیٹھا جاتا تھا۔

"سر یا جسم میں درد تو نہیں ہو رہا؟" ثانیہ نے لہجہ نرم کر کے پوچھا۔ جواب نہیں دیا گیا تھا۔ وہ گلاس رکھ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔

اس کے بستر کے پاس لکڑی کی چھوٹی سی بنچ پڑی تھی جس سے ٹیک بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ثانیہ اتنے دنوں سے رتجگے کاٹ رہی تھی۔ یہاں کا ماحول بہت اذیت ناک تھا۔ ناقص صفائی کا انتظام .... بوڑھے چہرے، لاوارث مریض۔ دن رات مریض تڑپ تڑپ کر دم توڑتے رہتے تھے۔ ثانیہ کا دل دہشت سے دھک دھک کرتا رہتا تھا۔ یہ سب اس پر گہرے اثر چھوڑ رہے تھے۔

کرم الٰہی کے جسم اور پیروں پر سوجن آنا شروع ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں انڈے کی زردی جیسی ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹرز نے اس کے بہت سارے ٹیسٹ کرائے تھے۔ بلڈ ٹیسٹ، یورین ٹیسٹ، بلغم ٹیسٹ .... اسے پرانی ٹی بی بھی تشخیص کی جا رہی تھی۔

کرم الٰہی بند آنکھوں سے اس لڑکی کو بار بار بہت ساری پرچیاں لیے ڈاکٹروں اور نرسز کے پاس بھاگتا دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے ہر ممکن کوشش

کر رہی تھی...... وہ بھی جو اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ کر رہی تھی۔

ایک دن اسے رگ میں انجیکشن لگانے والی نرس نے روئی ہاتھ پر رکھی تو ثانیہ انگوٹھا رکھ کر خون روکنے لگی۔ نرس نے اسے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

"آپ خون سے احتیاط کیا کریں۔ ان کا خون آپ کو نہیں لگنا چاہیے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے اپنی ہم عمر نرس کو پھیکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"میں آپ کے جذبات سمجھ سکتی ہوں، مگر ان کے بلڈ میں یرقان کے آثار ہیں۔ ہاتھ دھولیں جا کر۔" وہ کہہ کر چلی گئی تھی اور ثانیہ نے ایک لفظ دہرایا۔

"جذبات......" اس کے جذبات رہ گئے تھے کیا؟ وہ کچھ محسوس نہیں کر سکتی تھی...... اس کے جذبات تو جیسے سرد خانے میں پڑی لاش کے جیسے ہو گئے تھے۔

"ثانی...... بات سن۔" کرم الٰہی نے بھاری آواز میں اسے پکارا تھا۔

"مجھے گھر لے چل...... میں نے اس بیماری سے نہیں اٹھنا۔ گھر سکون سے مر سکوں گا۔"

"ایسی باتیں مت کیا کرو کم از کم۔" ثانیہ نے سختی سے جھاڑ دیا تھا اس کو۔ پھر بے بسی سے لب کاٹتی رہی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو کرم الٰہی گرج کر کچھ کہتا...... مگر اسے دیکھتے رہنے کے بعد، اس نے دوبارہ پوچھا۔

"میرے بھائیوں میں سے...... کوئی پوچھنے آیا مجھے؟ ثانیہ بالکل سن ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ آج کل یہ سوال بار بار پوچھتا تھا۔ آنکھوں میں بے بسی کی نمی...... لہجے میں امید کی کیفیت۔

"تم نے کہا تھا نا کہ......"

ثانیہ اس بار اسے ٹال نہیں سکی تھی۔

"ہاں آئے تھے...... تم سو رہے تھے، میں نے انہیں بھیج دیا...... یہاں زیادہ لوگوں کو رکنے کب دیتے ہیں نا۔"

ثانیہ اس بیمار اور زندگی کی موت سے لڑتے شخص کو مزید مایوس نہیں کر سکتی تھی۔ جبراً مسکراہٹ سے بتانے لگی...... کرم الٰہی خاموش نظروں سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔ ثانیہ نے تیز تیز سر اثبات میں ہلانا شروع کر دیا۔ کرم الٰہی نے اس پر یقین کر لیا تھا۔ ثانیہ کو سکھ کا سانس آیا۔

"ثانیہ! بچپن بڑا پیارا ہوتا ہے۔"

ثانیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"بہن بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں...... میں بچہ تھا مریل سا، میرے بھائی کسی کو مجھے مارنے نہ دیتے تھے۔"

کرم الٰہی کی آواز بھرانے لگی تھی۔ یا وہ خاموشی کے سبب کھکھیائی ہوئی تھی وہ سمجھ نہ سکی۔

"بچپن اچھا ہوتا ہے دل مہربان ہوتے ہیں...... بڑے ہو کر ماں جائے بدل کیوں جاتے ہیں۔ ان کے دل پتھر کیوں ہو جاتے ہیں، آخری وقت میں بھی دل نہیں کرتا کہ......؟"

ثانیہ کو آتا سکھ کا سانس چھین لیا گیا تھا۔ کرم الٰہی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

ثانیہ من من بھاری قدم اٹھاتی، منہ چھپاتی واش روم میں گھس گئی۔ اور دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ آج کل اس کا دل پانی پانی ہوا رہتا تھا۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ کتنی دیر کرم الٰہی کا دکھ روتی رہی۔ ڈاکٹرز واقعی اس کے لیے پر امید نہیں تھے۔

آخری وقت...... آخری وقت......

☆☆☆

یمی کا استقبال اس کی سوچ سے بڑھ کر گرمجوشی سے کیا گیا تھا۔ نعیمہ، انعم اور دریہ کی بہن ان سے ایسی ملیں جیسے وہ سالوں سے دوست رہی ہوں۔ یمی کا چند لمحوں میں ہی اعتماد بحال ہو گیا تھا۔

اس تقریب کا اہتمام ان کے خوب صورت سے لان میں کیا گیا تھا۔ اسٹیج اور آس پاس ہوئی بے تحاشا پھولوں کی سجاوٹ دل خوش کر رہی تھی۔ اور جگمگاتی روشنیوں سے رات کی کوکھ سے روشنی کا طوفان پھوٹ رہا تھا۔ دونوں نے اسٹیج پر جا کر دریہ اور بلال کو مبارک باد دیتے ہوئے تحفہ پیش کیا تھا۔ بلال بہت ادب سے ملا۔

"تم اس کی شکل پر مت جانا، بہت میسنا ہے...... اتنی فرماں برداری اس میں ہے نہیں۔" خضر نے اس کو معصوم بنتا دیکھ کر بے ساختہ کہا تھا۔ ایک زبردست سا قہقہہ پڑا۔

"آپ سچ بتائیے، کیا آپ کو خود اس سے زیادہ میسنا شخص کوئی نظر آتا ہے؟" بلال نے یمی کو مخاطب کیا تھا۔

یمی نے مسکراہٹ روکتے ہوئے خضر کو ایسے دیکھا جیسے اسے بلال کی بات پر پورا یقین ہو۔ "مسکین سی شکل بنالے پھر بھی گینگسٹر کا گراف کم ہوتا نظر نہیں آتا۔" اس نے مزید ٹکڑا لگایا۔

"خیر! یہ بات تو ماننے والی ہے۔" خضر واقعی بلال سے بہت اچھا ہے۔ ہینڈسم، ڈیشنگ، تمیز دار...... ہم پانچ سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں نے اس جیسے لڑکے بہت کم دیکھے ہیں۔"

دریہ بلال کو جلانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہی تھی۔ خضر نے سر کو خم دے کر تعریف وصول کی۔ یمی کو دریہ کا پر اعتماد انداز اچھا لگ رہا تھا۔

"اچھا تو پھر میرا انتخاب کیوں کیا؟" بلال نے چڑانے کو پوچھا۔

"اس لیے کہ ہم سب کا تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا سوائے تمہارے...... اب ہمدردی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا۔" دریہ مصنوعی خود پسندی سے بولی تھی۔ لہجے میں گہرے تفاخر کا احساس...... یمی بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

"آپ دونوں ساتھ میں بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ ماشاء اللہ!" بلال کے کچھ بولنے سے پہلے یمی نے تعریف کر دی تھی۔ خضر نے لب کشائی کی۔

"شکر ہے تم نے کہہ دیا ورنہ ابھی بارود اور توپوں کے حملوں سے یہ میدان جنگ بننے کو تھا۔" خضر دونوں کی تکرار سے واقف تھا۔ سب کے موڈ بے حد خوش گوار تھے۔

"آپ لوگ آئے بہت اچھا لگا یار۔" بلال نے شکریہ ادا کیا۔

"موصوف خود تو چپکے سے شادی فرما چکے ہیں۔ ہم لوگ ایک شاندار سا ڈنر پلان کرتے ہیں تم دونوں کے لیے...... پھر شادی کی زبردست پارٹی لیں گے۔" دریہ مسکرا کر یمی کو کہہ رہی تھی۔ یمی نے مسکرا کر اس کی آفر کو قبول کیا تھا۔

"آفٹر آل اب تم بھی ہماری دوست ہو۔"

اسے سارا وقت اسی قسم کے اپنائیت بھرے جملے سننے کو ملتے رہے تھے۔ خضر اپنے دوستوں میں بیٹھنے چلا گیا۔ کچھ وقت بعد آیا تو نعیمہ اور دریہ کی بہن یمی کو گھیرے کھڑی تھیں۔

"مبارک ہو خضر! تمہاری سب سے بڑی خواہش پوری ہوئی...... یہ الگ بات ہے کہ ہمیں یہ دکھ کبھی نہیں بھولے گا۔" نعیمہ نے دیکھتے ہی شکوہ کیا تھا۔ یمی نے نجانے کیا ریزن دیا تھا انہیں اپنی شادی کا...... خضر نے ہنس کر شکوہ قبول کیا۔

"اس غم میں زیادہ دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب بہت جلدی میں ہوا...... ولیمہ شاندار طریقے سے کریں گے اور تم لوگوں کو سب سے پہلے انوائٹ کریں گے۔"

"آپ دونوں کا کپل بہت پیارا ہے۔" دریہ کی بہن حمینہ بولی تھی۔ اس کی آواز بہت باریک اور پیاری سی تھی۔ معصوم بچوں جیسی......

"ہاہا! میں تو کہتا ہوں، لوگ مانتے نہیں۔" خضر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ نعیمہ فوراً بولی تھی۔

"لوگوں کی آنکھیں چیک کرواؤ۔ ہماری ڈاکٹر صاحبہ عرق گلاب سے دھونے کا مشورہ دے دیں

فرینڈ کا مطلب تمہارے نزدیک شاید کچھ اور ہے، میں نے تو سمپل لڑکی دوست کا کہا ہے۔ جیسے ابھی تم میری دوستوں سے مل کر آ رہی ہو۔ یہ تو بہت کامن لگے...... ضروری نہیں گرل فرینڈ صرف وہی ہو جس کے ساتھ آپ کا کچھ چل رہا ہو۔"

"جو بھی ہے۔" اس کے چہرے کا تناؤ کم پڑ گیا تھا۔ مگر اس پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔

"ویسے جب تم اس طرح ری ایکٹ کرتی ہو بہت اچھا لگتا ہے کیا کرو...... میں حفاظتی اقدام کے تحت شرافت کا ایک سرٹیفکیٹ بنوا لیتا ہوں۔"

خضر کی بات پر وہ بے اختیار مسکرا اٹھی تھی۔ اسی لمحے بیک گراؤنڈ میں گونجتی برونو مارس کی آواز ایک الگ جادو جگانے لگی تھی۔

Oh her eyes her eyes
Make the stars look like
they are not shining
her hair her hair
Falls perfectly with out
her trying
She is so beautiful
and I Tell her every day

خضر کی بولتی آنکھیں یمی پر جمی تھیں۔ وہ ان لیریکس کے ساتھ شرارتی مسکراہٹ اس کی سمت اچھال رہا تھا...... یمی ہنس پڑی۔

"اس میں بھی ضرور تمہاری سازش ہے۔"

خضر کا دھیان ہٹانے کے لیے اس نے بات بنالی تھی۔ خضر نے تھوڑی تلے ہاتھ رکھا۔ فرصت سے دیکھا۔

"یہ محبت کی سازش ہے...... محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسے حسین اتفاق قدم قدم پر ہوتے ہیں۔ سمجھو اس کے اشارے۔" وہ گمبھیر آواز میں بول رہا تھا۔ خضر کی آواز جیسے اس میوزک کے ساتھ ہم آہنگ ہونے لگی تھی۔

"میں نے تمہیں سادگی میں دیکھا۔ تمہیں ہمیشہ پیور پایا...... تم بار بار مجھ سے ٹکرائیں تب جب ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔ محبت کی فیری ٹیل......"

خضر آہستہ آہستہ بولتا جا رہا تھا اور یمی یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

And when your smile
the whole world stops
and stares for a while
cause girl you are
amazing just the way you
are

خضر مسکرا اٹھا تھا۔ یمی سے ان نگاہوں کی تاب لانا دشوار ہو گیا۔

"میرے دل کی آواز......" وہ گانے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "تم سب سے مختلف ہو، میری زندگی میں آنے والے لوگوں سے بہت الگ...... اور میں ہمیشہ اندر کی یہ خوب صورتی برقرار رکھنا چاہتا ہوں...... تمہیں اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔"

And when you smile
the whole world stops

خضر نے گنگنا کر کہا تھا۔ یمی کھلکھلا کر ہنس پڑی...... اس کے دل میں یہ جملے ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ یمی کا دل اس وقت اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ کہیں ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ محبت کے رتھ پر سوار تھا۔

"تم بھی بولو......"

"کیا؟" یمی نے چمکتی نگاہیں اس پر جمائیں۔ وہ خاموش بیٹھی جل پری کی طرح اس سے ساحل کے گیت سنتے رہنا چاہتی تھی۔

"جو تم کہنا چاہتی ہو......" خضر نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ جیسے سماں سا بندھ گیا۔

"آئی لو یو ٹو......" خضر نے بات مکمل کی۔ یمی کی سماعتوں نے جیسے دور سے سنا۔ کچھ ہلچل سی ہوئی۔

"ہوں؟" وہ چونکی۔ پھر دماغ میں کچھ کلک ہوا۔ روشنی کا جھماکا ہوا۔

"بالکل نہیں......" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ "چالاک، شاطر انسان...... اپنے الفاظ میرے منہ سے زبردستی مت بلواؤ۔" یمی نے چبا چبا کر کہا تھا۔ اور دونوں ہنستے ہنستے آگے پیچھے ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تھے...... روڈ پر بھی وہ بحث کرتے ایک دوسرے کے ساتھ پاگلوں کی طرح ہنس رہے تھے۔

"تم...... تم بہت بڑے ڈیش ہو خضر!" یمی مصنوعی خفگی سے اس کے کندھے پر مکا مار کر بولی تھی۔ خضر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"ایک نہ ایک دن تم نے کہنا ہے تو تمہاری مشکل آسان کر رہا ہوں۔ ورنہ میرے کان نہیں ترس رہے کیونکہ مجھے تمہارے دل کی خبر ہے۔" وہ جھوم کر بولا تھا۔ یمی نے بیٹھتے ہوئے جواب دینا فرض سمجھا۔

"خام خیالی ہے تمہاری...... ساری زندگی نہیں بولوں گی۔"

"اچھا۔ اوکے!" وہ مان گیا۔ "ہماری شادی کی گولڈن جوبلی پر یہ اظہار کرنا۔ جب ہم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے...... کچھ بڑھاپے کے لیے بھی بچا کے رکھنا چاہیے۔"

خضر مسکراتا ہوا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ اس لیے ہر منظر خوب صورت لگ رہا تھا...... زندگی بہار ہو رہی تھی۔

"کل کا دن بہت بڑی گزرنے والا ہے اور تمہیں کچھ بتانا بھی ہے۔" بہار کے سارے پھول ہلنے لگے تھے۔ خضر نارمل لہجے میں ایک سنجیدہ بات کرنے جا رہا تھا۔

"کل میں نے شمائلہ سے ملنے کا پلان کیا ہے۔" اس نے گاڑی کا موڑ کاٹا تھا۔ یمی کو لگا ٹائر اس کے وجود پر چڑھ گئے ہیں۔

"خضر تم......" وہ شاکی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ یہ شخص کس مٹی سے بنا تھا...... ایک پل کی خوشی دے کر اگلے پل ہرٹ کر دیتا تھا۔ جیسے اس خوشی کا خراج وصول کر لینا چاہتا ہو......

"سنو ناں!" خضر نے اسے بے رخی سے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے پا کر پکارا۔ "یہ آخری بار ہے۔ ٹرسٹ می!" خضر نے نرم لہجے میں کہا تھا۔ یمی نے زخمی نگاہوں سے دیکھا۔

"کیوں خضر؟ یہ آخری بار بھی کیوں ہے؟ جب سب کچھ ختم ہو چکا ہے تو یہ آخری بار بھی میں کس معنی میں لوں؟" وہ ناراضی میں ہاتھ سینے پر لپیٹے سیدھ میں دیکھنے لگی تھی۔ خضر کے پکارنے پر بھی نہیں مڑی۔

"یہ سب میری طرف سے ختم ہوا ہے یمی...... اس کی طرف سے ختم کرنا باقی ہے۔" خضر نے دھیرے سے بات شروع کی تھی۔ یمی نے اس کی بات بغور سنی۔

"بات ختم کرنے کے لیے بات کرنا ضروری ہوتا ہے۔" خضر نے مختصر سے جملے میں اسے ساری کہانی سنادی تھی۔ یمی کے دل کی کیفیت معمول پر آئی۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔

"تم بھی ملو گی اس سے؟"

"نہیں۔" اس کی آواز میں سختی تھی۔

"فائن! ایک آخری بار بات کرنی ہے۔ میں بنا بتائے بھی کر سکتا تھا، مگر میں مزید کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا رسک نہیں لے سکتا...... اس لیے تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔" گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ اور صرف خضر کی آواز گونج رہی تھی۔ "اور یمی! تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے...... اتنا اعتبار کہ اگر تم مجھے کسی عورت کے ساتھ دیکھ بھی لو تو......"

"مجھے اعتبار ہے تم پر۔" یمی اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے بول پڑی تھی۔

"مگر تم جانتے ہو یہ ایک الگ بات ہے۔ مگر تم نے ٹھیک کہا...... میں ناراض نہیں ہوں گی۔" اس نے پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی تھی۔

خضر نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ اس پر

واقعی اسے اعتبار کے رنگ نظر آرہے تھے۔ وہ یمی کے گال کو محبت سے چھو کر سکون سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

یمی کے لبوں پر مسکراہٹ واپس آنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ ہر تلخی سے پیچھا چھڑا کر کچھ وقت اس سحر انگیز کیفیت میں رہنا چاہتی تھی، جس سے خضر نے اسے روشناس کرایا تھا۔ وہ گنگناتا...... جو اس کی سماعتوں میں گونج رہا تھا۔

And when you smile the whole world stops

☆☆☆

گاڑی سیاہ کولتار پر پھسلتی جارہی تھی۔ گرمی کی شدت اتنی تھی کہ سڑک پر بھاپ سی اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں تیزی سے اپنی اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ گاڑی ڈرائیو کرتا شمریز...... اور اس کے ساتھ بیٹھی شمائلہ! دونوں کے درمیان تیسری خاموشی تھی جس کی موجودگی اتنی مضبوط تھی کہ محسوس ہو رہی تھی۔ شمائلہ دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ شمریز نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ آج صبح ہی اس نے بابا سے کہا تھا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے شہر جا رہا ہوں۔''

''کتنے دنوں کے لیے......؟'' بہادر صاحب نے اخبار سامنے سے ہٹاتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرا دل نہیں لگ رہا یہاں۔''

''ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ اپنے دوستوں سے ملو...... احمر کی کمپنی انجوائے کرو، تمہیں اچھا لگے گا۔'' نصرت بیگم نے خوش دلی سے اجازت دی تھی۔ شمائلہ کو بھی اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں لگا۔

''میں بھی جانا چاہتی ہوں۔ لاسٹ ٹائم پھپھو خفا ہو کر گئی تھیں۔ کچھ دنوں میں واپس آجاؤں گی......''

''شمریز کا خیال رکھنا۔ اور اس کے سر سے اس لڑکی کا بھوت اتارنے کی کوشش کرو۔'' جاتے جاتے شمائلہ کو ماں نے خاص تاکید کی تھی۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''ان چاروں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے دل کے حال سے واقف نہیں تھا۔ انہیں کسی کے ارادوں کی خبر نہیں تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اپنی منزل کا سوچ رہے تھے۔

''بس خضر ایک بار میں تمہارے اور اپنے بیچ سے یمی کو نکال دوں۔ پھر اپنے بھائی کی زندگی سیٹ کر دوں گی۔'' ایک نظر شمریز پر ڈال کر وہ بھاگتے دوڑتے مناظر پر نظر مرکوز کیے سوچتی چلی گئی تھی۔

شمائلہ کو خضر سے ملنے کی جلدی تھی اور اپنے پلان پر عمل کرنے کی جبکہ شمریز......

گاڑی جتنی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ وہ اتنی ہی رفتار اپنے مقصد کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

آفس میں سارا دن نہایت مصروف گزر رہا تھا۔ وہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ سیکھنے کے مراحل سے بھی گزر رہا تھا اس لیے زیادہ محنت اور یکسوئی درکار تھی۔ آج سارا دن کام میں مصروف رہ کر اسے یمی سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ جو روزانہ وقفے وقفے سے کال کر کے وہ اس سے چند باتیں پوچھتا رہتا تھا۔ ورنہ اس کا شکوہ اس کو ازبر تھا۔

''یہ کیسی محبت ہے جو نظروں کے سامنے محسوس ہو، اور باہر جا کر سب فراموش......''

وہ یاد آنے پر زیرِ لب مسکرا دیا تھا۔ بابا نے اسے خاص تاکید کی تھی کہ اس کے جاننے والے کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں...... وہ جاتے ہوئے کچھ پھل اور جوسز لے جائے اور عیادت کر آئے۔ اور بھی انہیں کچھ ضرورت ہو تو خضر دیکھ لے...... ۲۱۱

لنچ بریک میں آفس چھوڑ کر عیادت کی غرض سے ہاسپٹل آگیا تھا۔ اس کے اردگرد اسپتال کی مخصوص ناگوار بو پھیلی تھی۔ نتھنوں سے ٹکرا کر دماغ میں گھسنے کی کوشش کرتی بو...... فینائل کی تیز بدبو، ادویات کی بو، صفائی کے مینوں کے بستروں سے اٹھتی...... صفائی کے

صفائی کے عملوں نے ان سب کا مجموعہ بنا کر پورا ماحول بوجھل کر رکھا تھا۔ گورنمنٹ ہاسپٹل کا یہ طویل وارڈ تھا، جس میں دور دور یہ بستر لگے تھے۔

''بی بی آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔''

ڈاکٹر کی زچ آواز خضر کے کانوں پر پڑی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔

''پڑھی لکھی ہیں کچھ؟'' وہ چپ رہی۔

''جب خوراک کی نالی پاس ہو رہی ہے تو منہ سے پانی کیوں ڈالتی ہیں؟''

''نہیں......'' ہاتھ مسلتی لڑکی نے سر اٹھایا۔

''کیا......؟'' ڈاکٹر جواب دینے کے لیے دیکھنے لگا۔

''ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں ان کے...... خود اشارہ کرتے ہیں۔'' بے حد شکستہ آواز چغلی کھا رہی تھی کہ وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے۔

''وہ غنودگی میں ہے۔ آپ تو کچھ عقل مند ہیں۔'' وہ مریض کی پتلیاں چیک کرنے لگا تھا۔

''آپ کے ساتھ کوئی ہے؟''

''نہیں۔''

''بہرحال مریض کی کنڈیشن میں کوئی بہتری نہیں۔''

''جی؟''

''ہیپاٹائٹس سی بگڑ چکا ہے۔ پورے جسم میں پھیل کر ہڈیوں میں گھس گیا ہے۔ تلی کا سائز بھی بڑھ گیا ہے۔''

''ٹی بی بھی ہے۔''

''لیکن علاج؟'' اس کا گلا رندھ گیا۔

''بی بی! علاج ایک حد تک ہوتا ہے۔ اب تک کہاں تھیں آپ جب مریض اس حالت کو پہنچ گیا۔''

خضر نے ڈاکٹر کی بات سنی تو اس کے اندر تاسف سا پھیل گیا تھا۔ پھر لڑکی کی کپکپاتی آواز اس کی سماعتوں میں پڑی۔

''میرا کوئی نہیں ہے۔'' خضر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر اس کی صرف پشت دکھائی دے رہی تھی۔

سر جھٹک کر اس نے سامنے لیٹے شخص کو حوصلہ دیا اور رسمی گفتگو کے بعد انہیں مشورہ بھی دیا کہ وہ پیشنٹ کو کسی اچھے ہاسپٹل لے جائیں۔ لیکن وہ اس علاج سے بھی مطمئن لگ رہے تھے۔

خضر کچھ دیر بعد اٹھ کر جب جا رہا تھا جو قریب سے گزرتے ہوئے اسے اس لڑکی کی سسکی سنائی دی۔ خضر بے اختیار دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اک اجنبی لڑکی کو مخاطب نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو مخاطب کر کے پوچھے کہ کیا اسے کس مدد کی ضرورت ہے؟

وہ اب چہرے سے آنسو صرف کرتی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے اجنبیوں کی بھیڑ میں شرمندگی مٹا دینا چاہتی ہو۔ خضر کے لیے یہ چہرہ بالکل اجنبی تھا۔ ہلکی سی چھایا، چہرے کے کچھ بولتے نقوش جیسے اس سے ملتا جلتا چہرہ وہ دیکھ چکا ہو۔ نقوش شناسا سے تھے۔ وہ سوچ جھٹکتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے پاس گیا اور نرمی سے پکارا۔

''ایکسکیوزمی...... کیا آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہے؟''

ثانیہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور ناگواری سے اس شخص کو دیکھا جو اس کے رونے میں خلل ڈالنے چلا آیا تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' بلا کے تیکھے لہجے میں کہہ کر وہ دوسری سمت دیکھنے لگی۔

کیا وہ جانتی نہیں تھی کہ اجنبیوں پر بھروسا کرنا کیسے خود مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جیسے حالات تھے...... وہ اکیلی ضرور تھی۔ لیکن کسی موقع پرست کی بھینٹ چڑھنے والی نہیں تھی......!!

''دیکھیے! میرا مقصد آپ کو تنگ کرنا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ہاسپٹل ہے اور یقیناً آپ اکیلی ہیں...... ایسے وقت میں کسی کی ہیلپ لینا برا نہیں ہے۔ بلکہ یہ آپ کے مریض کے لیے فائدہ مند

ثابت ہو سکتا ہے۔"
خضر کے مہذب اور پر اثر لہجے نے ثانیہ کو اس کی بات سننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی خاموشی محسوس کر کے خضر گویا ہوا۔
"آپ پلیز دو منٹ باہر آ کر بات سن لیں...... میں ویٹ کر رہا ہوں۔" خضر کہہ کر چلا گیا۔
ثانیہ کو اس کے پیچھے جانا عجیب معلوم ہوا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ خضر وارڈ ڈور کے ساتھ راہداری میں کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے تو اسے اٹھنا ہی پڑا۔
"آپ اکیلی ہیں؟" خضر نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ثانیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"آپ کے پیشنٹ سریس لگ رہے ہیں...... مگر اللہ پر بھروسا رکھیں، وہ اس حالت میں لانے والا ہے تو اس حالت سے نکالنے والا بھی ہے۔"
خضر کی دل کو ڈھارس دیتی بات سے مارے تشکر کے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔
"اب مجھے بتایئے...... آپ تو بہت کم عمر لگ رہی ہیں، یہ سب کیسے دیکھ رہی ہیں؟ آپ کو یہاں کیا مسائل درپیش ہیں؟"
خضر نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ ثانیہ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کن کن مسائل کا تذکرہ کرے۔
"انہیں مسئلہ کیا ہے؟" خضر نے اس کی خاموشی محسوس کر کے سوال بدل دیا تھا۔ ثانیہ نے گلا صاف کیا۔
"ہیپاٹائٹس، ٹی بی وغیرہ بتا رہے ہیں۔ ان کا پی سی آر ٹیسٹ ہونا ہے۔ میں ہاسپٹل کی لیبارٹری سے کروانا نہیں چاہ رہی رپورٹ تین ہفتے بعد دیتے ہیں...... تب تک انتظار نہیں ہو سکتا۔" ثانیہ کو جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ اس نے خضر کے سامنے دہرا دیں۔
"پرائیویٹ لیب سے پی سی آر رپورٹ چار دنوں میں مل جاتی ہے۔" خضر کے کہنے پر ثانیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ اس رپورٹ کی فیس بہت زیادہ تھی جو وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔
"اس رپورٹ کی فکر مت کریں آپ۔"
خضر نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ ثانیہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔
"ان کا ٹریٹمنٹ ٹھیک چل رہا ہے؟" خضر نے اسے بولنے نہیں دیا تھا۔
"کچھ انجیکشنز پر ایم ایس کے سائن کروانے ہیں...... اور یہ لوگ وہیل چیئر نہیں دیتے بغیر شناخت کے۔ ٹیسٹ کرانے جانا ہے نا......"
ثانیہ کی آواز بالکل مدھم ہو گئی تھی۔ نجانے کیوں وہ اس شخص کو بتانے پر مجبور ہو گئی تھی...... شاید اتنے دنوں کی خواری نے اسے تھکا دیا تھا۔ اور وہ درست کہہ رہا تھا کہ اس کی خاموشی کرم الٰہی کو ٹھیک نہیں کر سکتی تھی۔
"آپ اسی شہر کی ہیں؟" خضر کو اس پر ترس آ رہا تھا۔
"جی نہیں......" ثانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"ہم مثل بہشت...... مطلب ایک گاؤں سے آئے ہیں۔"
"واقعی......؟" خضر کے چہرے پر ایک دم سے حیرانی چھا گئی تھی۔
"میں بھی مثل بہشت سے ہوں۔"
خضر کے بے ساختہ بتانے پر اب ثانیہ حیران ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک ایکسرے کرتی نگاہوں سے خضر کا جائزہ لیا...... آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی...... یہ شخص یقیناً جھوٹ بول رہا تھا۔ ثانیہ کو اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا......!!
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)
☆☆

سیما بنت عاصم

گرمیوں کی جلتی بلتی دوپہر میں گڈو نے گھر کے دروازے سے باہر جھانکا تھا۔ بے ڈھنگی پتلی سی گلی میں یہاں سے وہاں تک سناٹا کوک رہا تھا۔ گڈو نے دو قدم آگے بڑھا کر ادھر ادھر تاکتے منو سے کہا تھا۔
"اے منو! آ، گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔"
"یار! ابا مارتا ہے" منو کا دل تو للچا رہا تھا مگر گڈو نے حوصلہ بڑھایا۔
"اے چل۔ ابا کیا تیرے سر پر بیٹھا ہے؟"
گڈو کی بات ٹھیک تھی۔ منو کی ماں فوزیہ کمپنی میں کام کرتی تھی۔ فوزیہ کے سدھارنے کے بعد اس کا ابا رضوان جو منہ سر لپیٹ کر پڑتا تو شام گئے کی خبر لاتا۔ آج اتوار تھا اور فوزیہ شوہر کے ساتھ ہفتہ بھر کے سودا سلف کی خریداری کے لیے بازار گئی تھی۔
اگلے ہی پل گڈو اور منو گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ گڈو منو سے کچھ سال بڑا تھا۔ اور بری مہارت سے اپنے کھیل کھیلتا تھا۔ مگر اس سے چوک ہو گئی۔ ڈنڈا گھمایا تو منو کے سر پر پڑا۔ منو بلبلا اٹھا، ضرب شدید تھی۔ اگلے ہی پل منو، گڈو کی ویسے ہی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ جیسے منو کا باپ کبھی کبھار اس کی چلتر باز ماں کی بدزبانی کے جواب میں اس کے خاندان کو ادھیڑا کرتا تھا۔
"اے او...... میری ماں بہن تک مت پہنچنا۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"
"اے چل...... دنیا جانتی ہے۔ تیرا باپ نے چھپ چھپا کر تیری ماں سے دوسرا نکاح پڑھا رکھا ہے تب ہی تو وہ تمہیں منہ نہیں لگاتا۔ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ڈر سے ہفتہ ہفتہ بھر تمہاری شکل نہیں دیکھتا۔"
منہ چھوٹا اور بات بڑی تھی۔ مگر یہ وہ بات تھی جو زبان در زبان سفر کرتی ہر اک کے کانوں تک پہنچ کر اب سالوں پرانی بھی ہو چکی تھی۔ گڈو یہی بات لے کر گھر پہنچا تو اس کی ماں فریدہ کچن میں کھڑی روٹی بیل رہی تھی۔ گڈو کی بات سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بات تو سچ تھی مگر بات تھی رسوائی کی۔
بات بہت پرانی تھی۔ مگر لوگ ایسی باتیں بھلا کہاں بھولا کرتے ہیں۔ فریدہ شادی سے پہلے زاہد احمد کی کمپنی میں کام کرتی تھی۔ زاہد احمد فریدہ پر دل ہار بیٹھا تھا۔ زاہد احمد مال دار مگر جوان بچوں کا باپ تھا۔ اسی دباؤ میں فریدہ سے خفیہ نکاح کر کے قصداً اک نچلے درجہ کے علاقہ میں گھر لے کر دے رکھا تھا۔ فریدہ، جو اب فری کہلاتی تھی، کو اس نے ایک پر آسائش زندگی دے رکھی تھی۔ اور فری کے لیے یہ کبھی کم نہ تھا۔ زاہد احمد کا پڑاؤ اپنی پہلی بیوی بچوں کے پاس رہتا

تھا۔ بھی موقع نکال کے چپ چپاتے فری اور بچوں سے ملنے آ جایا کرتا۔

فری تلملاتی ہوئی گھر سے نکلی تھی۔ اور اپنے دروازے کے سامنے پڑے پتھروں کے ڈھیر سے اک کے بعد اک پتھر اٹھا کر منو کے دروازے پر پتھراؤ کرتے، فوزیہ کے لیے زہر اگلتے ہوئے وہ یہ بھی بھول گئی کہ فوزیہ اور رضوان گھر پر نہیں ہیں۔

"دو ٹکے کی عورت۔ اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھا ہے کبھی؟ گھر سے باہر نوکری کے بہانے جو گل کھلاتی پھرتی ہے۔ دنیا دیکھتی ہے۔ ہر دوسرے دن نیا آدمی اسے اسکوٹر بٹھا کر گھر چھوڑنے آتا ہے۔ جیسے اپنی کمائی کے بل بوتے پر اپنے نکھٹو مرد کو جوتی کے نیچے دبا رکھا ہے۔ دنیا کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک دے گی؟"

فری کی فراٹے بھرتی زبان مسلسل فوزیہ کے لیے مغلظات بکتی رہی۔ کافی دیر فوزیہ کے لیے بک بک کر کے وہ کھولتی ہوئی واپس گھر میں لوٹ گئی تھی۔ مگر فوزیہ کے لیے فری کی یہ گل افشانیاں، گلی کے وسط میں غول بنائے خوش گپیاں ہانکتے ہوئے چند بے فکری بیبیوں کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ اور فوزیہ کی واپسی پر بڑھاوے چڑھاوے دے کر اس کے کانوں میں اتاری گئی تھیں۔ فوزیہ کے تلووں سے لگی سر پر بجھی۔ اگر فری کے لیے کہی گئی فوزیہ کی بات درست تھی تو فوزیہ کے لچھن بھی فری کے بیان کے عین مطابق ہی تھے۔ فوزیہ کا میاں رضوان اس سے دبتا تھا کہ گھر فوزیہ کی کمائی سے ہی چلتا تھا۔ بے غیرتی و بے شرمی سمیت نکھٹوؤں کے تمام اوصاف رضوان میں سرتاپا موجود تھے۔

زاہد احمد کی پہلی بیوی سے رضوان کی دور پرے کی واقفیت بنتی تھی۔ اسی بات کی آڑ لے کر رضوان آنے بہانے زاہد احمد سے رقمیں اینٹھتا رہتا تھا۔ فوزیہ سے چوری چھپے، رضوان کا پان گٹکا زاہد احمد کے دم قدم سے ہی چلتا تھا۔ فوزیہ نے اپنی انتقامی فطرت کی تسکین کے لیے فری کے شوہر زاہد احمد کے آنے تک رضوان کو اتنا چڑھا دیا تھا کہ رضوان نے زاہد احمد کو اک بڑھک مار کر گھر سے نکال دیا۔ اور بات گالم گلوچ سے ہاتھا پائی تک پہنچی تو کیا ڈنڈے لاٹھیاں نکلتیں سو خوب ہی سر پھٹول ہوا۔ معاملہ پولیس تھانہ تک جا پہنچا تو زاہد احمد پیر کی جیب دکھا کر نکل گیا۔ ادھر فوزیہ کی بھی کچھ صاحب سلامت کام آئی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر اس دے میں جو دھول اڑی۔ اور کیچڑ اچھالی گئی۔ وہ قابل افسوس ہی نہیں لائق صد صف بھی تھی۔ گندوا منو کے گھرانوں میں بھی جرم کے کھرے جا ملتی تھی۔ جو دلوں میں اک نہ ختم ہونے والی خلش ڈال دیتی ہے۔

☆☆☆

اسی گھٹے ہوئے تنگ و تاریک مکانات پر مشتمل بے ڈھنگی پتلی سی گلی کے وسط میں سب سے اونچا اور عالی شان مکان انیسہ کا تھا۔ انیسہ کے شوہر شفیق کو جب سے باہر کی ہوا لگی تھی۔ مانو دن ہی بدل گئے تھے۔ گھٹے ہوئے تنگ و تاریک گھر کا سارے کا سارا ڈھا کر ٹائل ماربل سے لش پش کرتا دو منزلہ مکان گلی سے چھ فٹ اونچائی پر تھا۔ بیرونی دیوار کے ساتھ بنا ماربل کا ٹھنڈا ٹھار چبوترا دن میں کئی بار بجتا۔ گرمیوں میں بجلی کی لمبی لمبی لوڈ شیڈنگ چلتی تو محلہ کی بھلی بیبیاں کھلی ہوا کے بہانے اس چبوترے پر فراغت کی سانسیں گنتیں۔ اور جہاں چار بیبیاں جڑ کر بیٹھتیں تو کہاں ممکن تھا کہ دوسریوں کے بخیے نہ ادھیڑے جائیں۔ ان کا کام ہی محلہ کے دروازوں اور گھروں کے معاملات پر نظر رکھنا ان پر مقدور بھر تبصرے یا کھود کرید کر...... مرچ مسالا لگا کر آگے بڑھانا تھا۔ بی بی سی کی یہ نشریات بلا تعطل چلتیں۔

آج کل کا خاص موضوع تھا "سمیہ کی شادی۔" ہفتہ بھر پہلے بھگتائی جانے والی سمیہ کی شادی کا عوت نامہ محلہ کے گنے چنے کماتے پیتے لوگوں کو ہی ملا تھا اور ولیمہ کی ہوا تو ان کو بھی نہ نصیب ہوسکی کہ کب بالا ہی بالا بھگتایا گیا۔ مبادا محلہ والے راستہ ہی نہ تاک لیں۔ خیر سے۔ مزاج و خواہش کے عین مطابق سمیہ کے لیے خاصا اونچا اور لمبا ہاتھ مارا گیا تھا۔ نچلے درجے کے عام سے علاقہ کی پوش مال دار فیملی کے بنگلے میں بیاہ کر جانا کوئی کم کمال نہ تھا۔

اسلام صاحب نے سرکاری نوکری بھگتائی تھی۔ اور ان کی شخصیت کا سارا قرینہ اور رکھ رکھاؤ۔ ان کی فیملی اور گھر میں بھی نظر آتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بہاولپور سے کراچی فیملی سمیت شفٹ ہوئے انہیں کچھ ہی عرصہ گزرا تھا۔ گریجویٹی اور فنڈ کی رقم دو بیٹیاں عالی شان گھرانوں میں بیاہنے میں پھونک کر اکلوتے کو کسی بیٹے امید پر شاپ کروا کے دی تھی۔ وہ من پسند شادی کر کے منہ پھیر گیا۔ سو گھر اب صرف پینشن پر چلتا تھا۔ بیگم اسلام کے گھر و مزاج میں اک سلیقہ قرینہ نظر آتا تھا۔ مگر مزاج کا نازنخرہ۔ الامان الحفیظ ...... وہ محلہ والوں سے ذرا لیے دیے ہی چلتیں۔

سمیہ کی لاکھوں میں ایک صورت پر انہیں گھمنڈ بھی بہت تھا۔ جب جلتیں اس کی تعریفیں ہی کرتی نظر آتیں۔ جانے کن بھلے وقتوں میں فردوس کے دیور کو سمیہ بھا گئی تھی۔ مگر سمیہ کے لیے بیگم اسلام کی نظریں اونچائی پر سفر کرتی تھیں۔ فردوس کے دیور کا عام سا رشتہ کیا خاک نظروں میں سماتا۔ سو کسی بہانے ٹال دیا گیا تھا۔ سمیہ کی شادی کی زیادہ کھد بد فردوس کو ہی تھی۔ جس کے دیور کا رشتہ معمولی حیثیت کی بدولت رد کر کے حسین ترین سمیہ کو اک اڈھیر عمر سے بیاہ دیا گیا تھا۔

فردوس، عصمت اور بانو کے انیسہ کے پاس۔ اس کے گھر کے چبوترے پر آن بیٹھنے کے بعد ان کی بات چیت ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ گلی کے داخلی نکڑ سے اک سوزوکی گلی میں داخل ہوتی دکھائی دی تھی۔ بے ساختہ ان سب کی کھوپڑیاں بھی اس سمت کو مڑ گئی تھیں۔ سوزوکی نکڑ سے دوسرے، ضیاء کے گھر کے داخلی دروازے پر ٹھہر گئی تو ان سب کی نظروں کے تبادلے کے ساتھ اشارے کنایے چلے۔

گلی کے اسی نکڑ پر پہلا گھر اسلم کا پڑتا تھا جس کے مکان کے احاطہ سے سڑک کے رخ کو کھلتی پرچون کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اسلم اپنی پرچون کی دکان سے محلے کے ہر معاملہ پر نظر رکھ کر اسے ہوا دے کر آگے بڑھانے میں کمال رکھتا تھا۔ سوزوکی کے گلی میں موڑ کاٹتے ہوئے نظر اس کی بھی ٹھہری تھی۔ دکان کے اکا دکا گاہک عجلت میں بھگتا کر اگلے ہی پل وہ گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ سوزوکی اس کے پڑوسی ضیاء کے دروازے پر کھڑی تھی اور اب نیا نکور لش پش کرتا فل سائز فریج سوزوکی سے اتارا جا رہا تھا۔ اسلم حسد و نارسائی کے ایک جلتے سلگتے احساس سے بل کھا کر رہ گیا۔ وہ دن رات اپنی دکان کی بڑھوتری اور حال میں اضافے کے خواب دیکھتا۔ مگر اپنی دہائیاں دیتی جیب کے سبب لاکھ جتن پر بھی قاصر تھا۔ کہ خیر سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ ایک نہ دو۔ نو، جی تھے۔ جو بچت پڑتی پیٹ کا ایندھن بن جاتی۔ خواب کیا خاک پورے ہوتے۔

"ہونہہ...... موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی۔" اسلم نے اک حسد و تنفر سے سر جھٹکا تھا۔

فریج سوزوکی سے اتار کر اب ضیاء کے گھر میں جا چکا تھا۔ نئے نکور فل سائز جدید فریج کی قیمت لاکھ سوا لاکھ سے تو کیا ہی کم ہی ہوگی۔ یہی سوا لاکھ اگر اس کی جیب میں رہتے تو دن ہی نہ بدل جاتے۔

وہ کھولتا ہوا واپس دکان میں جا بیٹھا تھا۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے جب ضیاء...... نے گھر کا پرانا فرنیچر بدل کر جدید طرز کا فرنیچر گھر میں ڈلوایا تھا۔ اور یہ ایک دو بار کی بات نہ تھی۔ ضیاء کے گھر میں آئے روز یوں ہی کسی نہ کسی نئی اور جدید چیز کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ رہ گئے وہ زمانے جب اسلم کی دکان پہ ضیاء کا کھاتہ چلتا تھا۔

ضیاء کسی ہوزری گارمنٹس فیکٹری میں مشین آپریٹر تھا۔ اس کی فیکٹری پر سیل لگی تو در در نوکری کی خاک چھاننے کے بجائے اپنے ہی گھر کی بالائی منزل پر دو چار مشینیں لگا کر ادھر ادھر سے ٹھیکے

پکڑے۔ اور اک آدھ واقف کار کو ساتھ لگا کر گھر ہی میں ہوزری گارمنٹس کا کام شروع کر دیا۔ پھر یہ کچھ ہی دنوں کی بات رہی کہ ضیاء کا کام خوب اچھا چل نکلا اسے دھڑا دھڑ ٹھیکے ملنے لگے تو مشینوں، مزدوروں میں بھی اضافہ ہوا۔

ضیاء اکثر اس کی دکان پر سگریٹ پینے کے لیے ٹھہرتا۔ مگر اسلم کے کم مائیگی کے دکھڑوں پر اک چپ اس کے لبوں پر رہتی۔ اسلم کے دکان داری کے معاملات میں ہیرا پھیری اور چوری چھپے ان اشیاء کی خرید سے واقف تھا، جن پر قانونی پابندی تھی۔ اسلم ایمان داری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کے چلتا تو چل پڑی دکان داری پہلے ہی اس کے گھر میں کھینچ تان چلتی تھی۔ اکثر وہ اسلم کی کم مائیگی پر اسے نشانہ بھی بنا جاتا تھا۔ سو، اسلم کے دل میں کے لیے خلش پلتی تھی اور یہ خلش آنے بہانے روزن مانگتی تھی۔

اسلم کا بل کھاتا کھولتا دماغ اک نکتہ پر مرتکز ہو کر رہ گیا تھا۔ ان وقتوں میں کچھ فراغت میسر رہا کرتی تھی اسلم نے چور نظروں سے ادھر ادھر تاک کر عرصہ سے اپنے دل و دماغ میں پکتے اک منصوبہ کی تکمیل کے لیے کاؤنٹر کی دراز سے تازہ ترین بجلی کا بل نکال کر اس پر اک نظر ڈالی تھی۔ اگلے ہی پل وہ اپنے موبائل سے ایک نمبر پر کیس کر رہا تھا۔

☆☆☆

سمیہ جب بھی...... میکہ آتی یہ لمبی کار گلی کے کونے پر آ کر ٹھہرتی انیسہ عصمت اور فردوس جیسی ٹوہ رکھنے اور چھ کی چھتیس بنا کر پھیلانے والی عورتوں کے پاس سمیہ کے شوہر اور سسرال والوں کی امارت کی ڈھیروں ڈھیر باتیں تھیں۔ جو انیسہ کی زبانی ہر کسی کے کانوں تک جا پہنچی تھیں کہ انیسہ اپنی فراخ حیثیت کے سبب شادی میں شریک رہی تھی۔

فردوس کا گھر سمیہ کے پڑوس میں تھا۔ فردوس کی بیٹی ہیرا بڑی حرفوں کی بنی تھی۔ آنے بہانے سمیہ کے پہلو میں جا گھستی۔ اڑتی پڑتی سننے میں آئی کہ سمیہ کا ادھیڑ عمر میاں دماغ کا ٹیڑھا اور مزاج کا شکی تھا۔ اور فردوس کے سانپ لوٹتے سینے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ خیر، اتنا تو سب ہی جانتے تھے۔ یہ کا رشتہ اس کی بیاہی بہن کی جوڑ توڑ سے اس کے پڑوس میں طے پایا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بیگم اسلام جوان جہاں حسین سمیہ کو کئی کئی دن بیاہی بچی کے گھر چھوڑ کے رکھتیں تاکہ پوش گھرانے کی نظر میں سمائے تو ڈھنگ کا بر جڑ سکے اور وہی ہوا تھا۔

سمیہ اونچے گھرانے میں بیاہی گئی تو بہت بچ سنبھل کے چلتی۔ محلہ والوں کو وہ پہلے بھی کم ہی منہ لگاتی تھی۔ اب تو خیر سے دماغ آسمانوں پر سفر کرتے تھے۔ سو وہ فردوس کی چلتر باز بیٹی کے لاکھ دکھاووں پر بھی رتی بھر نہ کھل سکی۔ ہیرا بھی اپنے نام کی ایک تھی، نہ نہ کرتے بھی سمیہ کے موبائل سے اس کے شوہر کا نمبر اڑانے میں تو کامیاب ہو ہی گئی، مانو فردوس نے میدان ہی تو مار لیا تھا۔ اک خوشی و فتح کے احساس سے اس کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئی جا رہی تھیں۔ اس نے اگلے اقدام کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اور ہیرا کو اپنا آلہ کار بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”کان کھول کے سن لے کہ اب تو نے کرنا کیا ہے۔ اور سن گلا گھونٹ کے مار ڈالوں گی اگر کسی کو ہوا بھی دی۔“ فردوس...... ہیرا کے کان میں جا گھسی تھی اور وہ اطمینان سے سیب کی قاشوں پر قاشیں نگلتے ہوئے سر ہلاتی رہی۔

☆☆☆

ضیاء...... کے گھر کی اوپری منزل پر بجلی کے محکمہ کا چھاپا پڑا تھا۔ ضیاء چھپ چھپا کر چھوٹے سے کارخانہ کی مشینیں گھریلو میٹر پر چلاتا تھا۔ اس نے چھاپا مار ٹیم کی مٹھی گرم کر کے وقتی طور پر معاملہ دبا دیا تھا مگر کیس ریکارڈ پر چڑھ کر محکمہ کی نظر میں آ گیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں ضیاء کے گھر کے باہر کمرشل میٹر ٹھونک کر لمبا چالان ضیاء کے سر ڈال دیا گیا۔ کمرشل میٹر کے بھاری بھرکم چارجز سے ضیاء کی ساری نہیں تو آدھی آمدنی تو ٹھکانے لگ ہی جاتی تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا کہ یہ چھاپا مخبری پہ پڑا تھا۔ اس کا خیال گھوم پھر کر اسلم کی جانب ہی جاتا تھا۔ محلّہ میں اس کی سب سے زیادہ اسلم ہی سے ہٹی ہوئی تھی کہ معمولی سے تنازع پر اک بار ہاتھا پائی بھی چل گئی تھی۔ محلّہ داروں نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں گلے تو ملوا دیا تھا مگر اسلم اب بھی اس کے لیے دل میں خار رکھتا۔ اور یہ ضیاء بھی جانتا تھا۔ مگر اسلم یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی دکان پر چوری چھپے جن غیر قانونی اشیاء کی خرید و فروخت رکھتا ہے اس کی ہوا ضیاء کو بھی ہے۔

☆☆☆

عمر کے ادھیڑ عمر باپ نے پرانی کھٹارا اسکوٹر عصمت کے دروازے کے سامنے روکی تو عمر کی اماں دھیرے سے اسکوٹر سے اتر آئی تھیں۔

”ذرا بچ سنبھل کے بھاگوان...... اور سن کام ذرا ہوشیار سے کرنا ہے۔ یاد رکھنا آج آخری پھیرا ہے۔ وار ٹیڑھا نہ پڑے۔“

عمر کی اماں کے جھریوں زدہ چہرے پر میاں کی بات پر اک مکار مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ انہوں نے اک محتاط نظر آس پاس دوڑائی تھی۔ دوپہر کا وقت اور بجلی غائب تھی۔ گلی میں ادھر ادھر خوش گپیوں میں لگی بیبیوں کے غول اور کھیلتے کودتے بچے نظر آ رہے تھے۔ سو، وہ بالائی منزل کو جاتا زینہ چڑھ گئی تھیں۔ بالائی منزل پر عمر کی مالک مکان عصمت تھی۔ عمر کے والدین اسی طرح آتے اور بالا ہی بالا عمر سے ملاقات کر کے لوٹ جاتے۔ ان کے نوجوان بیٹے عمر نے چار بچوں کی ماں رعنا سے شادی کر کے ان کے سفید چونڈے میں جو دھول جھونکی سو جھونکی برادری نے بھی ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ عمر کی منگ کی شادی کہیں اور ہو گئی تھی مگر اس کے وٹے میں بیاہی جانے والی عمر کی بہن، عمر کی شادی کی پاداش میں سالوں سے میکے کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔ یہ پرانی کہانی تھی۔ جسے مرچ مسالا لگا کر زبان در زبان پہنچانے میں عصمت کے سوا کس کا ہاتھ تھا۔ نئی کہانی یہ تھی کہ عمر کی منگ بیوہ ہو کر پلٹ آئی تھی۔ اب برادری سے تعلقات جوڑنے اور گھر بیٹھی بیٹی کو لوٹانے کے لیے عمر کی اپنی منگ سے شادی شرط تھی اور یہ ساری کوششیں اسی مد میں تھیں کہ عمر رعنا کو چھوڑ کر والدین کے پاس لوٹ آئے۔

وہ کچھ دیر عصمت کے گھر بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہیں۔ کچھ دیر میں بجلی آ گئی۔ عمر کی اماں نے عصمت کے گھر کی کھڑکی سے گلی میں جھانکا۔ میدان صاف تھا۔ فراغت کی ماری محلہ کی بیبیاں اپنے گھروں کو سدھار گئی تھیں۔ وہ عجلت میں زینہ اتری تھیں۔ اک محتاط نظر آس پاس دوڑائی۔ گلی میں دور دور تک سناٹا تھا۔ چلتے چلتے غیر محسوس انداز میں لباس میں چھپا تعویز عمر کے گھر کی بیرونی دروازے کی چوکھٹ پر چپکا کہ وہ گزرتی چلی گئی تھیں کہ گلی سے پرے چھپ چھپا عمر کا ابا ان کا منتظر تھا۔

کسی دانشور کا فرمان ہے کہ اگر کسی نے تمہاری راہ میں کانٹا رکھ دیا تو تمہیں چاہیے کہ اس کانٹے کو اٹھا کر پھینک دو۔ اگر تم نے بھی اس کی جگہ کانٹا رکھ دیا تو دنیا میں ہر جگہ کانٹے ہی کانٹے نظر آنے لگیں گے۔

فردوس نے بیٹی کو آلہ کار بنا کے سمیہ کے شوہر کا نمبر اڑایا تھا۔ بہنوئی سے مراسم کو نمک مرچ لگا کر اک خفیہ کال کے ذریعہ سمیہ کے شکی مزاج شوہر کے کانوں میں اتارا گیا تھا۔ سمیہ کچھ ہی دنوں میں طلاق کا پرچا لے کر واپس لوٹ آئی۔

اسلم کی دکان پر چھاپا پڑا۔ اسلم کو غیر قانونی اشیاء کی خرید و فروخت پر پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ اور یہ ضیاء کی مخبری پر ہوا تھا۔

زاہد احمد کی بیوی نے اسے رنگے ہاتھوں جا پکڑا تو گلی میں خوب ہی تماشا بنا۔ اور وہ گالم گلوچ اور الزام تراشی چلی کہ دنیا نے سن کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ سب سے بڑھ کر چٹخارا فوزیہ اور رضوان نے ہی لیا تھا کہ یہ آگ ان ہی کی لگائی ہوئی تھی۔

یہ وہ خار ہیں۔ جو جا بہ جا نظر آتے ہیں۔ اور ان کی وجہ...... حسد...... انتقام...... دلوں کی کدورتیں......!!

☆☆

فلک تنویر

ہجرت کا زخمی قصہ

"آزادی واحد وہ لفظ ہے جو قلم کی سیاہی سے نہیں، خون کی لالی سے لکھا جاتا ہے۔"

آسمان کے دامن میں رات سو رہی تھی اور صبح کی روشنی یوں جیسے دھرتی کا ماتھا چومنا بھول چکی تھی۔ ٹرین کی سنگلاخ پٹڑی پر جگہ جگہ گاڑھا خون ایسے چپکا ہوا تھا کہ جیسے کسی نوآموز مصور کے رعشہ زدہ ہاتھوں سے رنگوں کا ڈبا گر گیا ہو لیکن یہ بے دھیانی بھی ایک خوب صورت تمثیل بنا بیٹھی ہو......

ٹرین کی پٹڑی کے خانوں میں بھرے پتھروں میں ارتعاش پیدا ہوا اور یہاں منتشر گھات لگائے سکھوں کے کان کھڑے ہوئے، ہاتھوں میں پکڑیں تلواروں کی چمکیلی اور نوکیلی سطح پر روتے چاند کے آنسو چمکتے دکھائی دیے۔

سامنے دیکھو تو ایک نحیف بوڑھا ہندو، جس کے لمبے لمبے ہاتھ، جس میں نیلی رگیں کسی زہر سے بھری سپنولیاں دکھائی دے رہی تھیں، سرعت سے لاشوں کے گلوں، ہاتھوں اور انگلیوں سے زیورات نکالنے میں مصروف تھے۔ دفعتاً اس کو دور کوئی چھپا سکھ دکھائی دیا۔ اس نے دو پیر اپنے کیے، دو پرائے اور بھاگ کھڑا ہوا۔

"اور لاشیں گراؤ مترو!" اس کے کوئلہ جیسے ہونٹ نا ختم ہونے والی مسکراہٹ میں ڈھلے۔ مترو کی تلوار پر گرفت مضبوط ہوئی اور آنکھوں میں شیطانیت کی نرتکہ کا رقص شروع ہوا۔

دور آتی ٹرین کھچا کھچ بھری تھی۔ پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ اوپر فضا میں سیاہ دھواں، صاف آسمان کو چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔

نیچے ایک ڈبے میں ...... منہ پر کناری لگے دوپٹے کا پلو رکھے افنان بی بی دبی دبی سسکیاں بھر رہی تھیں۔

"میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا...... ایسے کس کر...... مجھے ڈر تھا کہ اس کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ جائے گا اور اس کا ہاتھ چھوٹ گیا...... وہ کہہ رہی تھی کہ اماں میرے پیروں میں کانچ لگ گیا ہے اور میں نے سن کر نظر انداز کر دیا تھا کہ برداشت کر لے گی۔ جب اس کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا تو میں نے آخری بار اس کو گرتے دیکھا...... اس بدقسمت نے مجھے آخری بار دیکھا ہی نہیں......" افنان بی بی کے ہونٹ لرز رہے تھے اور یوں کہہ رہی تھیں کہ جیسے سب لوگ ان کو سن رہے تھے اور ان کے غم میں برابر کے شریک ہوں۔ سامنے سینے سے لگائے اپنے نوزائیدہ بیٹے کو دودھ پلاتے چاچی بھی رو رہی تھیں۔

اوپر بیٹھے لوگوں کے چہروں پر اداسی تھی اور آنکھیں بے تاثر اور خالی...... آزادی بہت کچھ چھین لیتی ہے۔ گھر، مال و متاع تو عام سی بات ہے۔ خود کو کھو دینا اور پھر خود کو ڈھونڈتے رہنا...... یہ دکھ روح کو زخمی کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

دفعتاً اوپر ہلچل مچی۔ چاچی نے اپنے روتے بیٹے کو کس کر گلے سے لگا لیا۔ اس بے نام بچے کی ریں ریں باہر کے شور میں دبنے لگی۔ افنان ہنوز خود
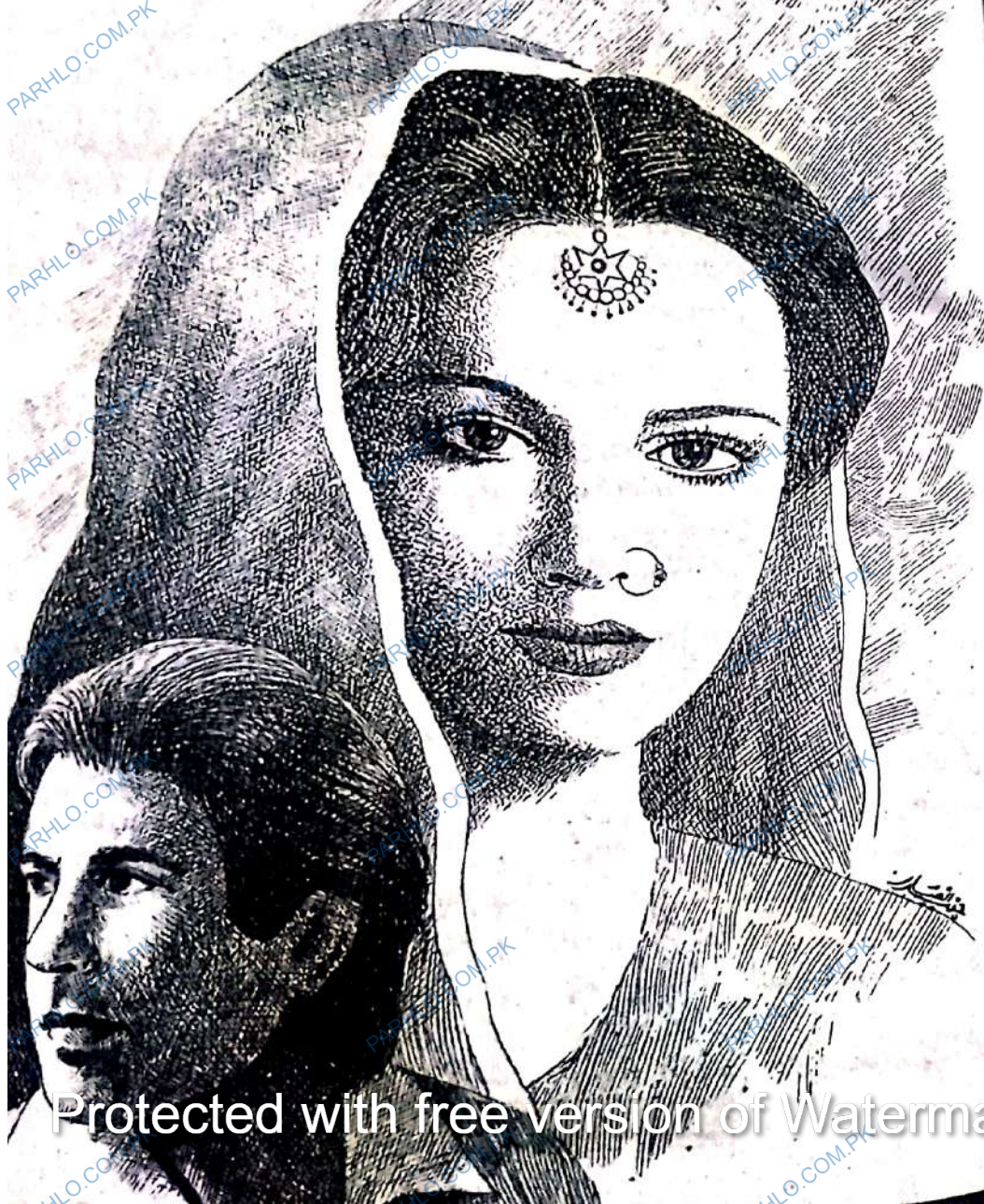
سے باتیں کیے جارہی تھیں۔ ایسے میں کسی عورت کی دلخراش چیخ بلند ہوئی اور اسی چیخ کے پیچھے کئی مردوں کے "اللہ اکبر" کے نعروں نے تقلید کی۔

چاچی نے کھڑکی سے جھانکا ہی تھا کہ خون کی لمبی دھار ان کے دودھیا چہرے پر ہولی کھیل گئی۔ چاچی چیخیں اور لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگیں۔ ان کی گرفت مضبوط ہوئی۔

عجیب بات تھی کہ ان کا بے نام بیٹا اب نہیں رو رہا تھا، خاموشی سے اپنی ماں کی چیخیں سن رہا تھا۔

"آپا ...... یہاں سے ہٹیں۔" انہوں نے افشاں بی بی کا ہاتھ کھینچا۔ پیچھے ایک گولی کی آواز آئی اور افشاں بی بی کے سینے سے آر پار ہوگئی۔ اب کی بار چاچی کی چیخیں نہیں نکلیں، ان کی آنکھیں حیرت بھرے صدمے سے کھلیں اور بند ہونا بھول گئیں۔

"آپا ...... آپا! آنکھیں کھولیں۔ آپا خدارا ...... دیکھیں۔"

دھڑام سے افشاں بی بی کا سر چاچی کی گود میں گرا تھا۔ چاچی آس پاس کی چیخیں، گولیوں کی اور تلواروں کے ٹکرانے کی دہشت ناک آوازوں کو بھول کر مجنونیت سے آپا کے چہرے پر ایک ہاتھ رکھے ہوئے ان سے التجائیں کیے جارہی تھیں۔ "آپا۔ خدا کے لیے۔ دیکھیں نا آپا، آپ نے میرے بیٹے کا نام بھی سوچنا تھا۔ خدارا!"

آپا کا منہ خون سے بھرا ہوا تھا، آخری بار وہ مسکرائی تھیں۔ "علاؤالدین!"

بے نام خاموش بچہ ایک بار پھر سے ریں ریں کرنے لگا، یہ شاید اپنے نام کی وجہ سے یا ماں کے زار وقطار رونے کی وجہ سے...... جو بھی تھا، آپا کی آنکھیں اب زندگی کے نور سے بے نور ہو چکی تھیں۔

"آپا...... بیچ راستے میں کون چھوڑ کر جاتا ہے۔" چاچی ان کو گلے سے لگائے ہوئے روتی ہی جا رہی تھیں۔ "کتنی بے وفا ثابت ہوئیں آپ......"

ٹرین کی چھت پر سے لاشیں گر رہی تھیں۔ اندر ڈبوں سے لوگوں کو کھینچا جا رہا تھا۔ چاچی کے بغل میں دبکی بیٹھی ایک لڑکی کو کسی نے اس کے لمبے بالوں سے کھینچا اور اس کی چیخیں آسمان کے پردے پھاڑنے لگیں۔ کچھ سے بعد، وہی لمبے بالوں والی لڑکی بنا جوتوں کے کھیتوں کی اور بھاگی تھی۔

لاہور جاتی یہ ٹرین ...... آخری ٹرین نہیں تھی۔ لاشیں گریں، خون کی ندیاں بہیں۔ لاشوں کے ڈھیر کو پیچھے چھوڑتی ٹرین پاکستان کی سرزمین پر پہنچ ہی گئی تھی۔ چاچی اپنی جگہ بیٹھی رہیں۔ کسی نے آپا کو اٹھایا اور سفید کفن میں ان کے وجود کو لپٹایا۔ کسی نے چاچی کو سہارا دے کر اٹھایا اور مہاجرین کے کیمپ تک لے کر گیا۔

جب رات کی چادر کھینچتی صبح کی نیلگوں روشنی نے دھرتی کا ماتھا چوما تو نیلاہٹ میں سرخ رنگ غالب تھا۔ سکھوں کی ایک ٹولی گاؤں کی اور جارہی تھی۔ ایسے میں ایک نوجوان، جس کا ماتھا فراخ اور آنکھیں اداسی سے معمور تھیں۔ لاشوں کے اس ڈھیر کے سامنے پتا نہیں کیا سوچ کر رک گیا۔

اس نے دیکھا، لاشوں کے نیچے سے نکلنے کی سعی کرتا ایک ہاتھ، جس میں ایک خوب صورت لیکن پرانا کڑا تھا اور کڑے کے ذرا سا اوپر ایک زخم کی لکیر تھی ...... یہ ہاتھ وہ پہچانتا تھا ...... لاشوں کی جانب بڑھتے اس کے قدموں میں بے انتہا شتابی تھی۔

☆☆☆

اوپر بالائی منزل کے کمرے کے اندر جعفری کے پار سرور طاق میں رکھے دیئوں میں تیل ڈال رہی تھیں۔ تیل کی کڑوی کسیلی بساند کمرے میں پھیل رہی تھی۔ جعفری کے اس پار، کھلی کھڑکی کے ساتھ رکھی کرسی پر وہ بیٹھی تھی ...... ہمیشہ کی طرح چپ اور بلاوجہ کے اضطراب میں انگلیاں مروڑتے ہوئے......

کھڑکی کے نیچے جھانکو تو تخت پر بیٹھے بڑے ابا اور ان کے سامنے بیٹھی، ان کی چہیتی نجمہ انہیں اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی۔ بڑے ابا کے تاثرات لحظہ بہ لحظہ بدل رہے تھے۔

بڑی ماں نے دونوں کو دیکھا اور پہلے تو غصے سے پان بھری پچکاری پھینکی اور پھر "دنیا جہاں کے فارغ یہ دونوں" کہہ کر پھر سے اپنے لیے پان بنانے لگیں۔

سامنے بیٹھے ہوئے اماں زبردستی پکڑے چھوٹی کے سر میں تیل لگا رہی تھیں اور چھوٹی ہر دو منٹ بعد منہ بناتی اور بھاگ جانے کے پر تولتی۔ گھر کے باقی افراد، یعنی دونوں بڑے چاچا و چھوٹے چاچا، ابا گھر میں موجود نہیں تھے۔

"تمہیں پتا ہے لاہور سے فضیلت پھپھو کا خط آیا تھا پرسوں۔ اماں بتا رہی تھیں کہ زین العابدین چاچا کے لیے فضیلت پھپھو نے اپنی نند گوہر کا رشتہ مانگا ہے۔" سرور کے لہجے میں اتنا جوش تھا کہ ہر لفظ پر وہ بہت زور دیتی رہی......

"ہاں معلوم ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

سرور نے اس کو گھورا۔ وہ اتنے تحمل سے وہ بات بھی سن لیتی تھی، جس کا اس کو پتا بھی ہوتا تھا لیکن پھر بھی دوسروں کو ان کی بات مکمل ہونے دیتی تھی۔

"بڑے ابا، بڑی ماں اور اماں جائیں گے اگلے ہفتے لاہور...... اب بتاؤ، اس کا تو پتا نہیں تھا نا۔" سرور آگے ہوئی، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ہاں، یہ بھی معلوم تھا۔" اس کے لہجے میں قطعاً شرارت نہیں تھی۔

اب کی بار سرور نے صرف گھورا نہیں، بلکہ آ کر اس کو ایک چٹکی بھی بھری تھی۔

"یہ تم کو ہر ایک بات کیسے پتا چل جاتی ہے؟" اس بار وہ مسکرائی تھی۔ "نجمہ ہے نا۔"

سرور کے چہرے کے تاثرات تن گئے، اس کے لب "اچھا بچو!" کے انداز میں سکڑے اور کھڑکی سے جھانک کر اس نے نیچے بڑے ابا کو اخبار پڑھ کر سناتی نجمہ کو پکارا تھا۔

"نجمہ!" نجمہ نے سن کر نظر انداز کرنا ہی تھا، سو کیا۔

"نجمہ! دانین نے بانو کو تمہاری کتاب دی ہے اور بانو تو بمبئی جانے والی ہے۔"

نجمہ نے اوپر دیکھا، سرور کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ دانین ہنسنے لگی۔

سرور نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ "خبردار!" نجمہ نے اخبار رکھا اور کمرے میں گئی اور اگلے لمحے وہ برقع پہنے باہر نکل گئی۔

"ارے موئی نجمہ۔ ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے جو یوں ہرنی بنی بھاگی جارہی ہو۔ واپس پلٹو، کواڑ سے باہر قدم اٹھایا تو خیر نہیں تمہاری۔" اماں نجمہ کو پکارنے لگیں۔

چھوٹی نے جہاں ان کا ہاتھ ڈھیلا دیکھا اور وہاں وہ غائب۔ اب اماں چھوٹی کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔ بڑی ماں ہنوز بڑے ابا کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورے جارہی تھیں۔

☆☆☆

پھر بڑے ابا، ابا اور اماں لاہور چلے گئے۔ بڑی ماں نے جوڑوں کے درد کا بہانہ کیا۔ بڑے ابا نے ایسے نظر انداز کیا کہ ان کے جانے کے بعد بڑی ماں کا غصہ اور کھانسی دونوں تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"آپ بھی چلی جاتیں نا۔" ان کے لیے گڑ کی چائے بنا کر، پیالی رکھتی سرور نے کہا۔ "یا اپنی جگہ مجھے بھیج دیتیں۔"

کتاب پڑھتی نجمہ کھی کھی کرنے لگی اور دانین کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"تجھے میرے نہ جانے کا زیادہ غم ہے یا اپنے نہ جانے کا؟" پیالی لبوں سے لگا کر، بڑی ماں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھا۔

"دیکھیں بڑی، اماں! آپ تو میری پیاری سی دادی ہیں نا، تو ایمانداری سے کہے دیتی ہوں......" لمحے بھر کے لئے توقف کیا۔ "کہ اپنے نہ جانے کا غم ہے صرف۔"

بڑی ماں نے گھورنے پر محض اکتفا نہیں کیا بلکہ کہنے لگیں۔ "خیر ہے، آنے دو فضیلت کو۔ کہے دی

ہوں کہ اس موئی کو فوراً بیاہ کر لے جائیو۔ اس کو بڑی محبت ہے لاہور سے۔"

خاموش بیٹھی دانین اور کتاب پڑھتی نجمہ کے قہقہے بلند ہوئے اور سرور کا چہرہ یک دم گلال ہوا۔ اس سے پہلے کہ نجمہ اس کو دیکھ لیتی، وہ فوراً باہر کی اور بھاگی۔ بڑی ماں کے لبوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"مجھے خوب معلوم ہے، اس گھر کے ہر فرد کے دل کے حال۔" چائے پیتی بڑی ماں، اپنا غصہ بھول چکی تھیں۔

"دانین بٹیا! تم نے آج مجھے سورہ یٰسین پڑھ کر نہیں سنائی۔" دانین کے چہرے کو پیار سے تکتیں بڑی ماں کو فوراً یاد آیا۔

"مجھے یاد تھا بڑی ماں...... لیکن آپ کافی غصے میں تھیں۔ اس لیے میں نے آنا مناسب نہیں سمجھا۔" ہمیشہ سے دھیمے لہجے میں کہتی دانین کی آواز اتنی نرم تھی کہ جی چاہتا اسی کو سنا جائے۔

"اچھا! ادھر آؤ اور میری گود میں سر رکھ کر سناؤ۔" بڑی ماں نے کہا۔

دانین آہستگی سے اٹھی اور ان کے پاس چارپائی پر بیٹھی، پھر ان کی گود میں سر رکھ کر سورہ یٰسین سنانے لگی۔ بڑی ماں پیار سے دانین کا صبیح چہرہ دیکھنے لگیں۔

وہ بہت حسین تھی...... گھنے سیاہ بال، سپید چہرہ اور گلابی گال اور گہری سیاہ آنکھیں...... اور...... یہ سیاہ آنکھیں بینائی سے محروم تھیں......

دانین خاموش طبیعت کی مالک لڑکی، جو اس گھر میں سب کو پیاری تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ بینائی سے محروم تھی۔ کوئی ہمدردی میں اس سے پیار نہیں کرتا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ اس سے پیار کیا جاتا۔ خوب صورت، نرم خو...... اس نے کبھی کسی سے تیز آواز میں بات کی نہ ہی اس نے کبھی بلاوجہ کسی چیز کی فرمائش کی تھی...... وہ ہر حال میں خوش رہنے والی لڑکی تھی۔

دانین نجمہ اور سرور کی طرح اسکول اور کالج نہیں گئی لیکن اس نے قرآن حفظ کیا تھا۔ اس کو قرآن پڑھایا بھی ایک نابینا قاری صاحب نے تھا۔

☆☆☆

چندن پورہ پر آج کی صبح ایسی عجلت میں آئی تھی کہ ابھی تک کھڑکیوں کے پار سوئے دھرتی واسیوں کی خوابیدہ آنکھوں میں نیند ٹھہری ہوئی تھی۔

محلہ فرحانی کے اس دو منزلہ گھر میں البتہ لوگ کافی دیر سے جاگے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور اس بات کا سہرا بڑی ماں کے سر جاتا تھا۔ جو موذن سعید ربانی کے خوش الحان آواز میں اذان سنتے ہی بیدار ہو جاتی تھیں۔ وضو کر کے وہ سب سے پہلے بڑے ابا کو جگاتیں اور پھر ہر ایک کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر باہر لٹکتی کنڈی زور سے کھٹکھٹاتیں اور ایک ایک کر کے سب نماز پڑھنے اٹھتے۔

باورچی خانے میں چائے کی پتیلے کے سامنے آج اماں نہیں بیٹھی تھیں۔ حنائی ہاتھوں سے کیتلی میں چائے انڈیلتی، یہ گوہر چاچی تھیں، جن کی آنکھیں چمکیلی اور ہونٹ گہری لالی سے اٹے تھے۔

"بڑی ماں کے لیے میں بنا دیتی ہوں چاچی۔" پھر سے پتیلا رکھتیں چاچی سے سرور نے کہا۔

وہ مسکرائیں۔ "نہیں سرور۔ کھیتوں میں ہل تھوڑی چلانا ہے، ایک پیالی گڑ کی چائے ہی تو بنانی ہے۔"

"گوری! ایک ہفتے بعد ہل چلانے سے بھی مشکل کام لگے گا تجھے۔" پراٹھے بناتیں اماں کا لہجہ شرارتی تھا۔

برا مانے بغیر چاچی بھی ہنسنے لگیں۔

"اری سرور، اب لا بھی چکو۔" اندر سے دادی کی چنگھاڑتی آواز سنائی دی۔

ایسے میں دروازے کے سامنے تانگا رکا اور سوٹ کیس رکھنے کی آواز سنائی دی۔ دانین برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھے گملوں میں پھولوں کو پانی دے رہی تھی، لوٹا وہیں رکھ کر نیچے اترنے لگی۔ سرور بھی باورچی خانے سے نکلی اور اگلے ہی پل وہ اندر واپس بھاگی۔

"اماں پھپھو آئی ہیں اور ہاشم بھی۔"

چاچی نے دیکھا کہ ہاشم کے نام پر اس کی آنکھیں چمکیں اور گال لال ہو گئے۔

دانین پھپھو کو سلام کرنے لگی، پھپھو نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"کتنی پیاری ہو گئی ہو دانین ماشاء اللہ۔ اللہ نظر بد سے بچائے تجھے۔"

"السلام علیکم ہاشم بھائی!"

وہ ہاشم کو سلام کر کے پھپھو کے ساتھ دادی کے کمرے میں چلی گئی جبکہ ہاشم کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں اور جس کو ہاشم کی نظریں ڈھونڈ رہی تھیں وہ باورچی خانے کے دروازے کے اوٹ سے اس کو نہارے جا رہی تھی۔

وہ سفید کاٹن اور اس پر کالے واسکٹ میں انتہائی جاذب دکھ رہا تھا۔ پیچھے کی طرف بنائے گئے بال اور ہلکی سی بڑھی داڑھی...... معلوم ہوتا تھا کہ حجامت کیے کچھ عرصہ ہوا ہے۔

"بس کبھی حجامت مت کرنا تم۔" سرور نے سوچا۔

پھپھو دونوں کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر وقت ان کا بڑی ماں کے ساتھ باتیں کرنے میں گزرتا۔ نیچے صحن میں بڑے ابا حقہ کی نے منہ سے لگائے کش لگاتے جاتے اور انگریزوں کو خوب سناتے۔ انگریزوں کے معاملے میں سب ان سے متفق تھے لیکن جیسے ہی ہاشم نے مسلم لیگ کی حمایت میں بات کرنا شروع کی...... بڑے ابا نے اس کو گھورا لیکن کہا کچھ نہیں بعد میں عظیم ماموں نے بتایا کہ بڑے ابا کو مسلم لیگ سے سخت خار ہے۔

ہاشم بعد میں بڑے ابا کو کانگریس کی سفاکی اور چالاکی کی داستانیں سناتا رہا، بڑے ابا کا شمار ان انسانوں میں ہوتا تھا جو کسی کی دلائل سے بھری باتوں میں آکر اپنی رائے قائم کر لیتے تھے۔ بڑے ابا کا دل کانگریس سے اچاٹ ہوا اور اب انگریزوں کے ساتھ وہ کانگریس کی بھی خوب برائیاں کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

بالائی منزل کے اس کمرے میں دیے کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا سا کمرا جس کے بیچ ایک خوبصورت جعفری تھی۔ جعفری کے اس پار دانین لیٹی ہوئی تھی اور سرور بے چینی سے چہل قدمی کر رہی تھی۔

"تم ذرا آرام سے بیٹھ جاؤ، مجھے بھی بے چینی ہو رہی ہے۔" دانین نے اس کی بے چینی کو محسوس کیا تھا۔ سرور گھومی۔

"وہ لوگ کل جا رہے ہیں دانین! مجھے کتنی امید تھی لیکن اب میری امید اسی دیے کی طرح بجھتی جا رہی ہے۔" سرور نے دیے کو دیکھا جو بجھتا جا رہا تھا۔

"تمہیں کس بات کی امید تھی؟" دانین نے استفسار کیا۔

اس بار سرور اس کی طرف گھومی۔ "تم کتنی بدھو ہو دانین! مجھے کس بات کی امید ہو سکتی ہے؟"

"کہ پھپھو تمہارا رشتہ مانگیں ہاشم بھائی کے لیے...... اس بات کی امید ہو سکتی ہے۔" دانین کا لہجہ شرارتی تھا۔

سرور نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا، پھر مسکرائی لیکن اگلے ہی پل اس کی مسکراہٹ کسی کے کھنکارنے سے غائب ہو گئی۔ سرور پیچھے مڑی۔ چوکھٹ میں وہ کھڑا تھا۔

سرور نے جلدی سے دوپٹا درست کیا۔

"آپ...... خیریت؟" اپنے سوال پر سرور نے دل ہی دل میں خود کو خوب کوسا۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔" ہاشم مسکرایا۔

سرور کی دھڑکنیں بے ربط تھیں اور جعفری کے اس پار، دانین کے گال سرخ ہوئے جا رہے تھے اور اپنی ازلی اضطراب سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

کچھ دیر کے لیے ان کے بیچ خاموشی ٹھہری۔ یہ خاموشی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ دانین نے سوچا۔

اس مقدس خاموشی کو ہاشم کی گمبھیر آواز نے توڑا تھا۔ "ہم کل جا رہے ہیں واپس۔"

"معلوم ہے مجھے۔" سرور نے فوراً کہا اور پھر پچھتائی بھی۔

اب کی بار ہاشم سر جھکا کر ہنس پڑا اور جعفری کے پار دانین نے بھی منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔

"امی نے ممانی سے بات کی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ہاشم کا لہجہ تھوڑا سا گمبھیر ہوا تھا۔

سر جھکائے، لال لال ہوتی سرور نے سر اٹھایا دانین کی اضطراب سے مروڑتی انگلیاں تھمیں۔

"کس لیے؟" سرور نے استفسار کیا۔

دانین نے سرور کو خوب کوسا، کتنے بے تکے سوال پوچھتی ہے یہ لڑکی اللہ!

"آپ کا رشتہ مانگا ہے امی نے۔ ویسے یہ سوال تو آپ سے آپ کے والدین پوچھیں گے۔ لیکن میں نے سوچا کہ میں بھی آپ کا جواب جان سکوں۔" ہاشم نے اپنے سوال کی توجیہہ پیش کی۔

"سوچ کر جواب دوں گی۔" سرور اب سنبھل چکی تھی، اس لیے اس نے سوچ کر جواب دیا کہ لڑکیاں جلدی 'ہاں' کرتے اچھی تھوڑی لگتی ہیں۔

"امید ہے یہ جواب مثبت ہو۔" وہ مسکرایا اور جانے لگا۔

جواب مثبت ہی ہے۔ وہ دانین کی اور بھاگی۔ ہاشم رکا، پلٹا اور جعفری ہٹاتی سرور کو دیکھا لیکن اس کے ساتھ اس نے دانین کو بھی دیکھا جو کب سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اوہ خدایا!" اس کے کان سرخ ہوئے۔

☆☆☆

ملک کے حالات بد سے بدترین ہوتے جا رہے تھے۔ صحن میں وہی معمول کا منظر تھا۔ تخت پر بیٹھی پان بناتیں بڑی ماں، حقہ پیتے بڑے ابا اور ان کے ساتھ بیٹھی اخبار پڑھ کر سناتی نجمہ، کدو کاٹتی اماں اور نیچے کھیلتی چھوٹی، اوپر کھڑکی کے ساتھ بیٹھی قرآن مجید پڑھتی دانین، اور باورچی خانے میں گھسر پھسر کرتی چاچی اور سرور... گھر کے باقی مرد حسب معمول باہر تھے۔

"صوبائی اسمبلیوں کے لیے ۴۹۵ نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص تھیں جس میں مسلم لیگ ۴۳۴ نشستیں جیت پانے میں کامیاب ہوئی ہے۔" نجمہ کا سر تفخر سے بلند ہونے لگا۔

انتخابات کی پوری تفصیل سناتی نجمہ اور غور سے سنتے بڑے ابا کو حسب معمول بڑی ماں چبا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

پہلے تو بڑی ماں کو بڑے ابا سے اس لیے بیر تھا کہ انہوں نے بیٹی کا رشتہ لاہور میں اپنے بھانجے سے کر دیا تھا پھر اپنی بھانجی بیاہ لائے۔ (بعد میں چاچی نے اپنی خوب صورت سیرت سے ان کا دل جیت لیا تھا۔) اب بلاوجہ ان کو دیکھتے ان کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔

"نجمہ! یہ فضولیات چھوڑ کر اپنی بے چاری ماں کی تھوڑی سی مدد ہی کر لو۔" بڑی ماں نے اس کو اٹھانا چاہا لیکن بڑے ابا کے اشارے پر وہ بیٹھی ہی رہی۔

"منحوس ماری! دادا پر گئی ہے۔" بڑی ماں بڑبڑائیں اور اگلے ہی پل ان کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے ان کا چہرہ بینگن ہو گیا۔ نجمہ اٹھی اور ان کے لیے پانی لے کر آ گئی۔

"اب خیال آیا بوڑھی دادی کا۔" پانی کا گلاس لے کر بڑی ماں نے اس کو سنانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

نجمہ نے "میں نے کیا کیا؟" والے تاثرات چہرے پر سجائے۔

رات کو دادی کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ بڑے ابا بے چینی سے ابا اور زین چاچا کو جگا کر دادی کے پاس بیٹھے تھے۔ زین چاچا باہر کریم کے تانگے میں ڈاکٹر کو لانے کے لیے گئے تھے۔ گھر کے سب فرد ان کے پاس کھڑے تھے۔ دانین کی آنکھیں برس رہی تھیں۔

"دانین بیٹا۔ ادھر آؤ! میری گود میں سر رکھ کر یٰسین سناؤ۔" دانین دبی دبی سسکیاں بھرتی، ان کی گود میں سر رکھ کر سورۃ یٰسین سنانے لگی۔ اس کی نرم اور فرشتوں جیسی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

وہ اپنی خوب صورت آواز میں تلاوت کر رہی تھی، اور سب آس پاس کھڑے دھڑکتے دل کے ساتھ بڑی ماں کو دیکھ رہے تھے۔

اسی دوران ہی بڑی ماں کے ہاتھ میں گرمائش نہیں رہی...... چچا نے پردہ کرنے کا کہا، ڈاکٹر آ چکے تھے لیکن بڑے ابا ڈاکٹر کو واپس بھیجنے کا کہہ رہے تھے۔

"تمہاری ماں ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔" بڑے ابا کا لہجہ بہت زخمی تھا۔

☆☆☆

دادی کو فوت ہوئے چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔ ملک کے حالات بدل گئے تھے۔ وہ بھائی چارہ اب نہیں رہا تھا۔ ہندو مسلم فسادات بڑھتے جا رہے تھے۔ ہندو اور سکھوں کی اکثریت جس علاقے میں ہوتی تھی مسلمان وہاں محفوظ نہیں تھے۔ مسلمانوں کے پر اسرار قتل، ان کے گھروں پر چھاپے...... روز کا معمول بن چکا تھا۔

کابینہ مشن کی ناکامی نے اچھا خاصا اثر چھوڑ دیا تھا۔ یہاں چندن پورہ کے اس فرحانی محلے کے اس دو منزلہ گھر میں وہی منظر تھا۔

صحن میں دھوپ سینکتیں اماں اور نیچے کھیلتی چھوٹی، بڑے ابا کا اخبار پڑھتی نجمہ کو بغور سننا، باورچی خانے میں بیٹھے گھسر پھسر کرتیں چاچی اور سرور اور اندر بڑی ماں کی چارپائی پر خاموش لیٹی دانین...... سب کچھ ویسا ہی تھا، بس بڑی ماں کا تخت خالی تھا اور ان کا پاندان......

بڑے ابا نجمہ کو سنتے سنتے بے خیالی میں پیچھے مڑ کر دیکھتے اور ان کی آنکھیں ناامید ہو جاتیں۔ پھر واپس نجمہ کو سننے لگتے...... ہر دفعہ یہ منظر نجمہ دیکھتی

دانین آج بھی اسی وقت، جس وقت وہ بڑی اماں کی گود میں سر رکھ کر انہیں قرآن پڑھ کر سناتی تھی، ان کی چارپائی پر بیٹھ کر تلاوت شروع کرتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تلاوت کرتے اس کی نرم اور فرشتوں جیسی آواز میں آنسو کی شراکت کم ہونے لگی تھی۔ صبر آخر کار آ ہی جاتا ہے، اس نے سوچا۔

سرور کی شادی اگلے سال کے پہلے مہینے میں طے تھی، اب اکثر دانین اس کے دوپٹے پر گوٹا کناری کرتے پائی جاتی تھی، اس کو بھی خود کو مصروف کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

☆☆☆

ماگھ (نومبر) کی ٹھٹھرتی یخ بستہ راتیں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ جریب ٹکاتی کوئی برزن بھی حیات کو دو کلو میٹر کا راستہ طے کر لیتی تھی۔ رات کو انگیٹھی کے سامنے بیٹھی نجمہ اس کو بانگ درا سناتی اور وہ چپ چاپ اقبال کی گہری شاعری میں مستغرق ہو جاتی تھی۔

اسی مہینے، چندن پورہ میں ایک بڑا سا میلہ لگتا تھا۔ میلہ اتنا مشہور نہیں تھا بس اتنا مشہور ضرور تھا کہ ہر سال چندن پورہ کے آس پاس گاؤں سے بہت سے لوگ آتے تھے۔

یہ میلہ، چندن پورہ کے اس لمبے میدان میں سجتا تھا۔ جس کے پوربی سمت لاہور جاتی ٹرین تھی اور پچھمی جانب ایک بڑی سی نہر...... نہر کے اس پار دوسرا گاؤں، چھپانیر تھا۔ جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

دانین حسب معمول، اوپر کھڑکی کی سامنے بیٹھی، سرور کے توتی رنگ کے دوپٹے پر جھکی تھی۔ نیچے سرور تیار کھڑی نجمہ کو پکار رہی تھی اور نجمہ چھوٹے چچا کے کمرے میں ان کو خط لکھ رہی تھی۔

"ابا نے خاص تاکید کی ہے کہ سرور کی شادی میں ضرور آئیے گا، کسی بھی حال میں......"

"آپ کی پیاری۔"

نجمہ۔

اس نے خط لکھ کر لفافے میں بند کیا وہیں میز پر کتابوں کے نیچے رکھ دیا۔
"آئی...... ایک منٹ سانس لینے دو۔" وہ برقع پہننے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔
"جلدی آؤ، ورنہ تمہاری سانس بند کر دوں گی۔" سرور کی بے صبری سے سب ہی باخبر تھے۔ اوپر مسکرا کر ان کی نوک جھوک سنتی دانین یک دم بڑبڑا گئی کہ نجمہ نے اس کے ہاتھوں سے دوپٹا لیا اور اس کو برقع پکڑایا۔
"لڑکی انسان ہو کہ کوئی جن۔ ابھی تو تم نیچے تھیں، یہ آن کی آن میں کیسے یہاں آوارد ہوئیں؟"
"بس...... یہ لو برقع، اور جلدی سے پہنو۔ تم بھی جا رہی ہو ہمارے ساتھ۔" نجمہ نے اس کو برقع پکڑایا۔ دانین نے اس کو برقع واپس کرنا چاہا۔
"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے نجمہ، تم لوگ چلے جاؤ"
"افوہ! پہنو جلدی سے...... ابھی شرافت سے کہہ رہی ہوں، اس کے بعد دادا گیری سے کہوں گی۔" نجمہ نے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔
نیچے سے سرور ہنوز اس کو پکارے جا رہی تھی۔
امی باورچی خانے میں چاچی کے لیے قہوہ بنا رہی تھیں۔ چاچی کی طبیعت آج بہت خراب تھی۔ صبح سے وہ الٹیاں ہی کیے جا رہی تھیں۔ اماں کا آج کل زیادہ تر وقت ان کے کمرے میں گزرتا تھا۔
"ابھی سے بتائے دے رہی ہوں، سہ پہر کی اذان سے پہلے پہلے آئیں گے۔" دانین نجمہ کو خبردار کر رہی تھی۔
"ہاں ہاں، بالکل...... سہ پہر کی اذان سے پہلے پہلے آ جائیں گے۔" نجمہ نے جھوٹی تائید کی۔
سرور نے اس بات پر نجمہ کو گھورا اور نجمہ نے "شام کو...... شام کو......" بنا آواز نکالے ہونٹوں سے کہا۔
"میرے لیے دنداسہ لیتی آئیو۔ اور دوپہر کی اذان ہونے سے پہلے پہلے تینوں گھر آ جانا۔ دیر کی تو تم لوگوں کے پیچھے میلے آ جاؤں گی اور ایسی خبر لوں گی کہ تم لوگوں کا میلہ پورا چندن پورہ دیکھے گا۔" چاچی کے کمرے کی چوکھٹ میں کھڑی اماں نے خبردار کیا۔
تینوں نے سر اثبات میں ہلایا۔
جب تانگا میلے کے سامنے رکا، تو میلے کی رونق عروج پر تھی۔ اگرچہ پچھلے سالوں کی طرح اس بار میلے میں زیادہ لوگ نہیں تھے اس کی بڑی وجہ آس پاس کے علاقوں میں ہونے والے فسادات تھے۔ چونکہ چندن پورہ میں مسلمانوں کی آبادی، ہندوؤں سے زیادہ تھی اس لیے یہاں کا بھائی چارہ تاحال قائم تھا۔
میلے میں جاتے ہی سرور ان اسٹالوں پر گئی جہاں دوشیزاؤں کی بھیڑ تھی۔ نجمہ اس کا ہاتھ پکڑے لوگوں کے اس دائرے کی جانب بڑھ رہی تھی جس کے بیچ چبوترے پر ایک نوجوان تقریر کر رہا تھا۔ اس کی آواز پرجوش اور بھاری تھی۔ اس نے مسکرا نوجوان کو دیکھا، وہ اس کو پہچانتی تھی۔ وہ مستجاب تھا، بانو کا اکلوتا بھائی...... وہ دونوں وہیں رک کر اس کی تقریر سننے لگی تھیں۔
"آزادی اب ہماری آخری مانگ ہے۔ ہمیں ایسا ملک چاہیے، جہاں ہمیں اعلا عہدوں کی سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کے لیے فرنگیوں کے تلوے نہیں چاٹنا پڑیں۔" سامنے دیکھتے ہوئے وہ صاف کسی سرکاری ہندو ملازم پر طنز کر رہا تھا۔
دفعتاً اس کو کسی ہندو نے پکارا اور اس سے بحث کرنے لگا۔ یہ بحث ان دونوں سے ہوتے ہوئے دائرے کے باقی لوگوں میں بھی گھومنے لگی۔ بحث گرم ہونے لگی تھی۔
"نجمہ! ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔" دانین نے اس کو کھینچا۔
"کچھ دیر ٹھہرو دانین!"
وہ دلچسپی سے بحث کو سن رہی تھی۔ ایک بچہ اس کے سامنے کھڑا ہوا اور اس کو پمفلٹ دیا۔ جس پر لکھا تھا "کانگریس اور اس کے گھناؤنے ہتھکنڈے" اس کے نیچے لکھا تھا۔ ...ان۔ کر خان۔
نجمہ مسکرائی، یہ پمفلٹ اسی نے لکھا تھا۔
"نجمہ! دیکھو، اب دھینگا مشتی شروع ہو جائے گی۔" دانین اضطراب سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔
"ایسا کچھ نہیں ہونے والا...... دانین! وہ بس بحث کر رہے ہیں۔" نجمہ اپنی شائع شدہ تحریر کو دلچسپی سے پڑھ رہی تھی۔
"بحث کی پہلی لہر لڑائی اور آخری لہر قتل و غارت پر ختم ہوتی ہے۔ دیکھو میری سانسیں پھول رہی ہیں۔ خدارا چلو یہاں سے۔" دانین بے چینی سے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھیں۔ وہ بچپن میں دو تین بار میلے میں آئی تھی، اس کو لوگوں کے ہجوم میں بے چینی ہوتی تھی۔
نجمہ نے اس کو دیکھا، وہ واقعی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھیں۔ وہ دونوں جانے ہی لگی تھیں کہ دائرے میں دھینگا مشتی شروع ہوئی۔ لوگ ایک دوسرے کو پیٹنے لگے تھے۔ کسی نے چبوترے سے مستجاب کو نیچے گرایا اور باقی لوگ اس کو پیٹنے لگے۔
وہ تیز تیز چلنے لگی تھیں، لیکن سامنے سے لوگ بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ نجمہ نے کس کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا، لوگ اس سے ٹکرائے جا رہے تھے۔ آخر کار اس کا ہاتھ ڈھیلا ہوا اور لوگوں کے ہجوم میں دانین کا ہاتھ اس سے چھوٹ گیا۔
"دانین...... دانین......" وہ چیختی اس کو پکار رہی تھی۔ دھول اڑنے لگی تھی اور اس کو لوگوں کی بھیڑ میں اپنی بہن دکھائی نہیں دے رہی تھی...... وہ بہن، جو کہ بینائی سے محروم تھی۔
دانین اپنی جگہ کھڑی تھی، بالکل شل و جامد...... وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں میچی ہوئی تھیں۔ دفعتاً اس کو تلواروں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کی تقلید کرتی گولیوں کی...... کوئی بھاگتا ہوا اس سے ٹکرایا اور وہ زمین بوس ہوئی۔ نیچے زمین پر بیٹھی وہ ہنوز لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہی تھی۔ پیچھے سے کسی نے اس کو ایک بڑا سا پتھر کھینچ کر دے مارا۔ اس سے پہلے کہ وہ پتھر اس سے لگتا، کوئی اس پر جھکا تھا اور جھکنے والے کی کمر پر وہ پتھر لگا تھا۔ ناچاہتے ہوئے بھی اس جھکنے والے نوجوان کے منہ سے ایک دردناک کراہ نکلی تھی۔
دانین نے اپنی بڑی بڑی گہری آنکھیں اٹھائیں، اس بات سے باخبر ہو کر بھی کہ وہ اپنے محسن کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کا محسن اس بات سے بے خبر کہ یہ ان بڑی، روتی آنکھوں میں جو اس نے اپنا دل ڈوب جانے دیا...... وہ بینائی سے محروم ہیں......
"آپ ٹھیک ہیں؟" اس کی گمبھیر آواز دانین نے سنی اور اس نے واپس سر جھکایا۔
"جی، جی...... نہیں...... میرا مطلب نہیں۔" دانین کی آواز کانپ رہی تھی۔
اجنبی نے اس کو ہاتھ دینا چاہا، لیکن دانین اب سنبھل کر اٹھی۔ اٹھتے وقت اس کا کڑا اس کی آستین سے سرکا اور اس نے وہ کڑا دیکھا۔ خوب صورت اور پرانا کڑا، جس پر نقش و نگاری کے ساتھ عربی میں کچھ لکھا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اسے عربی نہیں آتی تھی۔
دانین جیسے ہی اٹھی، سامنے نجمہ اور سرور اس کو پکارتی ہوئی آ رہی تھیں۔
"دانین...... تم ٹھیک ہو؟" اس کو گلے لگاتے ہوئے نجمہ کی آواز بھیگ گئی تھی۔ "آپ کا بہت شکریہ بھائی صاحب۔" نجمہ نے اجنبی کا شکریہ ادا کیا۔ "چلو...... گھر چلتے ہیں۔"
پولیس اور کمپنی بہادر کے سپاہی آ چکے تھے اس لیے ہنگامہ ہنوز تھم گیا تھا۔
دانین اب نجمہ کا ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ جانے لگی تھی۔ اجنبی نے دیکھا کہ جن کی آنکھوں میں اس کا دل ڈوب چکا تھا، وہ بینائی سے محروم تھیں۔ جاتے ہوئے اس کو یاد رہا تو بس اس کی روتی ہوئی گہری سیاہ آنکھیں اور وہ کڑا......
کسی نے اس کو پکارا، وہ پلٹا تھا۔

☆☆☆

سرور بیاہ کر لاہور سدھار گئی تھی، گھر میں خاموشی اور بڑھ گئی تھی۔ لوگ چلے تو جاتے ہیں، لیکن اپنی جگہ خالی چھوڑ جاتے ہیں......

انگیٹھی کے سامنے بیٹھی دانین، اس اجنبی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نجمہ اس کو بانگ درا سنا رہی تھی۔ اس واقعے کو دو مہینے گزر چکے تھے لیکن ابھی تک وہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ یہ کافی عجیب لگتا تھا اس کو، وہ اس کو بھول بھی چکا ہوگا یا شاید...... شاید...... اس کے خیالات کی رو کو نجمہ کی استفہامیہ آواز نے روکا تھا۔

"تم مجھے سن رہی ہو دانین؟"

"ہاں...... ہاں سن رہی ہوں۔" وہ پوری ایمان داری کے ساتھ اس کو سننے لگی۔

چاچی حمل سے تھیں، اب نجمہ ان کے حصے کی کام کرتی تھی۔ اماں ان کا بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ ان کی اتنی محبت پر چاچی کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہ اماں سے کہتی تھیں کہ ان کے بچے کا نام وہ رکھیں گی۔ چاچا بمبئی سے تا حال نہیں آئے تھے۔ ابا اپنے لاہور کے رشتے داروں کو خط لکھتے تھے کہ وہ یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ یہاں کے حالات ساز گار نہیں ہیں۔

تین جون کا منصوبہ کامیاب ہوا تو حالات اور ناساز ہونا شروع ہوئے، گاؤں میں ہندوؤں کے رویے گرگٹ کی طرح بدلے۔ انسان اور وقت...... کب بدل لے، پتا نہیں چلتا۔

صبح کاذب کا وقت تھا، نماز پڑھ کر اماں دودھ والے کا انتظار کر رہی تھیں۔ دفعتاً دروازہ کھڑکا۔ ابا کھانستے ہوئے دروازہ کھولنے کے لیے بڑھے۔ سامنے کرشن کھڑا تھا۔ اس سے دودھ لے کر ابا پلٹنے ہی والے تھے کہ ادھر ادھر دیکھتا کرشن بولا۔

"باؤ! بات سنیے گا۔"

ابا رکے۔

"جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل لیں۔ چمپانیر میں سکھوں نے تباہی مچائی ہوئی ہے۔ کل انہوں نے ایک مسلمان خاندان کو قتل کر دیا...... وہ گٹھ جوڑ بنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ اپنے گاؤں میں سب کو مار کر وہ اس گاؤں میں آ جائیں، آپ یہاں سے نکل لیں۔"

کرشن نے محلے کے نکڑ میں خود کو گھورتے نارنجی پگڑی باندھے سکھ کو دیکھا اور سائیکل بھگا کر چلا گیا۔

ابا کچھ دیر کھڑے رہے، پھر کچھ سوچ کر انہوں نے دروازہ بند کیا۔ جب وہ سب ناشتے کے دستر خوان پر بیٹھے تھے تو ابا کھنکارے۔

"ابا! یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں لاہور چلے جانا چاہیے۔" ابا نے بڑے ابا سے کہا......

"یہاں کے حالات ٹھیک ٹھاک ہیں...... ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔" بڑے ابا کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"ابا...... آپ کو نہیں معلوم...... سکھوں اور ہندوؤں کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ انہوں نے ہر مسلمان کو قتل کرنے کی قسم کھائی ہے۔ یہاں ہم نہیں ٹھہر سکتے، مسلمانوں کی آبادی ان کی نسبت کم ہے۔ ہم کب تک لڑ سکیں گے۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔" ابا بڑے ابا کو دلیل دے رہے تھے۔ بڑے ابا نے ہاتھ روک لیے۔

"میاں! تمہیں جانا ہے تو چلے جاؤ۔ میں کہیں نہیں جانے والا...... اس زمین پر جنم لیا ہے اور اسی زمین میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔" بڑے ابا اٹھ کھڑے ہوئے، ابا تاسف بھری نگاہوں سے ان کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

آخری ٹرین

پھر وہی ہوا، جس سے ابا ڈرتے تھے۔ ریڈ کلف کی تقسیم کے بعد، برصغیر دو ملکوں میں بٹ گیا تھا۔ ابا نے بڑے ابا کو خوب سمجھایا، لیکن بڑے ابا اپنی بات پر اڑے رہے۔ اماں نے ابا کو اس لیے روکے رکھا کہ چاچی کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے ابا نے چاچی کی زچگی کے فوراً بعد وہ ...... رک جانا مناسب سمجھا۔ پھر چاچی کا بیٹا پیدا ہوا، اسی رات کرشن نے ابا کو خبردار کیا تھا کہ آج یہاں فرحانی محلے اور چندن پورہ پر حملہ ہونے والا تھا۔

پھر وہ سمے آن پہنچا...... ہجرت کا سمے......

ہجرت...... جو ایسے زخم چھوڑ جاتا ہے جو کئی نسلوں تک مندمل نہیں ہوتے......

ہجرت کا زخمی پنچھی بس اڑان بھرنے کو تھا......!!

رات کا وقت ہے، اندھیارا اوڑھے آسمان کے بیچ مغموم چاند آج جاگ رہا ہے۔ ہلکی ہلکی سی ہوائیں چل رہی ہیں اور کبھی کبھی رک جاتیں تو حبس بڑھنے لگتا تھا......

اماں ضروری سامان باندھ رہی تھیں۔ سونا، دادی کا پاندان، کپڑے، تصویروں کا البم اور خطوط...... بڑے ابا جانے کے لیے کسی حال میں تیار نہیں ہو رہے تھے۔ اماں رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ بڑے ابا پھر بھی نہیں مانے۔ نجمہ کو گلے لگائے رکھا اور اس کا ماتھا چوما۔

"میں تمہاری دادی سے بے وفائی نہیں کر سکتا، ان کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم چلی جاؤ اور مجھے خط لکھتی رہنا...... مجھے پاکستان کے بارے میں بتاتی رہنا کہ میں بھی جان سکوں جس ملک کی خاطر کئی لوگوں نے جان کی قربانی دی، وہ کیسا ملک ہے۔" بڑے ابا کی باتوں پر نجمہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

شام کو چیخیں بلند ہوئیں اور نظامی صاحب کے گھر میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ وہ لوگ پیچھے کے گیٹ سے باہر نکلے تو دور کھیتوں کے بیچ لوگ لپک کر اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

کماد کے کھیتوں میں دفعتاً آگ لگ گئی، لوگوں کے قدم تیز ہونے لگے۔ اماں دانین کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھیں۔ اس کی سانسیں بے ربط تھیں اور اضطر...... اپنے ہونٹ کو اوپر کے دانتوں سے کتر رہی تھی۔

"مجھے چھوڑنا مت دانین...... پکڑے رکھنا۔" اماں پیچھے مڑیں اور اس کی ہمت بندھائی۔

دانین نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ لوگ اب اسٹیشن کے قریب پہنچ چکے تھے۔ دانین کے منہ سے کراہ نکلی، اس نے دائیں پیر میں کچھ گھستا محسوس کیا...... شاید کوئی کانچ...... ہاں! وہ کانچ ہی تھا۔ درد کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑی اس کی رفتار دھیمی ہوئی۔

"اماں...... اماں...... میرے پیر میں کانچ لگ گیا ہے...... اماں رکو۔" وہ اماں کو پکار رہی تھی، لیکن اماں سن نہیں رہی تھیں۔

"اماں...... اماں......!!"

کماد کے کھیتوں میں شعلے بھڑکے اور شیطانیت بھری چیخیں بلند ہوئیں۔ دانین نے پہلی بار ایسی چنگھاڑتی، نحوست سے بھری چیخیں سنی تھیں۔ کماد کے کھیتوں میں چھپے سکھ اور ہندوؤں نے اس چھوٹے سے قافلے پر حملہ کر دیا تھا۔

لوگوں میں ہلچل مچی...... لوگ جان بچانے واسطے، ایک دوسرے کو دھکیلتے بھاگنے لگے۔ اماں پیچھے مڑیں اور انہوں نے دیکھا کہ دانین درد کی وجہ سے آنکھیں میچے ہوئی تھی اور اس کے کھسے خون سے بھرے ہوئے تھے۔

"دانین! بیٹا، جلدی تیز تیز بھاگو۔ بس ہم ٹرین کے قریب ہی پہنچ گئے ہیں۔" اماں نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

لوگ بھاگ رہے تھے...... تلواریں اور گولیاں چل رہی تھیں...... لاشیں گر رہی تھیں۔ ایسے میں پیچھے سے تلوار چلانے کی آواز آئی اور اسی سمے سامنے گولی چلانے کی...... دانین کے سامنے چلتے آدمی کے سر سے آر پار ہو گئی تھی گولی اور خون کے دھاریں دانین کے دودھیا چہرے پر پڑیں بنا گئیں...... اس کی سانسیں کچھ پل کے لیے رکیں اور وہ لاش اس

''کچھ دیر میں یہاں سے اگلے جو گاؤں ہے، وہاں سے ملٹری کا نوائے گزرے گا...... ہمیں کسی طرح اس تک زندہ سلامت جانا ہے......'' مستجاب اس کو دیکھے بنا کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

آسمان میں جاگتا چاند اب رو رہا تھا۔ ہوا میں نمی نہیں اور حبس سے سانس گھٹتا جا رہا تھا۔ کھیت کے بیچوں بیچ اب وہ لیٹ چکی تھی۔ اس کو اماں کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔

''دانین...... دانین......''

لیکن وہ اٹھ نہیں پا رہی تھی، بالکل چت لیٹی سیاہ اندھیرے میں خود کو گم ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس کو پھر بڑی ماں کی آواز سنائی دی اور نجمہ کی...... پھر وہ رونے لگی، پھوٹ پھوٹ کر......

''انہوں نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا...... یا شاید وقت نے......'' اب اس کی ہچکیاں بلند ہونے لگیں۔ بچپن سے لے کر جوانی تک وہ ایک ہی گھر میں رہی تھی۔ کبھی کبھی باہر زیادہ نہیں نکلی تھی۔ بس دو تین بار میلے کے لیے اور چند بار بازار گئی تھی۔ وہ اس سارے حادثے میں خود کو یوں اکیلا ہو جانے پر غم زدہ نہیں تھی وہ کبھی بھی اپنے گھر والوں سے نہیں مل پائے گی۔ یہ غم اس کو رلا رہا تھا...... وہ لیٹی رہی۔

وہ لیٹی...... پھر جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کا مرنا طے ہے آج، تو وہ اٹھی اور کھیت سے باہر نکلی...... اور پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ وہ ایک ہی سمت میں جا رہی تھی، آس پاس خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی میں دور کہیں کسی کے کراہنے کی آواز آتی تھی اور پھر لمبی اور گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس کا دوپٹہ کہیں گر چکا تھا۔ دور کہیں سے بیل گاڑی کی آواز آئی تھی...... وہ رکی، پھر کچھ سوچ کر چل پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ بیل گاڑی اس کے قریب آ گئی تھی۔ دفعتاً اس کو دیکھ کر ایک بیل گاڑی رکی اور اس نے ایک بوڑھی عورت کی مہربان آواز سنی تھی۔

''روک دے جیرے! روک گاڑی...... وہ دیکھو، وہ لڑکی......!'' اماں بی کا اشارہ یقیناً اس کی طرف تھا، وہ سوچ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد، اس نے اپنے ہاتھ پر کھردرے بوڑھے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔

''بٹیا!'' اماں بی نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں نرمی سے دبایا اور اپنا سفید لیس والا دوپٹا اس کے سر پر رکھا۔ ''چلو ہمارے ساتھ، یہ والی ٹرین آخری ٹرین ہے۔ اس کے بعد کوئی ٹرین یہاں سے نہیں گزرے گی۔''

پتا نہیں کیوں، لیکن اس کا دل پگھل گیا اور وہ رو دی تھی۔ اماں بی کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں اور وہ دانین کو گلے لگائے رو دیں۔

''چلو اماں...... دیر ہو رہی ہے۔'' جیرے کے لہجے میں بے زاری نہیں تھی، خوف تھا۔

جیرے کے پکارنے پر وہ اماں بی کے پیچھے ہو لی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسٹیشن کے قریب کھڑے تھے۔ ایسے میں ٹرین اسٹیشن پر رکی اور لوگ چڑھنے لگے تھے۔ وہ لوگوں کی بھیڑ میں اماں بی کا پلو پکڑے چل رہی تھی۔ اماں بی دو قدم آگے چل کر پیچھے مڑ کر دیکھتیں اور پھر واپس آگے چلنے لگتی تھیں۔

''تمہارا نام کیا ہے بٹیا؟'' اماں بی نے اس کے خوف کو زائل کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''دانین...... دانین!''

''کتنا پیارا نام ہے۔'' اماں بی کے جھریوں زدہ چہرے پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔

دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ابھرنے لگی۔ ٹرین کی چھت پر چڑھتے لوگ، نیچے کھڑے لوگ مڑ کر اندھیرے میں گھوڑوں کی آوازوں کے تعاقب میں دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً ہوا میں گولی چلنے کی آواز ابھری۔ اور ایک انسانی کراہتی چیخ نے اس گولی کی آواز کی تقلید کی تھی۔

ہجوم میں اب پھر سے ہلچل مچی، لوگ تتر بتر ہونے لگے۔ یہ رات کتنی لمبی اور وحشیانہ تھی...... کتنے

کے اوپر آ گری۔ اس کا ہاتھ اماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ گر چکی تھی، بالکل اسی میلے کی طرح...... وہ بیٹھی، آس پاس چلنے والے ہنگامے کو بنا دیکھے...... تیز تیز سانسیں لے رہی تھی۔ ہر دفعہ کوئی جان بچانے والا نہیں آتا۔ اس نے ہمت مجتمع کی اور اٹھی اور بنا سوچے سمجھے ایک سمت بھاگنے لگی۔

اماں اس سے بچھڑ چکی تھیں لیکن وہ بھاگ رہی تھی...... تیز، تیز...... کوئی اس سے ٹکراتا اور وہ پھر سے گرتی...... پھر سے اٹھ کھڑی ہوتی اور بھاگنے لگتی......

ایسے میں اس کو احساس ہوا کہ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور اپنی طرف کھینچا تھا......

''ارے جیتو...... یہ دیکھ...... یہ تو حاجی صاب کی سوہنی پوتی ہے......'' کھینچنے والا تیز تیز سانسیں لے رہا تھا، اس کے جسم سے پسینے کی تیز بدبو آ رہی تھی۔ کسی کو جنونیت سے مارتا جیتو مڑا اور رال ٹپکانے لگا۔ ''یہ تو وہ اندھی ہے......!''

پل بھر کے لیے اس کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس کے سامنے رنویر کھڑا تھا، جس کو اس کے اپنے ہی باپ نے بھری پنچائیت میں نجمہ کو چھیڑنے کی وجہ سے مارا تھا۔

دانین کی مزاحمت ان دو وحشیوں کے آگے صفر تھی۔

''یہ تو کیا کر رہا ہے؟'' رنویر نے رک کر اس کو دیکھا۔

اس نے اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کی۔

''یہ میرا مال ہے!''

''کیا کہا تو نے؟'' رنویر کی آواز میں واضح دھاڑ تھی۔ دونوں ہاتھوں پر دونوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی تھی۔

''یہ میرے ساتھ جائے گی۔'' جیتو نے کہا اور اگلے ہی لمحے ایک زوردار مکا اس کے منہ پر پڑا تھا۔ اس نے تھوک اگلا تو خون سے بھرا ہوا تھا، اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

اس نے بدلے کے طور اس پر تلوار سے وار کیا اور اس وار سے رنویر اور مشتعل ہوا...... دانین اب ان دونوں کے لڑنے کو غنیمت سمجھتی کھیتوں کے بیچ میں بھاگنے لگی...... بھاگتے بھاگتے وہ گرتی رہی...... لیکن وہ بھاگ رہی تھی...... پھر اس لمبی رات میں ایک سیٹی کی آواز سنائی دی...... ٹرین کی سیٹی......

اماں اور باقی لوگ چلے گئے اور وہ اکیلی رہ گئی۔ کھیت کے بیچوں بیچ وہ بیٹھی اور رونے لگی......

''اماں......!!''

☆☆☆

اماں، چاچی لوگ آگے نکل چکے تھے۔ نجمہ کی نظریں سب کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن اس کو کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی سکھ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تبھی کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچا۔

''بھاگو......!!''

وہ مستجاب تھا، جو اس کو نہیں دیکھ رہا تھا اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ تیز تیز بھاگنے لگی۔ وہ بہت آگے نکل چکے تھے، ٹرین کی سیٹی بجی تو وہ لوگ پرانے مندر کے پاس برگد کے گھنیرے درخت کے نیچے چھپے تھے۔ وہ دونوں وہی چھپے سانسیں بحال کرنے لگے تھے۔ ''چاچا اور چاچی؟''

مستجاب نے صرف اتنا پوچھا تھا، کتنا عجیب سوال ہے کسی سے اس کے اپنوں کے بارے میں پوچھنا کہ وہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔

''وہ آگے نکل چکے ہیں...... وہ ٹرین میں جا چکے ہوں گے۔'' نجمہ کو پیچھے رہ جانے کا قطعاً غم نہیں تھا۔ مستجاب نے سر اثبات میں ہلایا۔ کچھ دیر ان کے بیچ خاموشی چھائی رہی......

''اور بانو......؟'' اس نے ہمت کر کے خاموشی کا گلا گھونٹا۔ کتنی عجیب خاموشی ہے۔ اس نے سوچا۔

''وہ...... مجھے بھی امید ہے وہ کہیں نا کہیں زندہ ہوں گی۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا اور آنکھیں بالکل کھوکھلی...... کسی بھی جذبے سے عاری......

لوگوں کے خون سے رنگ چکی تھی۔
اماں نے اس کو ہاتھ سے پکڑا اور اس کو کھینچنے لگیں۔ اماں کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر اماں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور کسی کی تلوار کے وار سے وہ پیچھے مڑیں اور دانین کو گلے لگا کر اپنے ساتھ اس کو بھی گرا گئیں اور اس کی ڈھال بن گئیں......
"بٹیا...... میری بات غور سے سنو۔ اٹھنا مت اور خود کو مردہ دکھاؤ......" ٹوٹ ٹوٹ کر کہتیں اماں نے اپنے آخری الفاظ کہے۔
پھر اس پر ایک اور لاش گری اور پھر ایک اور...... لمحے بھر میں اس کے اوپر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔
پھر اس نے اپنی سانس گھٹتے ہوئے محسوس کی۔ اس کا سانس واقعی میں بند ہونے لگا تھا۔ وہ لاشوں میں سے اپنے کڑے والا ہاتھ نکال کر زمین پر مارنے لگی۔ آخر کار اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ مرنے والی ہے، تب اس نے اپنے اوپر بوجھ کم ہوتے محسوس کیا۔ کوئی اس کے اوپر سے لاشیں اٹھا رہا تھا۔ جب وہ لاشیں ہٹا چکا تو اس نے دانین کو سہارا دے کر اٹھایا اور اس سے پوچھا......
"آپ ٹھیک ہیں؟"
اور یہ آواز وہ کبھی نہیں بھولی تھی......!!

☆☆☆

خون کی بیساکھ

"وشال...... وشال!!"
کوئی اس کو پکار رہا ہے، اس کو یہ آواز دور سے سنائی دے رہی تھی...... بہت دور سے...... پہاڑوں سے یا شاید گہرے کنوئیں سے...... ہاں، یہ آواز گہرے کنوئیں سے آ رہی ہے......
"وشال بھاگ...... بھاگ وشال بھاگ!"
یہ آواز وہ پہچانتا تھا، اس نے سوچا۔ پھر اس کو یاد آیا شاید یہ اس کی ماں کی آواز ہے۔
"وشال بھاگ!"
اس کی ماں کی آواز اتنی چیختی اور کراہتی ہوئی کیوں تھی، وہ بے چین ہونے لگا۔ اس کے گردن سے پسینے کی ایک لمبی سی دھار اس کے کمر پر بہتی گئی۔
"رولٹ ایکٹ نامنظور!"
رولٹ ایکٹ نامنظور!! کسی آدمی کے نعرے اس کی ماں کی چیخوں پر بھاری پڑنے لگے۔ یہ سب کچھ اس کو دھندلا سا کیوں لگ رہا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن اس کی آواز نہیں نکلی۔
"رولٹ ایکٹ نامنظور!!" تیز نعرے لگاتی مردانہ کرخت آواز......
"بھاگ وشال بھاگ!!" اس کی ماں کی دور کنوئیں سے آتی آواز......
یہ دونوں آوازیں اب گڈمڈ ہونے لگیں، پھر تیز ہوتی گئیں...... تیز ہوتی گئیں...... اتنی تیز کہ اس کو لگا کہ اس کے کان پھٹ جائیں گے۔
اس نے کانوں پر ہاتھ رکھے...... ایسے میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک لمبا سا میدان ہے اور بہت سے لوگ جمع ہیں اور دفعتاً گولیوں کے چلنے کی آوازیں آتی ہیں اور لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔
پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک گولی اس کی جانب آ رہی ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے...... دیکھتا ہی جا رہا ہے...... اور دفعتاً وہ، اس کو ایک چنگھاڑتی آواز۔
وہ اس آواز کے ساتھ یک دم اٹھا...... اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ نومبر کے اس ٹھٹھرتی ہوئی یخ بستہ سردی میں بھی اس کو پسینے آ رہے تھے۔ وہ طنزیہ مسکرایا اور اٹھ کر پانی پینے باہر چلا گیا۔
کمرے میں اس کے رائٹنگ ٹیبل وہ کتاب ویسے ہی کھلی پڑی تھی اور لالٹین کا تیل شاید ختم ہو چکا تھا لیکن تیل کی کڑوی کسیلی بو پھیلی ہوئی تھی۔
باہر نکلا تو اس کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا، دروازے کے آگے تازہ اخبار رول کیا ہو پر پڑا تھا۔ اس نے اخبار اٹھایا اور دروازہ کھولا۔ سامنے دودھ والا کھڑا تھا۔
"نمستے بھیا!" پورے بتیس کے بتیس دانتوں کی نمائش کرا کے دودھ والے نے کہا۔
اس نے محض "ہمم" کیا اور اس سے دودھ لے کر دروازہ بند کر دیا۔
اخبار کے پچھلے حاشیے میں بمبئی میں ہونے والے مارچ میں گرفتار ہونے والے لوگوں کی خبر تھی اور نیچے کانگریس اور مسلم لیگ کے کسی بات پر اختلاف پر ایک لمبا سا کالم چھپا تھا۔ وہ چائے بنا کر، اخبار پڑھنے لگا تھا

☆☆☆

۱۲ اپریل۔ امرتسر۔ پنجاب۔
خاکی یونیفارم پہنے سپاہی، ہاتھوں میں بندوقیں لیے ہوئے تھے۔ کچھ سپاہی گھوڑوں پر سوار تھے۔ گلی کے دیواروں پر پوسٹر چپکائے گئے تھے جو بعد میں پھاڑے بھی گئے تھے...... ایسے میں ایک پر امن احتجاج کرتی ریلی گلی کے بیچ سے گزر رہی تھی اور گھوڑوں پر سوار پولیس والے ریلی کے سامنے کھڑے تھے۔
"رولٹ ایکٹ نامنظور!!" ایک سیاہ پگڑی والے سکھ کی کرخت اور چنگھاڑتی آواز بلند ہوئی اور اس کی تقلید میں مجمع نے کورس میں کہا۔
"رولٹ ایکٹ نامنظور!!"
(رولٹ ایکٹ، جسے کالا قانون بھی کہا جاتا ہے، کو سر سڈنی رولٹ کی سربراہی میں بنائی گئی کمیٹی کی سفارشات پر نافذ کیا گیا۔ اس ایکٹ میں حکومت کو مزاحمتی تحریکیں کچلنے کے لیے بہت اختیارات دیے گئے۔ حکومت کسی بھی دہشت گردی کے جرم میں گرفتار شخص کو بنا عدالتی مداخلت کے دو سال جیل میں رکھ سکتی ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق پولیس کسی بھی جگہ کی تلاشی اور بغیر وارنٹ کے کسی کو بھی گرفتار کر سکتی ہے۔)
وہ مدھر کے ساتھ گلی میں کھیل رہا تھا، جب مدھر کی ماں دروازہ کھول کر دونوں پر چلائی......
"پاگلوں! اندر آؤ!"
لیکن دونوں ریلی کو دلچسپی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس وقت سات سال کا تھا اور مدھر آٹھ کا۔ دفعتاً ریلی پر گولیاں برسائی گئیں اور ریلی میں اشتعال برپا ہوا۔ مدھر اور وہ گھر کے اندر بھاگے......
دیر تک نعرے سنائی دیتے رہے تھے۔ "رولٹ ایکٹ نامنظور!!"
شام کو وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اس کی ماں، باپو سے لڑ رہی تھی...... پتا نہیں کیوں۔
وہ کھڑکی سے باہر گلی کے نکڑ کے اندھیرے میں ہاتھ میں لالٹین لیے یہ بار بار دہراتے پولیس کو گم ہوتے دیکھتا رہا۔ کل جلسہ تھا اور بیساکھ بھی...... وہ جلدی سے سونے لگا۔

☆☆☆

۱۳ اپریل 1919۔ جلیانوالہ باغ۔ امرتسر۔
آج کا آسمان بالکل صاف تھا......
جلیانوالہ باغ میں کوئی خاص درخت پودے وغیرہ نہیں تھے۔ یہ ایک خالی سا قطعہ زمین ہے جو مختلف لوگوں کی مشترکہ ملکیت تھی۔ چاروں طرف سرخ اینٹوں والے مکانات تھے۔ ایک شکستہ سمادھی اور ایک کنواں بھی باغ میں تھا۔
رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو لیڈر تھے۔ اس احتجاج کے باعث حکومت نے دونوں پر پابندی لگا دی تھی اور بعد میں ڈپٹی کمشنر کے بنگلے میں بلا کر ان کو گرفتار کیا تھا۔
بیساکھ کی خوشی کہیں اور جا بسی اور سارے لوگ، کچھ اس بات سے بے خبر تھے کہ ہر قسم کے اجتماعات پر پابندی ہے اور زیادہ باخبر، جلسے میں شمولیت کے لیے آن پہنچے۔
باغ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک سکھ کھڑا چلا کر تقریر کر رہا تھا۔
"رولٹ ایکٹ کو ہم نہیں مانیں گے...... ستیہ پال اور کچلو کی محنت کو رائگاں نہیں ہونے دیں گے......"
جلسہ جاری تھا...... ماں باپ کے ساتھ وہ بھی

آیا تھا اور سامنے بیٹھا مدھر اس کو دیکھ کر ہنس رہا تھا ۔وہ اپنی ماں سے چھپ کر آیا تھا۔
کچھ دیر بعد ،ایسے میں کئی لوگ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے ۔سامنے کوئی انگریز کھڑا تھا اور اس کے پیچھے سپاہیوں کا دستہ...... وہ ڈائر تھا، سفاک اور بے حس سرخ...... سب لوگ اٹھ کر دیکھنے لگے...... مقرر سب کو بیٹھنے کا کہہ رہا تھا۔اس نے اٹھ کر دیکھا تو سپاہی مجمع پر بندوق تانے ہوئے تھے۔پھر اس انگریز نے کچھ کہا اور چیختی چنگھاڑتی آواز کے ساتھ گولی سامنے کھڑے ایک نوجوان کے سر کو چیرتی ہوئی گئی پھر گولیاں چلنے لگیں...... تیز تیز...... لوگ بھاگنے لگے...... لاشیں گر رہی تھیں۔وہ اپنی جگہ پر کسی مجسمے کی طرح کھڑا تھا۔
پھر اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اس کی طرف بھاگتا ہوا آ رہا ہے اور جیسے ہی اس کے قریب آن پہنچتا ہے،اس کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے۔
پیچھے سے ماں چلائی اور اس کو کھینچنے لگی۔لوگ لاشوں کے اوپر چڑھنے لگے تھے۔اور دیوار پھلانگنے لگے تھے۔پھر اس نے ماں کو بھی خون سے لت پت گرتے دیکھا...... اور اس کی چیخیں سنیں۔
''بھاگ وشال بھاگ......!!''
وشال یک ٹک ماں کو دیکھ رہا تھا۔کوئی اس پر گرا تھا اور پھر کوئی اور...... دفعتاً وہ لاشوں کے بیچ دب چکا تھا۔

☆☆☆

ٹرین کی چھک چھک جاری تھی اور اس کے سامنے ایشوریہ بیٹھی تھی...... اس کی ناک رو رو کر سرخ ہو چکی تھی بالکل ٹماٹر جیسی ، وہ اس کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
''ہم کہاں جا رہے ہیں دیدی؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔
گول چشمہ پہنے،سفید کپڑوں میں ملبوس اس کا جیجا مدھو بھی بیٹھا ہوا تھا۔اس کی بہن نے اس کو گلے لگا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔اس کو وہ رات یاد آئی...... کالی،لمبی اور لاشوں سے بھری...... وہ اپنے اوپر لاشیں ہٹا چکا تھا اور ماں کو ڈھونڈ رہا تھا۔پھر اس کو ماں مل گئی تھی۔خون سے لت پت...... اور آنکھوں کی پتلیاں ساکت......
''ماں...... ماں......!'' وہ دیوانہ وار اس کو اٹھا رہا تھا۔ماں بالکل اسی طرح سونے کی اداکاری کر رہی تھی جب وہ اس بات پر خفا ہوتی تھی کہ وہ شام دیر سے گھر کیوں آیا...... یا پھر اس نے مدھر کو کیوں پیٹا...... اب وہ رونے لگا تھا...... بلک بلک کر......
ایسے ہی تو وہ اٹھ جاتی تھی، لیکن اب اماں اس کی نہیں سن رہی تھی...... چت لیٹی تھی اس سے روٹھی ہوئی...... کہ اس نے جلسے میں جانے کی ضد کیوں کی؟
'' ماں اٹھو نا ...... گھر چلتے ہیں ...... ماں......'' ماں نہیں اٹھ رہی تھی...... اسے اٹھنا تھا ہی نہیں......
اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے ، ایشوریہ نے اپنی سفید ساڑھی سے اس کے آنسو پونچھے۔
''ہم چمپانیر جا رہے ہیں...... اب تم ہمارے ساتھ رہو گے وشال!!''

☆☆☆

یہ سانحہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ بن گیا تھا۔وہ راتوں کو نیند سے اٹھ بیٹھتا تھا، پسینے سے شرابور اور تیز تیز سانسیں لے رہا ہوتا تھا۔رفتہ رفتہ وہ سنبھلتا گیا...... لیکن پھر بھی وہ اس رات کی یاد آتے ہی ڈر جاتا تھا...... وقت زخم مندمل تو کر دیتا ہے لیکن پھر ذرا سا کھرچنے پر وہ زخم پھر سے تازہ ہو جاتے ہیں...... اور نئے طریقے درد دیتے ہیں۔
اس نے چمپانیر کے ہی اسکول میں پڑھا، پھر وہ کالج کے لیے شہر چلا گیا اور بمبئی سے اس نے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔
اس کی زندگی میں کچھ خاص واقعات نہیں ہوئے ، سوائے آنندی کے...... جس نے اس کی

نعمت میں بچی تھوڑی سی زندگی اور...... آنندی مدھو کے چاچا کی اکلوتی بیٹی تھی۔بچپن میں وہ خاموش طبع واقع ہوا تھا، وہ کسی سے باتیں نہیں کرتا تھا اور آنندی ہر روز اس کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔اس کو کھیلنے کے اکسانی تھی۔لیکن اس نے کبھی اس کے ساتھ کھیلا نہیں...... وہ بڑا ہوتا گیا اور آنندی بھی......
پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے اردگرد گھومتی آنندی اب دکھائی نہیں دے رہی تھی تو وہ کسی بہانے اس کو دیکھنے جاتا۔
آنندی کے چہرے پر بلوغت کی سرخی پھیلی ہوئی اور اس کی چال پہلے سے زیادہ نزاکت سے بھری ہوئی تھی۔وہ اس کو محبت کا نام نہیں دے پا رہا تھا، بس وہ اس کو اچھی لگتی تھی...... اچھی اور بس......
''وشال !تم مجھے ذرا بازار تک چھوڑ آؤ گے؟'' وہ اوپر بالکنی میں بیٹھا نیچے جھانک رہا تھا، جب اس نے تیار کھڑی آنندی کو دیکھا...... وہ اس سے کچھ کہہ رہی تھی، لیکن وہ سن نہیں رہا تھا۔
''کیا؟''
''تم میرے ساتھ ذرا بازار ہو آؤ!!'' آنندی نے اپنا سوال دہرایا۔
''ہاں...... کیوں نہیں......'' وہ اس کے ساتھ نیچے اترنے لگا۔
سارے بازار میں وہ اچھلتی کودتی جا رہی تھی اور وہ اس کو پیچھے سے دیکھتا رہا۔اس کے بال کافی لمبے تھے،اور وہ غرارہ پہنے دوپٹا بار بار سر پر درست کر رہی تھی۔پھر ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو کر وہ ہار پہننے لگی، لیکن وہ پہن نہیں پا رہی تھی ۔وہ دکاندار سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کو دیکھ رہا تھا۔آنندی پلٹی۔
''وشال! یہ ذرا پہنا دو۔''
یک ٹک اس کو دیکھتا وشال ہڑبڑایا۔''کیا؟''
''تم بہرے تو نہیں ہو چکے؟'' وہ اس کو مصنوعی خفگی سے دیکھ رہی تھی۔
''میں تو...... کیوں......؟''
''پہلا ،تم اتنے سوالات کیوں کرتے ہو؟ ۔دوسرا، میں نے تم سے کہا کہ یہ ہار پہنانے میں میری مدد کر دو ذرا۔'' دکاندار دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
''میں نہیں پہنا سکتا......!!'' اس نے صاف انکار کر دیا۔
آنندی پلٹی۔''بھیا آپ پہنا دیجیے!''
''نہیں...... نہیں ، دو مجھے...... میں پہنا دیتا ہوں ۔'' اس نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے ہار کھینچا۔آنندی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی...... اور بھیا بھی کھسیا کر ہنسنے لگا۔
اس کو ہار پہناتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔جب وہ ہار پہنا چکا تو آئینے میں اپنا سراپا دیکھتی آنندی کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ تھی۔
بازار سے واپسی پر ان دونوں کو ایک ساتھ جب ایشوریہ نے دیکھا تو رات کو ایشوریہ اس کے پاس آئی۔وہ دیے کی روشنی میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔
''تمہیں آنندی پسند ہے؟'' ایشوریہ اس کے چہرے کو دیکھتی، اس کے جواب سے پہلے ہی جواب ڈھونڈ رہی تھی۔
وشال نے تحیر سے اس کو دیکھا۔''پسند سے مطلب؟۔وہ اچھی ہے۔''
ایشوریہ مسکرائی...... ''چلو اس مدعا پر پھر کبھی بات کریں گے ۔مدھو امرتسر والی ہماری کوٹھی بیچ رہا ہے اور تمہارے لیے یہاں سمراٹھ کی کوٹھی خریدنے کا سوچ رہا ہے...... غصہ مت ہونا، اگر تم چاہتے کہ تم واپس امرتسر چلے جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ...... لیکن اگر یہاں چمپانیر میں رہنا ہے تو شادی کر کے یہاں بس جاؤ۔'' ایشوریہ اب بھی بولتے ہوئے اس کے سپاٹ چہرے پر اس کے جواب سے پہلے جواب ڈھونڈ رہی تھی...... اس کی آنکھیں امرتسر کے ذکر پر درد سے بھر گئی تھیں...... وہ خاموش رہا۔
ایشوریہ بھی خاموشی سے اس کے جواب کے

انتظار میں بیٹھی رہی۔ وہ خاموش تھا...... پھر جب وہ اٹھ کر بنا کچھ کہے جانے لگی تو اس نے دھیمے لہجے میں وشال کی آواز سنی تھی۔

"ایک رات وہاں رہ کر آتے ہیں...... صرف میں اور آپ...... پھر بیچ دینا!"

☆☆☆

جب وہ کالج سے فارغ ہوا تو وہ اپنی نئی کوٹھی میں منتقل ہوا...... اس کی سگائی آنندی سے ہو چکی تھی۔ پھر وہ وکالت پڑھنے بمبئی چلا گیا......

اس کے تعلقات آنندی سے بس اس کو دیکھنے تک ہی رہے...... وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی یا وہ اس کو دیکھنے سے کتراتی تھی، وہ اس بات کا تعین نہیں کر پا رہا تھا...... شاید وہ اس سگائی سے خوش نہیں تھی، وہ اکثر سوچتا تھا۔

شام کا سمے تھا۔ شفق کی لالی آسمان کے کنارے پر ایسا منظر پیش کر رہی تھی کہ جیسے کسی نے نیلے دوپٹے کے کنارے ہلکی سی آگ لگا دی ہو...... وہ چھٹیوں پر آیا تھا اور آتے ہی وہ ایشوریہ سے ملنے چلا گیا۔

ان کے گھر کا ماحول خاصا تنا تنا محسوس ہوتا تھا، راہداری میں بے خیالی میں آتی آنندی اس کو دیکھ کر رکی اور اگلے ہی پل پیچھے مڑ کر بھاگی...... وہ تحیر سے اس کو جاتا دیکھتا رہا۔

"یہ آنندی کو کیا ہوا؟" چائے پیتے ہوئے اس نے ایشوریہ سے پوچھا، ایشوریہ نے آنکھیں چرائیں۔

"پتا نہیں...... وہ ماما اس کو کی پڑھائی چھڑوا رہا ہے۔ اور وہ ضد پر اڑی ہے کہ اسے آگے پڑھنا ہے۔ بی اے کرنا چاہتی ہے۔" ایشوریہ کا لہجہ تیز تھا، یوں جیسے ابھی ابھی اس نے یہ بات گھڑی ہو۔

"تو اس میں کیا برائی ہے؟"

"پتا نہیں...... ماما جانے اور آنندی......" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر چلی گئی۔

جب وہ اپنی کوٹھی کے لیے نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سیڑھیوں میں بیٹھی وہ خط لکھتے رو رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر اس کو دیکھتا وشال، اپنے دل میں اس کے لیے کوئی احساس نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔

اس کی شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ گھر میں تیاریاں چل رہی تھی۔ ایشوریہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی جو ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھے۔

"تم خوش نہیں ہو؟" ایشوریہ نے استفسار کیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"تم مجھے خوش نہیں دکھ رہے وشال...... میری طرف دیکھو، کیا بات تمہیں کھائے جا رہی ہے؟"

"کچھ نہیں...... بس میں ہوں ہی ایسا......"

"تم تو آنندی کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔"

وہ خاموش رہا...... اور باہر نکلا۔ وہ واقعی آنندی کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اس کو دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ اب وہ کچھ محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ شاید آنندی کے بدلے ہوئے رویے کی وجہ سے تھا۔

وہ پرانے مندر کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں ایک بڑا سا برگد کا بزرگ درخت تھا۔ وہ ہمیشہ جب کوئی خیال اس کو تنگ کیے رکھتا تھا تو وہ برگد کے نیچے گھنٹوں بلاوجہ بیٹھا رہتا...... مندر کے کچے اور اکھڑے اینٹوں والی دیوار کو پھلانگ کر وہ اب اندر جا رہا تھا۔ برگد کے درخت کے نیچے اس کی جگہ پہلے سے کسی نے لی ہوئی تھی۔ انسانی ہیولے دیکھ کر وہ پلٹا لیکن اگلے ہی پل وہ واپس مڑا اور اس نے دیکھا......

وہ آنندی تھی جو ایک نوجوان کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے سر جھکائے رو رہی تھی اور وہ نوجوان اس کو دلاسا دے رہا تھا۔

نظروں کی حدت محسوس کرتے ہوئے آنندی نے سر اٹھایا اور گردن اٹھا کر اس کو دیکھا۔ آنندی نے جلدی اس کا ہاتھ چھوڑا اور اس کی طرف بھاگی۔

"وشال...... میری بات سنو......"

وہ رکنا نہیں چاہ رہا تھا، اس لیے چلتا رہا۔ آنندی اس کے قریب پہنچی اور اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وشال نے دیکھا کہ آنندی کی آنکھیں سرخ تھیں اور سوجی ہوئی تھی...... شاید کئی دنوں سے روتی رہی ہو۔ آنندی نے گہری سانس بھری۔ "دیکھو وشال! میں ہمیشہ سے تمہیں ایک اچھا سمجھتی ہوں۔ بچپن میں سب مجھے کسی کھیل میں وقت کھیلنے نہیں دیتے تھے کیونکہ میں ایک کمزور کھلاڑی تھی اور ہر بار ہار جاتی تھی۔ میں گھنٹوں روتی تھی اور پھر تمہارے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔ تم نے کبھی میرے ساتھ کھیلا بھی نہیں...... لیکن پھر بھی میرے ساتھ خاموشی کے ساتھ وقت بتاتے رہے۔ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی احساس نہیں ہے...... میرا دل کبھی تمہیں دیکھ کر دھڑکا نہیں...... وہ احساس جو پہلی جھلک کو دیکھ کر میرے دل میں مچلتا ہے، پہروں دل در کنار رہتا ہے۔ وشال! ایشور کی سوگندھ! میں سب کچھ ختم کر کے تمہارے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں لیکن ہمارے بیچ کبھی محبت نہیں ہوگی۔ میں بھی تمہیں نہیں چاہوں گی۔"

لمحے بھر کے لیے آنندی نے توقف کیا۔ "جب ہماری سگائی ہوئی تو تم بمبئی چلے گئے، میں نے کئی بار گھر میں ہنگامہ کیا کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی، لیکن باپو اڑے رہے۔ میں پھر سے بتا رہی ہوں وشال...... میں سب کچھ ختم کرنے جا رہی ہوں۔ تم باپو اور دیدی سے کچھ نہیں کہو گے...... یہ آخری دن صرف دوستی کے نام کر دو۔"

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا، جب وہ خاموش ہوئی تو اس نے محض اتنا کہا۔ "اچھا"

آنندی اس کو تحیر سے دیکھتی رہی۔ وشال پلٹا تیز تیز جانے لگا لیکن اس کے قدم اپنی کوٹھی کی بجائے ایشوریہ کے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب وہ ایشوریہ کے گھر پہنچا تو دھوپ سر پہ ہوا اڑے [illegible] جا رہی تھی اور نیم کے تخ بستہ چھاؤں [illegible] کی چھپانے کی آوازوں پر باہر گلی میں آوازیں پراسرار ہوتی جا رہی تھیں۔

برآمدے میں حسب معمول گول چشمہ پہنے، مدھو اخبار پڑھ رہا تھا اور بنگالی ساڑھی پہنے ایشوریہ پرچ پیالی پکڑے، چائے پیتے ہوئے، آنندی کے باپو کے ساتھ محو گفتگو تھی جو کہ سگار پی رہے تھے۔ اس کو آتا دیکھ ایشوریہ کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ آن ٹھہری۔

وہ بجھے بجھے قدم اٹھا کر اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ "میں آنندی سے شادی نہیں کر سکتا...... اس کے لیے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ رکا نہیں اور جانے لگا۔

تینوں کے منہ تحیر سے وا ہوئے، ماما کھانسنے لگے۔ ایشوریہ اٹھی اور اس کے پیچھے بھاگی۔

"وشال...... میری بات سنو۔"

وہ رکا نہیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی کوٹھی چلا گیا کچھ دیر بعد ایشوریہ وہاں حاضر تھی۔

"یہ کیا تھا وشال؟" وہ غصے سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ "میری طرف دیکھو، یہ کیا کیا تم نے وہاں۔"

"شادی سے انکار......!" اس کا لہجہ بھی اس کے چہرے کے تاثرات کی طرح سپاٹ تھا۔

"کیا مطلب شادی سے انکار...... تم ایسا کیسے کر سکتے ہو۔ پتا ہے تمہیں، کتنی بدنامی ہو گی ہماری۔"

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"معلوم ہے...... تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ہمیں تو پڑتا ہے، تم ایسے اچانک شادی سے انکار کیسے کر سکتے ہو؟" ایشوریہ کی آواز میں ابھی غصہ دبا دبا سا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وشال کے تاثرات بدل رہے تھے۔ ایسے میں وہ پلٹا۔

"اور جو آپ لوگوں نے اتنے عرصے مجھے اندھیرے میں رکھا؟ اس کا کیا؟"

اب کی بار ایشوریہ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس نے دیکھا...... اس کے سامنے کھڑا وشال، وہ چھوٹا وشال بن گیا جو اس کو روتے بتا رہا تھا کہ ماں کو آج باپو نے ایک طوائف کی وجہ سے خوب

مارا۔

"مجھے ایسا رشتہ رکھنا ہی نہیں ہے، جو مجھے ماں کی یاد دلاتا رہے...... میں اس اذیت سے نکلنا چاہتا ہوں مزید اس میں ڈوبنا نہیں......"

وہ پلٹا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے ایشوریہ اس کو دیکھتی رہی...... وشال ایک بار پھر سے اذیت کے دلدل میں گر چکا تھا اور وہ اس کا اظہار کبھی نہیں کرے گا، یہ وہ جانتی تھی۔

☆☆☆

اس نے ایشوریہ کے کہنے پر وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن آگے اس نے پریکٹس نہیں کی۔ ان دنوں کالج میں آسامیاں نکلی تھیں۔ اس کو وہاں نوکری مل گئی اور وہ وہاں پڑھانے لگا۔

ان کے گھر میں کیا ہوتا رہا، اس نے کبھی پوچھا نہ ہی ایشوریہ نے اس کو کوئی بات بتائی۔ آنندی کی شادی اسی لڑکے سے ہوئی جس کا نام ابھشیک تھا اور شہر میں ایک چائے خانہ چلاتا تھا۔

وہ اب بھی برگد کے نیچے وقت بتانے جاتا تھا۔ اس کو آنندی سے واقعی محبت نہیں تھی۔ وہ شاید کوئی وقتی سلگتا جذبہ تھا...... ہاں یقیناً...... کیونکہ اس کو آنندی کا کبھی پچھتاوا ہی نہیں ہوا، اس نے کبھی آنندی کے لیے اپنا دل روتا محسوس نہیں کیا۔

ماگھ کا مہینہ شروع ہوا، سردی میں وہ رات دیر تک انگیٹھی کے سامنے لالٹین کی روشنی میں کتابیں پڑھتا رہتا...... ملک کے حالات سے وہ محض اخبار پڑھنے کی حد تک باخبر تھا اور اخبار بھی آدھا سچ اور آدھا جھوٹ ہی تو چھاپتا تھا۔

یہ ماگھ کے اوائل دنوں میں سے ایک کہرے بھرے دن کی روداد ہے۔ وہ کرشن سے دودھ لے کر پلٹا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ سامنے جو حاجی اشرف کا گھر تھا اس کے اندر اس نے دو تین بندوں کو گھستے دیکھا، جس میں سے صرف وہ ایک بندے کو جانتا تھا۔ دیوار ٹاپتا وہ...... اس کی پرانی منگیتر کا شوہر...... ابھشیک تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ان کے گھر میں سے چیخیں بلند ہوئیں۔ کسی نے حاجی مشرف، ان کی بیوی اور تین بیٹیوں کو قتل کر دیا تھا۔ گاؤں میں ایسے واقعات پر پنچایت بیٹھتی تھی، لیکن پنچایت بیٹھنے سے پہلے ہی حاجی اشرف کے گھر میں وشال نے پولیس کو قاتلوں میں سے ایک قاتل کا نام بتا دیا۔ جب پولیس ان کو گرفتار کر کے لے گئی تو اگلے دن آنندی دندناتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ وہ برآمدے میں بیٹھا ایشوریہ سے محو گفتگو تھا۔ ایشوریہ اس بات پر نالاں تھی کہ اس نے کیوں پولیس والوں کو بتایا؟۔ کیوں وہ اپنے لیے مشکلات پیدا کرنا چاہتا ہے۔

"تم نے میرے پتی پر ایسا گھناؤنا آروپ کیوں لگایا وشال!" وہ آتے ہی اس پر چیخ رہی تھی۔

"آنندی! یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟"۔ ایشوریہ کو اس کا لہجہ کھٹکا۔

"آپ پوچھیں نا اپنے بھائی سے...... میرے پتی نے کب کیا یہ...... یہ صرف اپنا بدلہ لینا چاہتا ہے مجھ سے کہ میں نے اس کو کیوں چھوڑا۔"

"صحیح کیا میں نے...... اور چھوڑا تم نے نہیں تھا، میں نے تمہیں ٹھکرایا تھا۔" اس کا لہجہ سرد اور طنزیہ نے ہوتے ہوئے بھی طنزیہ تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ اس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے نظر انداز کرنے پر آنندی اور چیخی۔

"تم اپنے ہی دھرم کے بندے کو ان دو ٹکوں کے مسلوں کے لیے جیل بھجواؤ گے؟...... وہ رذیل لوگ اسی قابل ہیں کہ وہ قتل ہوں، ...... مریں چلیں...... اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ اس کو سزائے موت ہوگی؟ کتنے بدھو ہو...... کل یا پرسوں ہی وہ رہا ہو جائے گا اور دیکھنا اگلی بار جتنے مسلمانوں کی لاشیں وہ گرائے گا۔ میں تمہیں ان کی گنتی کے لیے بلاؤں گی۔" وہ سندر آنندی تحلیل ہوئی...... اس کے سامنے زہر اگلتی ایک شدت پسند ہندو تھی۔

وہ طنزیہ ہنستا ہوا اٹھا۔ "اگر میں لاشیں گرانے والے کو پہلے ہی مار دوں تو...... پتا ہے کیا ہوگا؟ تم ...... سفید ساڑھی پہنو گی۔۔ اِن ایسا ...ہوا ہو جاؤں گی اور ...نہیں کروں گا کیوں کہ وہ اسی مسلمان کے ہاتھوں ...رے گا جو اس قابل ہے کہ وہ مارا جائے اور تمہیں پتا ...کیا کہ تم ہر بار کیوں ہار جاتی تھیں؟ کیونکہ تم ایک ...نت پسند ہندو تھیں، جو ہمیشہ سامنے کھیلتی مسلمان ...لڑکی نفرت میں ایسے غرقاب ہو جاتیں کہ وہ تمہیں ...پرا دیتی تھی...... اور ہاں اگلی بار میرے گھر مت آنا، ...تمہیں قتل کر کے مجھے جیل جانے میں کوئی پچھتاوا ...نہیں ہوگا۔"

آنندی کا چہرہ اہانت سے سرخ ہو چکا تھا۔ وہ ...ٹن ٹن کرکے باہر نکلی تھی۔

☆☆☆

محبت جوالا مکھی

اس کو اب آنندی کے اس کی زندگی سے چلے ...جانے پر خوشی محسوس ہو رہی تھی، وہ کبھی بھی کسی ایسی ...لڑکی سے محبت نہیں کرتا جس میں انسانیت مفقود ہو ...آنندی کی بات سچ نکلی اور دو دن بعد وہ رہا ہو گیا ...اور بعد میں گاؤں میں پراسرار قتل ہوتے رہے ...سب جانتے تھے قاتلوں کو لیکن سب پھر بھی ...خاموش تھے۔

اس کے اگلے روز ایشوریہ تیار صبح سویرے اس ...کے گھر میں موجود تھی۔

"وشال! چندن پورہ میں ہر سال اس مہینے ...بڑا سا میلہ لگتا ہے......"

"تو؟"

"تو تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے دیدی میلوں اور ...ان میں جانے کی۔"

"وشال! میں نے کبھی تم سے کسی چیز کا اصرار ...نہیں کیا، بس اب میں یہ چاہ رہی ہوں کہ ہم دونوں ...پھر تھوڑا سا بچپن کو یاد کریں۔ یاد ہے جب ہم ...میلے میں جایا کرتے تھے اور تم میری گود ...سے نہیں اترتے تھے...... میری کمر دکھ جاتی تھی لیکن ...میں تمہیں اٹھائے پھرتی تھی...... صرف ایک بار

......!! ایشوریہ اس کو جذباتی طور پر انکسار ہی تھی اور وہ اس حربے سے باخوبی واقف تھا۔

"چلو چلتے ہیں......" وہ لمحے بھر کے لیے مسکرایا تھا۔ پھر اندر چلا گیا اور کپڑے بدل کر آیا۔ "چلیں؟"

میلے میں اس کی دلچسپی نہیں تھی، وہ بددلی سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ ایشوریہ چوڑیوں والے اسٹال پر گئی تو اور وہ چبوترے پر کھڑے اس نوجوان کی تقریر سننے لگا، جس کے گرد لوگوں کا ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔

ایسے میں پھر دھینگا مشتی شروع ہوئی، گولیاں چلنا شروع ہوئیں...... لوگ ایک دوسرے کو پیٹنے لگے تھے۔ وہ ایک جگہ جامد ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے لمبے قد کاٹ کا نوجوان، چلتی گولیوں کی آوازوں پر تیز تیز سانسیں لے رہا تھا......

میلے کا منظر محو ہوا اور سامنے امرتسر کا جلیانوالہ باغ بن گیا...... ایک انگریز اپنے سپاہیوں کو فائر کھولنے کا حکم دے رہا تھا اور...... اور...... پھر سامنے اس کو اپنا آپ نظر آیا...... سات سال کا وشال جو نیچے گرا ہوا تھا اور اسی عکس پر معاً کسی لڑکی کا عکس قابض ہوا۔ سیاہ برقع میں گری لڑکی، جو سات سالہ وشال کی طرح جامد بیٹھی ہوئی تھی۔ پیچھے سے کسی نے پتھر پھینکا تھا اور وہ بنا سوچے سمجھے، اس کی جانب بھاگا تھا......

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں گہری تھیں اور قدرت نے ان خوب صورت آنکھوں کو بینائی کی نعمت سے محروم رکھا تھا...... وہ اپنی بہن کا ہاتھ پکڑے جا رہی تھی۔

"وشال...... وشال!" ایشوریہ تفکر سے اس کو پکار رہی تھی۔ وہ مڑا تھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں......"

میلے کا منظر آن کی آن میں تبدیل ہو گیا تھا۔ لوگوں کو گرفتار کیا گیا، جس میں کئی ہندوؤں کی فوراً رہائی بھی ہو گئی تھی۔ یہاں کا قانون انگریزوں اور اس کے تلوے چاٹنے والے ہندوؤں کے لیے نہیں تھا...... یہ تو سب ہی کو پتا تھا۔

رات بھر ان دو آنکھوں نے اس کو جگائے رکھا

اس کی آواز کتنی نرم تھی، وہ بار بار سوچ رہا تھا۔ اور عجب یہ تھا کہ ہر بار سوچنے پر اس کا دل عجیب طریقے سے دھڑکنا شروع ہو جاتا...... اس کو نہیں سوچنا چاہیے، یہ سوچتے ہوئے اس کو پھر سے وہ یاد آ جاتی......

کئی دنوں تک وہ اس کے دماغ پر حاوی رہی...... اس کی روتی ہوئی گہری آنکھیں اور پرانا کرتا...... اور اس کی نرم سی بھرائی ہوئی آواز......

☆☆☆

تین جون منصوبہ کامیاب ہوا...... اور بلا آخر برصغیر دو ملکوں میں بٹ گیا...... اس رات جب چھپانیر اور چندن پورہ خون سے لت پت اور جل رہا تھا، وہ دو دن پہلے شہر گیا تھا اور گاؤں لوٹ رہا تھا۔ ٹرین کی پٹڑی لاشوں سے بھری ہوئی تھی...... لیکن اس بار سکھ نہیں تھے...... سارے مسلمان تھے...... صرف و صرف مسلمان......

وہ لاشیں پھلانگتا کھیتوں میں جانے والا تھا، جب اس نے وہ کرتے والا ہاتھ دیکھا۔ وہ بھاگا اور تیزی سے لاشیں ہٹانے لگا۔ جب وہ ہٹا چکا، تو اس نے دیکھا کہ وہی لڑکی تھی...... اور ابھی بھی اس کی آنکھیں روتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ اس کو ہمیشہ، اس کے ساتھ ہوئے بھیانک حادثوں کے روپ میں کیوں ملتی ہے؟ کیا یہ اتفاق ہے...... یا...... ان کی قسمت......؟

شاید اتفاق...... یقیناً قسمت......

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ اس سے وہی سوال پوچھ رہا تھا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔

"نہیں...... نہیں......" اب کی بار وہ رو دی تھی۔ اس کا سفید کیس والا دوپٹا اب سفید نہیں رہا تھا بلکہ وہ سرخ تھا...... گاڑھے خون سے اٹا......

سامنے اس کو گھڑ سوار دکھائی دیا اور دور سے اس کی چمکتی ہوئی تلوار بھی...... وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ سامنے کسی کی بندوق گری تھی، وہ فوراً جھکا اور بندوق اٹھائی...... ہوا کے دوش پر گولی کی چلنے کی آواز آئی اور گھوڑا ہنہنایا...... اس سے پہلے کہ اس پر حملہ ہو جائے، وہ دانین کو سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھا کر اپنی کوٹھی کی طرف بھاگنے لگا۔

وہ جیسے ہی گلی میں پہنچا، اس سے پہلے اس نے ویر داس کو دیکھا اور گھوڑے کی رفتار بڑھائی۔ ویر داس اس کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھا، اس نے شاید پہچانا نہیں تھا...... قسمت اچھی تھی اور کوٹھی کے آس پاس گلی میں کوئی نہیں تھا، وہ گھوڑے سے اترے اور گھوڑے کو کھلا چھوڑ کر اندر گئے۔ جیسے ہی وہ اندر گئے، اس نے جلدی سے چٹخنی چڑھائی۔ دانین ابھی تک صدمے میں تھی۔ وشال نے اس کو پانی پلایا اور اس کو پہننے کے لیے اپنے کپڑے دیے......

"بھوک لگی ہے؟" وہ نرمی سے اس سے پوچھ رہا تھا...... وہ ابھی تک ہچکیوں سمیت رو رہی تھی۔

"نہیں۔" یہ کہہ کر وہ چارپائی پر لیٹی۔ وہ اس کو کچھ دیر کے لیے دیکھتا رہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں صحیح سلامت پاکستان بھیج دوں گا۔" وشال کی آواز پہلی بار سپاٹ نہیں تھی۔ اس کو خود بھی حیرت ہوئی۔

"آپ بنا کسی مطلب کے یہ کیوں کریں گے؟" پہلی بار اس نے ایک پورا جملہ بولا وہ بھی ایسا کہ اس کو لاجواب کر گیا۔

"پتا نہیں۔" اس کے پاس واقعی میں جواب نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر باہر نکلا۔

وہ چت لیٹی رہی......

ہجرت کے زخم واقعی روح چھلنی کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

لاہور۔ پاکستان

صبح کی پہلی کرن نے نوزائیدہ ملک کی دھرتی کو چھوا اور کئی لوگ اس مٹی پر اللہ کے سامنے سربسجود تھے۔ مہاجرین کیمپ کے اندر چاچی نجمہ کے گلے لگ روئے جا رہی تھیں۔ افنان بی بی سے ان کو واقعی بہنوں والی محبت تھی۔

سہ پہر کے وقت ہاشم اور سرور نے ان لوگوں کو ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ سرور کی آنکھیں سب کو ڈھونڈ رہی تھیں اور اس کے سامنے صرف نجمہ، چاچی اور ان کے علاوہ والدین تھے۔

"اماں...... ابا؟ بڑے ابا...... چاچا...... اور دانین......؟" وہ متوحش ہو کر نجمہ سے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ پتا نہیں سرور......" نجمہ کا لہجہ زخمی تھا۔

"کیا مطلب کچھ پتا نہیں...... وہ لوگ نہیں......؟" سرور حلق کے بل چلائی تھی، اس کی آواز زخمی تھی لیکن لرز بھی رہی تھی۔

"سرور! کچھ نہیں ہوگا ان سب کو، حوصلہ رکھو، دعا کرو۔" ہاشم نے اسے کندھے سے پکڑ کر کہا۔

"دانین کا کیا...... اس کو تو دکھائی بھی نہیں دیتا وہ کیسے بھاگی ہوگی ان درندوں سے؟" اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی......

☆☆☆

اس کو یہاں وشال کے گھر تین دن ہونے کو آئے تھے، ان کے بیچ خاص باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اس کو کھانا دیتا تھا۔ دو دن اس نے نماز نہیں پڑھی تھی...... دو دنوں تک وہ خون سے اٹی رہی۔ اس نے وشال کے کپڑے پہنے تھے۔

"مجھے نہانے کے لیے صاف پانی اور ایک جائے نماز چاہیے۔" جب وہ اس کے سامنے کھانا رکھ رہا تھا تو اس نے کہا۔

وشال نے محض "اچھا" کہا اور جب وہ کھانا کھا چکی تو اس نے ہینڈ پمپ کی چلنے کی آواز سنی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"پانی رکھ دیا ہے...... آپ نہا لیجیے میں گھر سے باہر جا رہا ہوں گا۔"

اس نے سوچا کہ وہ اس سے کہہ دے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ خاموش رہی۔ اس نے غسل کیا اور باہر نکل آئی۔ وہ واقعی میں باہر جا چکا تھا۔ باہر سے آنے کے بعد وہ جائے نماز لے آیا۔

وہ دو دنوں بعد اللہ کے سامنے سربسجود تھی، سجدے میں وہ روتی رہی تھی...... اس کا سجدہ کافی لمبا ہو گیا تھا۔ اس نے رو رو کر اللہ سے سب کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ نماز پڑھ کر وہ اندر چلی گئی۔ وشال اندر کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

"میں آپ سے ایک بار پھر سے پوچھ رہی ہوں...... آپ میری مدد کیوں کر رہے ہیں؟" وہ چوکھٹ میں کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی۔

وشال نے پلٹ کر اس کو دیکھا۔ "مجھے خود نہیں معلوم کہ میں آپ کی مدد کیوں کر رہا ہوں......"

"ہمدردی کی وجہ سے...... انسانیت کی وجہ سے......؟"

"نہیں...... کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگلے ہفتے یہاں سے ایک ملٹری کانوائے گزرے گا رات کو...... ہم رات کو چلے جائیں گے۔" اس کو بات بدلنے کا ہنر آتا تھا۔

اس سے ملاقات کے لیے ہر وقت سوچتے رہنے والا، اب اس کے چہرے کو بھی نہیں دیکھ پا رہا تھا...... حالانکہ اس کو پتا تھا کہ وہ نہیں دیکھ پاتی تھی کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے یا کسی اور کو......

وہ بنا کچھ کہے پلٹی...... یہ اجنبی شخص، جس کا نام تک اس کو معلوم نہیں تھا، واقعی میں انسان ہے، وہ سوچ رہی تھی۔

رات کو وہ اندر کمرے میں سو جاتی تھی اور وہ باہر پہرا دینے کے لیے دیر تک جاگتا رہتا تھا۔ اس کو خوف تھا کہ شاید کسی کو معلوم ہو جائے تو اس کو محتاط رہنا چاہیے۔

وہ صبح اٹھتی اور نماز پڑھتی، حالانکہ اب چھپانیر میں اذانیں نہیں ہوتی تھیں...... لیکن اتنے عرصے سے اس کو بنا اذان کے بغیر ٹھیک وقت پر اٹھنے کی عادت تھی۔

اس دن اس کی آنکھ دیر سے کھلی، گھر میں کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں...... وہ فوراً اٹھا اور اندر

کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا، لیکن وہ ایشوریہ تھی۔ اس کی سانسیں بحال ہوئیں۔ ایشوریہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"تم نے اس کو اپنے کپڑے کیوں دیے ہیں؟"

"میرے پاس دینے کو یہی تھے۔" اس کا جواب تھوڑا کھسیانا تھا۔

"چلو میں لے آتی ہوں...... دروازہ بند رکھا کرو۔" ایشوریہ یہ کہہ کر اٹھی۔ باہر جا کر وہ تحمل سے اس کو سمجھا رہی تھی...... "جتنی جلدی ہو سکے اس کو پاکستان حفاظت سے بھیج دو، ورنہ ابھیشیک اور اس کے شیطان دوستوں کو بھنک بھی پڑی تو یہ لڑکی تو ماری جائے گی ہی تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔"

ایشوریہ کے الفاظ سخت لیکن لہجہ نرم تھا۔

☆☆☆

وشال باہر صحن میں لیٹا ہوا تھا۔ دانین کو یہاں پناہ لیتے ہوئے ہفتہ ہوا تھا۔ دونوں کو ہی ایک دوسرے کے نام نہیں پتا تھے۔ ان کے بیچ باتیں بھی نہیں ہوتی تھیں...... اس دن وہ نماز پڑھ رہی تھی تو اس کے چہرے پر اس کی نظر پڑی اور نظریں ہٹانا بھول گیا وہ...... پھر وہ ہڑبڑا کر پلٹا۔ وہ اس کی عبادت خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ باہر صحن میں بیٹھ گیا۔

ابھی لیٹا وہ اوپر آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان کے سیاہ دامن پر تارے بکھرے ہوئے تھے اور ان کے بیچ آج بھی چاند جاگتا ہوا نیچے جھانک رہا تھا...... ہلکی ہلکی ہوائیں چلنے لگیں اور دفعتاً جاگتا چاند اپنے سامنے آتے بادلوں کو دیکھ کر ہڑبڑایا۔

معاً اندر کمرے سے ایک نہایت نرم آواز نکلی اور اس کے سن کر رونگٹے کھڑے ہو گئے......

ترجمہ

"وہ نہایت مہربان ہے۔ اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اسی نے اس کو بولنا سکھایا۔"

وہ ایک جذب میں سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کر رہی تھی۔ یہ پہلی بار وہ تلاوت قرآن کر رہی تھی اور وہ بھی بلند آواز میں...... دانین کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔ اور بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔ اور اسی نے آسمان کو بلند کیا اور میزان عدل قائم کی کہ اس میزان میں حد سے تجاوز نہ کرو۔"

چاند نے بادلوں کا نقاب ہٹایا اور ہواؤں میں تیزی آئی۔ گھر میں اکلوتے تا چنار کے درخت کے پتے سرسرانے لگے...... وہ اس کی آواز سن رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ساری زندگی چل رہی تھی۔ امرتسر کی وہ بڑی سی کوٹھی...... اس کا مدم کے ساتھ کھیلنا...... ایشوریہ کی شادی...... باپو کا ماں کو مارتے رہنا...... جلیانوالہ باغ سانحہ...... چونتیس سالہ، لمبے قد کاٹ یہ مرد رونے لگا...... اور منہ پر مٹھی بنا کر گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔

"تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

وہ روتے ہوئے تلاوت کر رہی تھی۔ ہجرت ایک بڑی قربانی ہے۔ وہ اس ہجرت میں جتنی تکالیف سے گزری، اتنا ہی اس کو اچھے اچھے لوگ ملتے رہے...... پہلے اماں بی...... اب یہ، جس کا نام تک اس کو معلوم نہیں ہے...... بس اتنا پتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ اس کے مذہب تک کا اس کو نہیں پتا تھا۔

"اسی انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔ اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا تو تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ وہی دونوں مشرقوں اور مغربوں کا ملک ہے۔ تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

وہ تلاوت کرتی رہی اور وہ روتے ہوئے سنتا رہا...... زندگی میں کبھی اس نے اپنے دل کو اتنا پگھلتے ہوئے محسوس نہیں کیا تھا۔

جب وہ ساری سورہ رحمٰن پڑھ چکی تو باہر نکلی اور برآمدے میں رکھی کرسی کو ہاتھ سے ڈھونڈتے ہوئے

...... اس کو معلوم تھا کہ وہ نیچے بیٹھا ہوگا۔

...... "کل وہ کانوائے جائے گا نا؟"

اس کے اچانک سوال پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

رات کو......

...... "جاتے وقت میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں"

...... وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

وشال کچھ دیر خاموش رہا۔ "وشال۔"

...... اس نے وشال کے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیا۔ "دانین۔"

"اس کا مطلب؟"

"یہ ایک عربی نام ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ شہزادی...... راج کماری......!!"

وشال مسکرایا تھا۔ کرسی پر بیٹھی، سفید کپڑوں میں ملبوس، وہ واقعی میں راجکماری لگ رہی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا...... بہت زور سے...... اس نے فوراً نظریں چرا لیں۔

...... وہ کل جا رہی ہے...... اور یہ محبت نہیں ہے اس نے سوچا تھا، اس کا دل پھر زور سے دھڑکا تھا

پہلی بات سچ تھی...... دوسری بات سراسر جھوٹ۔

☆☆☆

دوسرا دن ابر آلود تھا لیکن پھر بعد میں آسمان صاف ہو گیا۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر تیار بیٹھی تھی۔ وشال باہر تھا اور اس نے اندر سے دروازہ بند کیا ہوا تھا۔

پھر وشال آ گیا۔ "چلیں؟"

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ آج اس نے کالا کوٹ پہنا تھا۔ سیاہ لباس میں اس کا پرنور چہرہ ...... تھا...... آج بھی وہ اضطراب میں انگلیاں ...... رہی تھی...... وہ وشال کے قریب آئی۔ اس کی آنکھیں وشال کی طرف اٹھیں اور وہ چہرے کی ...... محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے...... دانین نے سر جھکایا۔

"آپ کا شکریہ......!"

جان بچانے والے کے لیے شکریہ کتنا چھوٹا لفظ ہے، اس کو معلوم تھا لیکن اس کے پاس کہنے کو اور الفاظ ہی نہیں تھے۔

"چلیں......؟"

اب وہ گلی میں چل رہے تھے، رات کے اندھیرے میں گلی سنسان پڑی تھی۔ دانین نے اس کے کوٹ کا کونا پکڑا تھا اور اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ اب وہ دونوں پگڈنڈی پر چل رہے تھے، سڑک کے قریب تھے۔ جب وہ سڑک کے قریب پہنچے...... تو سڑک سنسان تھی۔ اس کو یہ خاموشی عجیب لگ رہی تھی...... جھوٹی اور مکاری...... وہ دونوں ایک درخت کے پیچھے کھڑے تھے۔ دونوں کے بیچ پھر سے خاموشی آن ٹھہری تھی۔

"محبت کتنی ظالم ہے...... پاس ہوتی ہے تو خاموش کروا دیتی ہے اور جب دور ہوتی ہے تو ہر سو شور مچاتی رہتی ہے...... کتنی دوغلی ہے یہ محبت......"

وشال کا دل دھڑک رہا تھا۔ ایسے میں اس کو دور سے گاڑیوں کے ہیڈ لائٹس دکھائی دیے۔ دونوں نے گہری سانسیں لیں۔ الوداعی لمحات تھے۔

مکار خاموشی میں دفعتاً شیطانی چیخیں بلند ہوئیں۔ وشال نے دیکھا سامنے سے آتی ملٹری کانوائے پر ہندوؤں نے حملہ کر دیا۔ یہ گاڑیاں ان لوگوں سے بھری ہوئی تھیں جو ٹرین سے رہ گئے تھے، اپنے خاندانوں سے بچھڑ گئے تھے۔ گولیوں کی آوازیں اور ان آوازوں پر حاوی ہوتیں انسانی چیخیں......

وہ دو قدم پیچھے ہٹا، دانین نے اس کا کوٹ پکڑا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ پاکستان جانے کی آخری امید بھی ختم ہو چکی...... گاڑیاں ابھی تک وہی کھڑی تھیں۔ شاید وہ فوجیوں سمیت سبھی کو قتل کر چکے تھے۔ اب وہ لوگ اسی راستے کی طرف بڑھ رہے تھے، جس راستے پر وہ جا رہے تھے۔ وشال نے مڑ کر دیکھا ان کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا......

"ہمیں بھاگنا چاہیے۔" اس نے پہلی بار دانین کا ہاتھ پکڑا اور بھاگنے لگا۔

☆☆☆

لاہور کے مہاجرین کیمپوں میں لوگ ابھی تک آتے جا رہے تھے۔ جب بھی ان لوگوں کو خبر آتی کہ نئے مہاجرین آئے ہیں۔ سرور اور نجمہ فوراً آن پہنچتی تھیں۔ سرور ہر بار خالی ہاتھ آنے پر گھر میں گھنٹوں روتی رہتی تھی......

اس دن بھی نئے مہاجرین لٹے پٹے آئے تھے۔ وہ فوراً بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔ "دانین ضرور آئے گی، مجھے یقین ہے۔" وہ جب واپس لوٹ رہی تھی تو اس نے نجمہ سے کہا تھا۔ نجمہ نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

اماں کو انہوں نے پاکستان میں دفن کر دیا تھا۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد، زین چاچا اور ابا کی لاشیں بھی آئیں۔ وہ دن قیامت کی طرح لمبا تھا۔

بمبئی سے عظیم چاچا کے خطوط آتے تھے، وہ پاکستان آنا نہیں چاہ رہے تھے۔ سارا خاندان بکھر گیا تھا۔ ان سب کو دانین کے زندہ ہونے کا پورا یقین تھا۔ مستجاب ہاشم کے سرونٹ کوارٹر میں رہ رہا تھا۔ اس کے گھر میں صرف وہی زندہ پاکستان لوٹا تھا۔ نجمہ اس کو کھانا دینے جا رہی تھی۔

"مبارک ہو...... ہاشم بھائی بتا رہے تھے کہ آپ کو نوکری مل گئی۔" کھانا رکھتے ہوئے مستجاب سے کہا

وہ پشت کیے بیٹھا تھا۔ نجمہ نے دیکھا کہ وہ رو رہا تھا...... اس کے ہاتھ میں بانو کی تصویر تھی۔

مستجاب نے مڑ کر دیکھا۔ "میں اس کو ڈھونڈنے کیمپوں میں مارا مارا پھر رہا تھا...... مجھے کیا پتا تھا کہ یہ مجھے لاشوں میں ملے گی۔"

منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی، اس کے ہاتھ میں پکڑی تصویر میں معاً دانین کا چہرہ بنا اور وہ صدمے سے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

گھر آ کر اس نے فوراً چٹخنی چڑھائی۔ دونوں کے سانس پھولے ہوئے تھے۔ دانین اس کا ہاتھ چھوڑ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

"میں یہیں مروں گی۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔ کمرے میں جا کر اس نے دروازہ بند کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی...... کیسا امتحان تھا جو ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ اچھا ہو ہی نہیں رہا تھا۔ جب جب کچھ ٹھیک ہونے جاتا تھا...... کچھ ایسا ہو ہی جاتا تھا جس کے صدمے سے کوئی دنوں تک نہیں نکل پاتی تھی۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کھانا کھائیں گی آپ؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے کہا اور پھر سارے گھر میں خاموشی چھا گئی۔

پھر وقت گزرتا گیا اور وہ نئی ترکیبیں سوچتا تھا۔ لیکن ہر راستے پر کوئی بھیڑیا تھا جو انسانی ماس کھانے کے لیے رال ٹپکا تا رہتا تھا۔

ایسے میں تین مہینے گزر گئے، ایشوریہ مدھو کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئی انہوں نے یہاں کوٹھی بیچ دی تھی۔ ماما کو فالج ہوا اور اب ابھیشیک اور آنندی ان کے ساتھ رہتے تھے...... ان تین مہینوں میں ان کے درمیان اتنی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ بس کھانے اور کپڑوں کی حد تک...... دانین کو کھانا بنانا نہیں آتا تھا۔ ایک دن وہ دیر سے گھر آیا تھا تو وہ رسوئی میں اپنے لیے کھانا بنا رہی تھی۔ اس نے رسوئی کے چوکھٹ میں کھڑے ہو کر دیکھا تو ساری روٹی اس نے جلائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ دفعتاً پیاز کاٹتے ہوئے اس نے خود کو زخمی کیا۔ وہ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر زخم دیکھنے لگا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" یہ اتنی جلدی میں ہوا کہ دانین اور وہ دونوں حیران ہو گئے......

وہ کھسیانا ہو کر ہٹا۔ "میں پٹی لے کر آتا ہوں۔" جب اس نے پٹی کروا دی تھی تو وہ گویا ہوا۔ "میں نئی روٹی بنا کر دیتا ہوں...... یہ ساری روٹی آپ نے جلا دی ہے۔"

اس کی بات پر وہ شرمندہ سی مسکرائی۔ "میں نے کبھی گھر کا کام نہیں کیا...... سارا کام اماں، نجمہ اور سرور کرتی تھیں...... اور ہاں چاچی بھی......"

وہ دیکھ رہا تھا کہ گھر والوں کے ذکر پر اس کی آنکھیں نم ہوئیں اور چہرے پر اداسی بھی چھائی۔

"آپ جلد ان کے ہاتھ کی بنی روٹی کھائیں گی۔" اس نے مسکرا کر دلاسا دیا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"مجھے نہیں لگتا۔" ناامیدی نے اس کے چہرے پر قبضہ کیا ہوا تھا، لیکن وشال ناامید نہیں تھا۔

جاتے ماگھ کے کہر زدہ دن تھے، گھر میں کھڑے واحد چنار کے درخت سے آخری پتا گرا۔ وشال نے اٹھ کر وہ پتا اٹھایا اور جانے اس کو کیا سوجھی کہ اس نے وہ پتا دانین کو دے دیا۔

"یہ کافی مزاحیہ بات ہے لیکن خیر...... خزاں کا یہ آخری پتا ہے اور وہ بھی چنار کا......" اس کے لہجے میں دبی دبی سی ہنسی تھی۔

وہ اب اس کے ساتھ بات کر لیا کرتی تھی، لیکن زیادہ بات چیت ان کے درمیان پھر بھی نہیں تھی۔

"آپ کو درختوں کی زبان آتی ہے؟" ہاتھ میں سوکھا پتا لیے وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"درختوں کی زبان ہوتی ہے؟" وہ الٹا اس سے استفسار کرنے لگا۔

"ہاں...... جیسے پھولوں کی ہوتی ہے......"

"پھولوں کی بھی ہوتی ہے؟" وہ حیران ہوا، یا شاید اداکاری کی تھی۔

"ہاں...... جیسے نرگس کا پھول معصومیت کی تشبیہ ہے۔" اس گھر میں نرگس کے پھول تھے، اس لیے اس کو یہی مثال یاد آئی تھی۔

"اور...... چنار کس چیز کی تشبیہ ہے۔" اب اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا، شاید وہ اس کے چنار کا پتا دینے کے پیچھے راز کو سمجھ چکی تھی۔

"نہیں...... مجھے صرف پھولوں کی زبان آتی ہیں۔" اس کا لہجہ معصومیت بھری مایوسی سے اٹا ہوا تھا۔

اس نے گہری سانس لی۔ "چنار کا پتا، حفاظت سے اپنے وطن جانے والے مہاجروں کے لیے تشبیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔"

ہاتھ میں نیم سوکھا چنار کا پتا پکڑے وہ مسکرائی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتے ہوئے اس کا دل دھڑکا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی، اس کو ایسا لگتا تھا کہ دانین اس کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے اور اس کے گھر میں کھڑی یہ کھلا کھم حقیقت کب اپنی دردناک یادیں چھوڑ جائے اس کو معلوم نہیں...... لیکن یہ ضرور معلوم تھا کہ وہ کسی طور اس کو یہاں نہیں روکے گا وہ ہر حال میں پاکستان بھیجے گا...... خواہ اس کی قیمت اس کی اپنی جان ہی کیوں نا ہو، یا کسی اور کی......

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" سر جھکائے دانین اس سے کہہ رہی تھی۔

"یہ احسان نہیں ہے۔" اس نے دکھ سے کہا، محبت میں احسان نہیں کیے جاتے، بلکہ خود پر احسان کیا جاتا ہے۔ اس کی بات پر وہ پھر سے مسکرائی تھی۔

آج کل دانین اتنا کیوں مسکرا رہی تھی؟ اس کا دل دھڑک جاتا تھا...... وہ باہر نکلا اور دانین نے اندر سے دروازہ بند کیا۔

اگلے ہی روز جب وہ بازار سے ضروری سامان خریدنے جا رہا تھا تو گلی کے نکڑ میں اس نے ابھیشیک کو دیکھا، اس کے چہرے پر اس کو دیکھتے ہوئے ایک مکروہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا لیکن اب کافی عرصے سے وہ دروازہ بند کیے رکھتا تھا۔ اور یہی بات ابھیشیک کے ساتھ کھڑے امریک سنگھ کو بڑی تنگ کر رہی تھی۔ جب وشال جا چکا تو وہ چاروں اس کے گھر کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دروازہ اندر سے بند تھا، باہر سے نہیں......

رہی تھی۔ باہر عین دروازے میں کھڑے مردوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور یہ دستک اجنبی تھی، وہ جانتی تھی۔

ڈر کے مارے اس کے ہاتھ سے گلاس پھسلا اور باہر کھڑے ابھیشک نے شیطانی مسکراہٹ چہرے پر سجائے امریک سنگھ کو دیکھ کر کہا۔

"اندر واقعی کچھ ہے...... پر اسرار......" پر اسرار کہتے ہوئی اس نے سرگوشیانہ انداز اپنایا۔ اس کے انداز پر باقی تینوں ہنسے تھے۔

☆☆☆

ان تین مہینوں میں انھوں نے بالکل امید نہیں چھوڑی تھی۔ سرور ابھی تک مہاجرین کیمپوں میں جاتی تھی اور دانین کو تلاشتی تھی۔

اس دن سرور ڈاکٹر سے ہو کر آئی تھی۔ اس کا تیسرا مہینہ چل رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر فاطمہ ہاشمی کا کہنا تھا کہ اس کو زیادہ ذہنی دباؤ نہیں ملے، ورنہ بچے پر اس کا برا اثر ہو گا۔ لیکن اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ ابھی تک اماں ابا اور دانین کے صدمے سے نکل نہیں پائی تھی۔

جب وہ باورچی خانے میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی، تو اس کو ہاشم کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر نکلی۔

"آپ آج جلدی آئے...... خیریت؟"

ہاشم کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا۔

"دیکھو، میں ایک اچھی خبر لایا ہو۔ دونوں ممالک کے بیچ معاہدہ ہوا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق جو عورتیں ہجرت کے وقت اغوا ہوئی ہیں، ان کو حفاظت سے اپنے وطن بھیج دیا جائے گا۔ ہندو، سکھ عورتوں کو بھارت اور مسلمان عورتوں کو پاکستان......" ہاشم جوش سے بتا رہا تھا۔

وہ جلدی سے اندر گئی اور پیٹی سے دانین کی تصویر نکالی۔ وہ رو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں تھانے میں تھے اور ...... ڈرتے رہے تھے۔

☆☆☆

بازار میں گہما گہمی اتنی نہیں تھی۔

وہ ضروری اشیا خریدنے بازار آیا تھا، ان تین مہینوں میں وہ بہت دفعہ آیا تھا۔ وہاں ایک نحیف سا بوڑھا بیٹھا، سگریٹ کے کش لگاتا ہوا ریڈیو سن رہا تھا۔ جس پر بولنے والا، نئے معاہدہ کے بارے میں معلومات دے رہا تھا کہ یہ مشن لوکل پولیس کے حوالے ہے۔ دکان دار اس کو کوئی چیز دے رہا تھا کہ لیکن وہ پلٹا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔

تھانے پہنچ کر وہ دانین کے بارے میں بتانے لگا۔ انسپکٹر کے چہرے پر بے زاری تھی جیسے ہی اس کی بات سنی...... ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر رینگ گئی...... سند حاصل کرنے کا صحیح موقع......!!

انسپکٹر، سب انسپکٹر اور چند کانسٹیبل اس کے ساتھ ہو لیے۔ گھر کے قریب پہنچا تو اس نے دروازے پر اپنی مخصوص دستک دی۔ ایک...... دو...... تین...... اندر سے کوئی نہیں آیا، اس کا رنگ اڑنے لگا۔ وہ سرعت سے دیوار پھلانگ کے اندر گیا...... اندر دانین نہیں تھی۔ وہ سارے کمرے دیکھنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا یوں جیسے اب باہر نکل ہی آئے گا...... پھر وشال رکا اور اس کو یاد آیا، کہ گلی کے نکڑ پر اس نے ابھیشیک کو دیکھا تھا...... اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہونے لگا اور باہر کی اور بھاگا۔ باہر بیزاری کھڑی پولیس سے وہ بنا کچھ کہے بھاگنے لگا تھا۔ وہ نا سمجھی میں اس کو یوں بجلی کی رفتار سے بھاگتے ہوئے دیکھے گئے۔

دور...... ان سے دور...... اس سنسان حویلی میں دس مردوں کے بیچ وہ زمین پر گری پڑی تھی۔

"تم اتنے عرصے بمبئی میں کیا کر رہے تھے حرام زادے!" یہ ابھیشیک تھا، ویرداس کو کہہ رہا تھا۔

جس رات وشال اور دانین گھوڑے پر جا رہے تھے، اس نے گلی میں ان دونوں کو دیکھا تھا۔ پہلے وہ رکا، اس نے دیکھا نہیں۔ پھر تجسس کے مارے وہ

پھر دانین کو صحیح طرح دکھا نہیں تھا۔ وہ اس کا پیچھا کرنے لگا کو پھر اس نے دیکھا کہ وہ وشال تھا۔ اگلی صبح وہ بنا کسی کو بتائے بمبئی چلا گیا تھا اور آج اس نے شیطانوں کو بتانا ضروری سمجھا۔

ابھیشک اٹھا اور اس کے سے سر دوپٹا کھینچا اور اپنے گلے میں پہنا۔

"پتا ہے اندھی...... تمہارا یار مجھے کیوں پسند ہے، کیونکہ وہ حرام کی پیداوار مجھ سے ڈرا نہیں تھا۔ اس کو شاید اس بات کا غم تھا یا پھر غصہ کہ میں نے اس کی منگیتر چھین لی تھی۔ اس کم عقل حسینہ میں میری ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں تھی...... خیر"

وہ اب دانین کو اٹھانے لگا۔ کانچ کی بوتل اٹھائی اور اس کو توڑ دیا۔ پھر ایک کانچ لے کر اس کے ہاتھ میں چبھو کر وہ 'گالی' لکھنے لگا۔

درد کے مارے وہ حلق کے بل چلائی گیا تھی۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ ہر دفعہ وشال اس کو بچانے نہیں آئے گا۔ اس کا دل جانے کیوں ہلکا سا ہوا وہ درد سے مبرا ہو گئی۔ ہاتھ زمین پر مارتے ہوئے اس کو بوتل کا ایک بڑا سا کانچ ملا اور اب وہ مسکرائی۔

اس کو کانچ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر ایک بندہ آگے بڑھنے لگا تھا لیکن اس کے قریب آنے سے پہلے ہی اس نے کانچ ابھیشیک کے گلے میں پوری قوت سے گھسا دیا۔

"جہنم میں جاؤ تم!"

خون کی تیز دھار اس کے کپڑوں پر گرنے لگی۔ ابھیشک ہاتھ گلے پر رکھ کر نیچے گرنے لگا۔ اس کی جانب بڑھتے بندوں کے قدم ویرداس کے قہقہے نے روکے تھے۔ وہ تالیاں پیٹتا، قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کانچ لیا اور مسکرایا۔

"بہت بڑھیا!...... کتیا!" ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا...... دانین درد سے مبرا تھی۔

اب وہ وحشیوں کی طرح اس کے کپڑے پھاڑنے ہی والا تھا کہ باہر سے ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر لگا۔ پیچھے دھاڑتا ہوا وشال آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ گلی سے نکلا، وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ دانین کو دور کہیں لے کر گئے ہوں گے۔ کچھ دور چل کر اس کو وہ حویلی دکھی، جو کئی عرصے سے سنسان تھی اور اس کا بڑا سا لکڑی والا دروازہ ادھ کھلا تھا۔

اس نے ویرداس کو مار گرایا اور اس کے اوپر چڑھ کر اس کے منہ پر جنونیت سے لگاتار مکے برسانے لگا...... پیچھے کسی نے اس کے سر پر کچھ دے مارا اور اس کا سر چکرایا...... وہ گر پڑا اب ویرداس اس کے منہ پر مکے برسا رہا تھا۔

وہ روتی ہوئی گڑگڑاتے ہوئے ویرداس کو ہٹانے جا رہی تھی۔ کسی نے اس کو پیچھے سے پکڑا اور پھر سے مار گرایا...... وہ رو رہی تھی اور التجا کر رہی تھی......

اس نے اپنی جان کی التجا نہیں کی تھی، اس کے لیے کر رہی تھی......

وشال کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ ایسے میں پولیس آ گئی۔ اس کے پیچھے کھڑے اس کے چیلے بھاگ گئے تھے اور اب پولیس والے ویرداس پر بندوق تانے ہوئے تھے۔ ویرداس کے چہرے پر مسکراہٹ چھائی...... اس نے پستول نکالی اور پستول کی نالی اس کے منہ میں گھسائی۔

"تمہاری محبت کی کہانی میں ضرور لکھوں گا۔"

اور گولی کی تیز آواز سارے میں چھا گئی...... نیچے گری دانین کو لگا اس کی روح پرواز کر گئی...... یہ گولی کس کو لگی...... یقیناً ویرداس کو...... وہ چلاتے ہوئے ہاتھوں کے بل اس تک گئی اور اس کا ہاتھ اٹھایا۔

"وشال...... وشال......" اس کی روتی آواز اس اونچے مکان کی طرح تھی جو شدید زلزلے کی

زد میں ہو...... وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس کو پکار رہی تھی۔

پہلی بار اس نے وشال کو اس کے نام سے پکارا تھا، لیکن وشال اس کو سن نہیں رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے سرد کیوں ہیں۔؟

پیچھے سے کسی پولیس کانسٹبل نے اس کو اٹھانا چاہا، لیکن وہ شل سی بیٹھی رہی......

جانتے ہو محبت کیا ہے؟

محبت وہ ہے جس میں چاہنے والے کو مر کر بھی معلوم نہیں ہوتا...... محبت وہ ہے...... جو محبوب پر ظاہر کیے ہوئے بھی رہتی ہے اور بنا محبوب پر ظاہر کیے ہوئے بھی......

محبت جوالا مکھی ہے اور کرنے والا وہ پہاڑ جو کئی عرصے سے اس جوالا مکھی کو اپنے سینے میں سنبھالے ہوئے ہوتا ہے اور جب یہ جوالا مکھی پھٹتی ہے تو اسی پہاڑ کو جلا دیتی ہے......

☆☆☆

اس کو پوری حفاظت کے ساتھ لاہور بھیج دیا گیا تھا۔ سارے سفر میں وہ خاموش آنسو بہاتی رہی ......اس نے مرتے دم تک اپنا وعدہ نبھایا......

جس دن وہ آئی سرور، نجمہ، چاچی اور ہاشم بھائی آئے تھے۔ سرور اس کو دیکھ کر چلائی اور بنا اس کو گلے لگائے وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ نجمہ اور چاچی روتے ہوئے آگے بڑھیں اور اس کو دیر تک گلے لگائے رکھا...... سرور آنکھوں پر ہاتھ رکھے روتی جا رہی تھی...... روتی ہی جا رہی تھی......

''میں اس کو نہیں دیکھ سکتی...... اب یہ میرا وہم بن کر غائب ہو جائے گی......'' وہ ہنوز آنکھیں بند کیے روتی رہی۔ دانین مسکراتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب گئی اور اس کو گلے لگایا۔

''سرور! میں نے تم لوگوں کو بہت یاد کیا۔''

''مجھے یقین تھا...... مجھے یقین تھا تم ضرور آؤں گی۔'' دیر تک سرور اس کو گلے لگائے روتی رہی ......گھر آ کر وہ سو گئی تھی۔ اس نے سفر لمبا کیا تھا۔

وہ خاموش اور کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔ سرور نے محسوس کیا تھا۔ اس نے وشال کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا کہ کیسے اس نے اس کو حفاظت سے اپنے گھر میں رکھا...... اس کی مدد کی اور اس کو محفوظ پاکستان پہنچانے کا وعدہ پورا کیا۔

اس کو آئے دو ہفتے ہوئے تھے۔ اس دن بارش زور سے برس رہی تھی...... نجمہ اس کے ساتھ بیٹھی، اس کو بانگ درا سنا رہی تھی۔

''نجمہ! تمہیں درختوں کی زبان آتی ہے؟''

شعر پڑھتے نجمہ نے رک کر، تحیر سے اس کو دیکھا۔ ''ہاں! آتی ہے۔''

''چنار کی تشبیہ کیا ہے۔''

''چنار کا پتا محبت اور وعدے کے لیے تشبیہ کے طور پر مستعمل ہے...... تم کیوں پوچھ رہی ہو۔''

''نہیں ویسے...... مجھے چنار کے پتوں سے نفرت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکلی۔

بارش کی تڑ تڑ جاری تھی...... پھر برستی بارش نے تحیر سے اس لڑکی کو دیکھا، جس کے بہتے آنسو بارش سے مقابلے پر اتر آئے تھے۔

☆☆☆

<u>پیارے ابا!</u>

پیارے بڑے ابا!

یہ میرا آپ کو ایک سو پانچواں خط ہے۔ دیکھیں آپ کی نجمہ کتنی مستقل مزاج ہے۔ جتنی مستقل مزاجی سے میں آپ کو اخبار پڑھ کر سناتی تھی، اتنی ہی مستقل مزاجی میں خط بھی لکھ رہی ہوں۔ خیر آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے جواب چاہیے بھی نہیں ابا...... لیکن میں آپ کو خط لکھتی رہوں گی۔

دانین کو آئے دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ اس کا چہرہ آج بھی ویسے ہی خوب صورت ہے لیکن پتا ہے ابا ......اس کا چہرہ اتنا اداس ہوتا ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے بندے کا دل پسیج جاتا ہے۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے اب۔

وہ کہتی ہے کہ اس کو چنار کے پتے نہیں پسند

لیکن اس دن وہ علینہ کے بیٹے کو کہہ رہی تھی کہ ......اپنے گھر جا کر کوئی پتا ڈھونڈ کر دیں۔

اس کے لیے ہاشم کے چچا زاد کا رشتہ آیا ہے سرور نے ہاں کر دی ہے۔ کیونکہ اس کو لگتا ہے کہ سلجوق اس کو اپنی محبت سے بدل دے گا۔

آپ کو تو پتا ہے نا، وہ محبت وغیرہ پر کتنا یقین رکھتی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس بے صبر سرور کا یقین بہت پختہ ہوتا ہے۔

میری شادی ہونے والی ہے مستجاب سے...... مستجاب ایک اچھا لڑکا ہے، اچھی خاصی سرکاری نوکری ہے اور اس نے اپنا چھوٹا سا گھر بھی خریدا ہے مجھے اس کی خود مختاری سب زیادہ پسند ہے......، کاش آپ یہاں ہوتے، میری کتنی خواہش تھی کہ بیاہ ہوتے سے آپ میرے سر پر قرآن رکھتے۔

علاؤالدین چار ماہ کا ہو چکا ہے، اگلے دو ماہ بعد شاید بیٹھنے بھی لگ جائے۔ یہ نام اماں نے آپ کی محبت میں رکھا تھا ابا!

آپ نے کہا تھا کہ پاکستان کے بارے میں آپ کو لکھتی رہوں...... وہ پاکستان، جس کی قیمت ہم نے بہت بھاری چکائی ہے۔ خیر یہ ملک تو ابھی نوزائیدہ ہے ......ریڈکلف کی ناانصافیوں کے بارے میں، میں آپ کو تفصیلاً لکھ چکی ہوں۔ انتظامی مشکلات بھی کافی زیادہ ہیں۔ دفتروں میں اسٹیشنریاں تک نہیں ہیں۔ اور مزے کی بات، ٹائپ رائٹرز تک وہ اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔ مہاجرین کے مسائل بڑے ہیں۔ ابھی تک کیمپوں میں بے گھر مہاجرین کہیں آباد ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

بڑے ابا اور بھی بہت سے مسائل ہیں جس سے یہ نوزائیدہ ملک دوچار ہے۔ دعا کرتی ہوں کہ اتنے سارے لوگوں کے خون کی قیمت، جو ہم نے چکائی ہے ......وہ رائیگاں نہ جائے اور یہ ملک پھلتا پھولتا رہے۔

آپ کی پیاری

نجمہ!''

☆☆

روبینہ شاہین

روشن اجلا دن رات کی سیاہی میں ڈھلنے لگا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ حشمت بیگم کی فکر اور اندیشوں میں اضافہ ہو رہا تھا، ان کی نظریں گھر کے بیرونی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

"بہت دیر ہوگئی ہے ہوسکتا ہے بس دیر سے ملی ہو، ممکن ہے ٹریفک زیادہ ہو آج کل اغوا اور نا معلوم کیسے کیسے واقعات ہو رہے ہیں۔ یا اللہ، میری بچی کی حفاظت کرنا۔" حشمت بیگم نے اپنے رب کے حضور التجا کی۔

"امی! آپ کھانا کھالیں پھر دوائیاں بھی لینا ہے آپ کو۔" صباحت نے کھانا لگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں تم کھانا کھالو۔"

"آپ ونیزہ کی فکر میں کھانا نہیں کھا رہی ہیں۔ اگر اسے آپ کی فکر ہوتی تو ہمیشہ اپنی ضد اور من مانی نہ کرتی۔ پہلے ماسٹرز کرنے کی ضد کی اور اب ملازمت بھی کرلی۔

"تم خاموش ہوجاؤ، میں بہت پریشان ہوں، نا معلوم وہ کسی مشکل میں ہوگی۔" حشمت بیگم نے صباحت کو جھڑک دیا۔

"آ گئیں آپ کی لاڈلی!" ونیزہ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر صباحت نے طنز کیا۔

"تمہیں دیر کیوں ہوگئی؟ کہاں تھیں تم؟" حشمت جہاں نے غصہ سے پوچھا۔

"پھوپھو! وہ نور آنٹی کے ساتھ تھی۔" ونیزہ نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ پھوپھو نور آنٹی کو پسند نہیں کرتیں۔

کہاں لے گئی تھی وہ تمہیں! مجھے معلوم ہے اس کا تو کام یہی ہے شریف گھروں کی لڑکیوں کو ورغلانا اور انہیں غلط راستہ دکھانا۔" حشمت جہاں کا غصہ عروج پر تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے، آپ میری بات تو سنیں۔ میں آفس سے آرہی تھی جس بس میں، میں سفر کر رہی تھی اس میں نور آنٹی بھی تھیں ان کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی اور میں انہیں اسپتال لے گئی تھی ابھی بھی وہ اسپتال میں ہیں، مجھے ان کے پاس فوراً جانا ہے ان کی دیکھ بھال کے لیے۔" ونیزہ نے نرمی اور تحمل سے انہیں بتایا۔

"مجھے تم میرے مرحوم بھائی کے سامنے آخرت میں شرمسار کرواؤ گی، کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو لوگ مجھے الزام دیں گے۔ نور افروز ایک بدنام عورت ہے اس کا ماضی ایک بدنما داغ ہے لیکن تم اس کی ہمدردی میں پاگل ہوچکی ہو۔" حشمت جہاں کسی طور ماننے کو تیار نہیں تھیں۔

"مجھے معلوم ہے یہ سب باتیں آپ کو وجیہہ بیگم اور ان کا بیٹا سکندر علی بتاتا ہے۔ آپ نے معلوم کیا ان سے کہ سکندر اس بازار میں کیا کرنے جاتا ہے جہاں سے وہ نور آنٹی کا تعلق بیان کرتے ہیں۔" ونیزہ نے طنزیہ لہجے میں ان سے سوال کیا۔

"تم بہت بدلحاظ اور بدزبان ہوگئی ہو، یہ سب اس نور افروز کی صحبت کا اثر ہے۔ سکندر نے تو ہمیں اس عورت کا ماضی بتا کر ہمیں خبردار کیا تاکہ ہم اس سے دور رہیں۔ ویسے بھی وہ اگر اس بازار میں جاتا بھی ہے تو کیا حرج ہے، وہ مرد ہے۔ عورت کے ساتھ اس بازار کا نام آجائے تو بدنامی موت کی آغوش تک ساتھ جاتی ہے۔"

"یہ بحث کسی اور وقت کرلیں گے مجھے کھانا کھا کر اسپتال جانا ہے۔" ونیزہ بات ختم کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

نور افروز صحت یاب ہوگئیں لیکن ونیزہ اپنے

ہی گھر میں ابھی ہوئی۔

لیے پھیکا پڑنے لگا تھا۔

حشمت بیگم ابھی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تھیں، صباحت بھی سو رہی تھی۔ ونیزہ نے ناشتا بنایا اور حشمت بیگم کے کمرے میں ٹرے سجا کر لے آئی۔

پھپھو! آئیں۔ آج ہم ساتھ ناشتا کرتے ہیں اب صلاح کرلیں، میں آپ کو خفا کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس وقت نور آنٹی کو میری ضرورت تھی۔ میں نے صرف انسانی ہمدردی کے ناتے ان کی مدد کی تھی۔ وہ اس وقت بس میں اکیلی تھیں۔"

"دور کیوں کھڑی ہو، میرے قریب آؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بہت حساس ہو اور تمہارا دل بہت نرم ہے۔ ہر ایک کا خیال رکھتی ہو۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب احتشام بھائی کار ایکسیڈینٹ میں شدید زخمی تھے، تمہاری مما تو اس حادثے میں انتقال کرگئی تھیں۔ احتشام بھائی نے تمہیں میرے سپرد کیا اور کچھ دیر بعد وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ اس دن سے آج تک تمہیں اپنے مرحوم بھائی کی نشانی سمجھ کر سنبھالا ہے۔ تم ابھی بہت معصوم ہو اور دنیا کو نہیں سمجھتیں۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں اپنے بھائی کو کیا جواب دوں گی۔" حشمت جہاں نے ونیزہ کو پیار سے گلے لگا کر کہا۔

"اچھا چلیں وعدہ، آئندہ ایسا کچھ نہیں کروں گی۔ آئیں اب ناشتا کریں، مجھے معلوم ہے آپ نے بھی میرے بغیر کچھ نہیں کھایا ہے۔" ونیزہ نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اپنے کان پکڑے۔

حشمت جہاں ہنس پڑیں پھر یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگیں۔

"سوچتی ہوں تمہاری کسی اچھے گھرانے میں شادی ہوجائے تو میں بھی تمہاری ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاؤں۔"

"نہیں۔ پہلے صباحت کی شادی کریں، مجھے ابھی اپنی خدمت کا موقع دیں۔ میری ہر ضد اور شوق آپ نے پورا کیا ہے، خاندانی روایت کے برخلاف مجھے جاب کرنے کی اجازت دی اس لیے میری یہ بات بھی ماننی ہوگی آپ کو۔" ونیزہ کا انداز اٹل تھا۔

"بہت ضدی ہے میری یہ بچی۔ مجھے پریشان کرتی ہے اور پھر پیار سے منا بھی لیتی ہے۔" انہوں نے محبت سے اس کی پیشانی چومی۔

حشمت بیگم پہلے ایسی تلخ اور سخت مزاج نہیں تھیں۔ کبھی وہ بھی رنگوں اور خوشبوؤں سے پیار کرتی تھیں۔ شادی شدہ زندگی بہت خوش گوار گزر رہی تھی اولاد جیسی نعمت بھی صباحت کی شکل میں مل گئی تھی۔ ان کے شوہر نجم بیگ بھی بہت پیار کرنے والے انسان تھے۔ لیکن ان کی زندگی کم تھی، ایک دن اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ زندگی ایک سوالیہ نشان بن گئی۔ شوہر کے بعد صباحت اور ونیزہ کے لیے انہیں زندگی کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ میکے میں کوئی تھا نہیں جو سہارا بنتا، ایک بھائی تھا جو دنیا سے جاچکا تھا۔ سسرالی عزیزوں نے وراثت کا حصہ لیا اور چلتے بنے۔ بزنس پاٹنرز نے کاروبار سنبھال لیا انہوں نے یہ مہربانی کی کہ حشمت بیگم کو

ایک مناسب رقم ہر مہینے دینے لگے۔ بڑا گھر فروخت کرکے وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں شفٹ ہوگئیں کچھ رقم انہوں نے ونیزہ اور صباحت کے مستقبل کے لیے الگ رکھ لی۔

اس کالونی کو حشمت بیگم پسند نہیں کرتی تھیں یہاں رہنا ان کی مجبوری تھی۔ یہاں رہنے والی صرف سکندر علی کی ماں وجیہہ خاتون سے ان کی دوستی ہوگئی تھی کیونکہ وہ اپنا تعلق کسی نواب گھرانے سے ظاہر کرتی تھیں اور اپنی پرتعیش ماضی کے قصے سناتی رہتیں۔ صباحت بھی ان کے گھر جانے لگی، وجیہہ آنٹی اسے اپنے ساتھ خریداری کرنے اور تقریبات میں بھی لے جاتی تھیں۔ حشمت بیگم کو یہ امید تھی کہ اس طرح ملنے جلنے سے صباحت کا رشتہ کسی اعلا گھرانے میں ہوجائے گا۔ مائیں تو سدا کی خوش فہم ہوتی ہیں۔

دن یونہی ہی گزرتے رہے، حشمت بیگم کا وجیہہ سے میل جول بڑھتا رہا۔

☆☆☆

"ونیزہ! صباحت کو وجیہہ اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے گئی تھی، وہ اب تک نہیں آئی۔" حشمت بیگم نے پریشانی سے ونیزہ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آپ نے ان کے گھر جاکے معلوم کیا ممکن ہے سکندر کو کچھ معلوم ہو؟" ونیزہ جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں ان کے گھر گئی تھی وہ لوگ گھر چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ مالک مکان نے بتایا کہ سامان تو ان چار دن پہلے ہی چلا گیا تھا آج چابی بھی دے گئے ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے ہمیں پولیس سے مدد لینا ہوگی۔" ونیزہ ابھی یہ کہہ رہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونکا دیا۔

"لگتا ہے صباحت آگئی۔" بیگم حشمت نے قیاس کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔

"صباحت! کہاں دیر ہوگئی تھی تمہیں...... اور وجیہہ کہاں ہے؟ تم کس کے ساتھ آئی ہو؟ بیگم حشمت نے ایک سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

"شکر کیجیے۔ یہ کسی انہونی کا شکار ہونے سے بچ گئی، سنبھالیں اپنی بیٹی کو۔" وجیہہ کے بجائے نقاب پوش عورت نے جواب دیا۔

"تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟" ونیزہ نے صباحت کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"بے فکر رہو یہ بالکل محفوظ تھی اگر ذرا سی دیر ہوجاتی تو یہ کسی رنگین بازار کی زینت بن جاتی، بدنامی اور رسوائی اس کا مقدر ہوجاتی۔" نقاب پوش عورت پھر سے بولی۔

صباحت تو اتنی سہمی ہوئی تھی کہ کچھ بول ہی نہیں پارہی تھی، بس روئے جارہی تھی۔

"تم کیسی باتیں کررہی ہو؟ میری بیٹی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔"

"جانتی ہوں آپ اعلا خاندان اور اونچے گھرانے سے ہیں لیکن جب رشتہ بدنام گلیوں سے جڑ جاتا ہے تو کون سا خاندان اور کیسا گھرانہ سب گھنگرو کی آواز اور تماش بینوں کے شور میں دفن ہوجاتا ہے۔"

کیا فضول باتیں کررہی ہو تم؟ ہو کون اور صباحت تمہیں کہاں ملی؟" ونیزہ کو غصہ آگیا۔

"صباحت اغوا ہوگئی تھی۔ شکر ادا کرو اسے بچالیا گیا۔" نقاب والی عورت جواب دے کر جاچکی تھی۔

"پھپھو! مجھے تو یہ عورت نور آنٹی جیسی لگی۔ اس کی آواز بالکل ان کے جیسی تھی۔" ونیزہ نے قیاس کیا۔

"کوئی بھی ہو، ہماری بچی ہمیں مل گئی۔ میں تو شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔ اور صدقہ بھی دوں گی۔"

"صباحت تم کچھ بولو۔ کچھ بتاؤ۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ نور آنٹی کہاں لے گئی تھیں تمہیں۔ اور تمہیں کہاں ملی۔" ونیزہ نے بہت دیر سے یہ عورت ... خاموش بیٹھی صباحت سے سوال کیا مگر وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

☆☆☆

"صباحت! تم کو کامیڈی پروگرام پسند ہیں میں تمہارے لیے ٹی وی پہ کامیڈی شو لگاتی ہوں۔" ونیزہ نے ٹی وی آن کیا اور چینل سرچنگ کرنے لگی۔

"یہ نور آنٹی نیوز چینل پر کیسے آگئیں؟" ونیزہ نے آواز تیز کی اور حیرت سے دیکھنے لگی۔

"یہ وہ بہادر خاتون ہیں جنہوں نے انسانی اسمگلنگ کرنے والے گینگ کو گرفتار کرایا اور اغوا کی گئی لڑکیوں کو بازیاب کرانے میں اداروں کی مدد کی۔ اور بازیاب لڑکیوں کے نام اور تمام معلومات خفیہ رکھی جائیں گی تاکہ ان لڑکیوں اور ان کی فیملی کو بدنام یا ٹارگٹ نہ کیا جاسکے۔" اینکر نے پہلے نور آنٹی کا تعارف کروایا اور ان سے مخاطب ہوئی۔

"نور صاحبہ! آپ نے اتنا مشکل کام کیوں اور کیا سوچ کے کیا، آپ کی اس میں جان بھی جاسکتی تھی۔؟"

"یہ کام مجھے تسکین اور راحت دیتا ہے کیونکہ میں بھی ہیومن ٹریفکنگ کا شکار ہوئی۔ زیادہ خوب صورت لڑکیوں کو دوسروں ملکوں میں فروخت کردیا جاتا ہے۔ میں زیادہ خوب صورت نہیں تھی اس لیے مجھے مقامی بازار کی زینت بنادیا گیا۔ اس ماحول سے مجھے نفرت تھی لیکن مجبوری میں وہاں رہتی رہی۔ ایک عورت جسے سب میڈم کہتے تھے وہاں اسی کا حکم چلتا تھا مجھے بھی اس کے حکم پر سر جھکانا پڑتا۔ کچھ عرصے بعد وہ مجھ پر بھروسا کرنے لگی اور پھر ایک دن میں وہاں سے بھاگ نکلی۔" نور افروز نے ماضی کی تلخ یادیں بیان کیں۔

"آپ اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے ملی ہوں گی۔ سب بہت خوش ہوئے ہوں گے۔" اینکر نے ایک اور سوال کیا۔

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرے دامن میں اس کی رسوائی ہی نے ان کی نیک نامی اور عزت آلودہ ہوجاتی۔ میرے بابا اور بھائی معاشرے میں سر اٹھا کر کیسے جیتے، میری چھوٹی بہنوں کا مستقبل میری وجہ سے تاریک ہوجاتا۔ اس لیے ان سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا اور اپنی عزت اور نیک نامی کو بچالیا۔"

"پھر آپ کہاں رہیں...... کس نے آپ کو سہارا دیا؟" اینکر نے پراشتیاق انداز میں پوچھا۔

"کچھ ہمدرد اور سمجھ دار لوگوں نے مجھے ایک این جی او کے حوالے کردیا۔ یہ تنظیم بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کو تحفظ اور سہارا دیتی ہے، میں بھی اس تنظیم کا حصہ بن گئی، تعلیم بھی حاصل کی اور اپنے جیسی لڑکیوں کی مدد کرنے لگی کیونکہ میں اب تنہا اور کمزور نہیں ہوں، قانونی ادارے بھی ہماری مدد کرتے ہیں۔ میں ہیومن ٹریفکنگ کرنے والے گینگ کو عام لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے تلاش کرکے بے نقاب کرتی ہوں۔ اور میری زندگی کا مقصد ایسی بے سہارا لڑکیوں کو ان کی پہچان، تحفظ اور معاشرے میں باعزت مقام دلانا ہے۔ جب کوئی بھی بازیاب ہونے والی لڑکی اپنے گھر والوں سے ملتی ہے معاشرے میں مقام بنانے کی کوشش کرتی ہے اس کے مجرم سزا پاتے ہیں، میں اپنی تکلیف بھول جاتی ہوں۔"

نور افروز کا کلوز اپ اسکرین پر چھا گیا اور ان کی آنکھوں میں چمکتے آنسو ہر آنکھ کو نم کرگئے۔

انٹرویو ختم ہوگیا۔ حشمت کی نظروں میں شرمندگی تھی۔ صباحت خوش تھی بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ کیوں کہ وہ ابھی تک خوف زدہ تھی۔ سکندر وجیہہ اور ان کا گینگ گرفتار ہوگیا تھا۔ ان کی جھوٹی شرافت بھی سامنے آچکی تھی۔

ونیزہ یہ سوچ رہی تھی کہ ہم کب تک دوسروں کے کردار کے جج بن کے فیصلے سناتے رہیں گے؟ کب تک نور افروز جیسے لوگوں کو بدکرداری کے طعنوں سے سنگسار کریں گے؟

☆☆

کرن کرن خوشبو

القرآن

”تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جارہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جارہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی، کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔
(النور 15-16)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہمیشہ سچے لوگوں کے ساتھ رہو (سورۃ التوبہ 119)

احادیث نبوی

☆ حضرت صفیانؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تو اپنے بھائی سے کوئی بات کہے اور وہ مجھے سچا سمجھ رہا ہو حالانکہ تو اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔
(سنن ابوداؤد)

☆ جھوٹے گواہ کے قدم ہٹنے بھی نہ پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم واصل کردے گا۔
(ابن ماجہ ج3، ص123)

☆ جس نے کسی مسلمان کو ذلیل کرنے کی غرض سے اس پر الزام عائد کیا تو اللہ تعالیٰ جہنم کے پل پر اسے روک لے گا۔ یہاں تک کہ اپنے کہنے کے مطابق عذاب پالے۔
(ابوداؤد ج4 ص354 حدیث 4883)

جن کے دل میں اللہ ہو

حضرت علی رضی اللہ کے پاس ایک یہودی آیا اور کہا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ مسلمان جب عبادت کرتے ہو تو برے برے خیالات آتے ہیں، جبکہ ہم عبادت کرتے ہیں تو ہمیں نہیں آتے۔

حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا۔ ایک گھر فقیر کا ہو اور ایک گھر امیر کا تو چور کہاں جائے گا۔“

یہودی نے کہا۔ امیر کے گھر میں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ تب ہی تو شیطان ان کو ستاتا ہے جن کے دل میں اللہ ہو، جن کے دل میں اللہ نہیں ہوتا وہاں شیطان کا کیا کام۔
(حفصہ اور حنا...... بہاولپور)

معلومات عامہ

☆ روزانہ کی بورڈ پر فی مربع سینٹی میٹر پائے جانے والے بیکٹر یا اور کوکیوں کی مقدار بیت الخلا والی نشست پر پائے جانے والوں سے زیادہ ہو سکتی ہے۔

☆ انسانی جسم پیاس اور بھوک دونوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ لیکن یہ نیند کی کمی کو برداشت نہیں کرتا ہے۔ یہ فرد کو ساری زندگی کنڈیشننگ کرنے کا اہلیت رکھتا ہے۔

☆ ہاتھی واحد زمین دار ستر ا جانور ہے جس کے چار گھٹنے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اگلے دونوں اعضاء کو بازو نہیں بلکہ پیر سمجھا جاتا ہے۔

☆ مکڑی کا جال فطرت کا سب سے مضبوط مواد ہے یہ اسٹیل سے زیادہ طاقتور اور نائلون سے زیادہ لچک دار ہے۔

☆ انیسویں صدی تک ماہرین دانتوں کا طریقہ بنانا نہیں جانتے تھے۔ اس وجہ سے وہ مردہ فوجیوں کے دانتوں سے ڈیزائن کرتے تھے۔

☆ 1830ء میں کیچپ کو درحقیقت کئی

یہ بطور دوا فروخت ہوا کرتی تھی۔
(سونیا ربانی...... قاضی محلہ بالا)

حسد
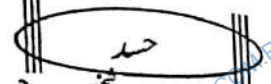
بقراط یونان کا وہ پہلا شخص ہے جس نے علم طب کو بے قاعدگی بخشی اور بحیثیت ایک علم اسے آگے بڑھایا اس نے طب کے ذریعے لوگوں کی بے انتہا خدمت کی وہ کہا کرتا تھا کہ۔

”میری عظمت کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے اپنی جہالت سے آگاہی حاصل کرلی ہے۔ اس سے لوگ حسد کرنے لگے۔“ لیکن وہ اپنے حاسدوں سے ذرا بھی نہیں گھبراتا تھا۔

اس کے ہمدرد اسے متنبہ کرتے۔ ”بقراط فلاح شخص تم سے بے حد حسد کرتا ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا۔“

بقراط جواب دیتا۔ ”میں مردوں سے نہیں ڈرتا۔“ شکایت کرنے والے نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن میں جس کی بات کررہا ہوں وہ مردہ نہیں ہے۔ زندہ ہے۔“

بقراط نے جواب دیا وہ شخص میرا حاسد ہے اور یاد رکھو حاسد آدمی کو اس کا نفس موت سے پہلے ہلاک کردیتا ہے۔“
(نجمہ جبار...... بہاولپور)

ترتیب
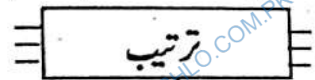
مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں زمانہ طالب علمی میں ایک مرتبہ اردو کے پیپر میں لفظ ”شدہ“ سے چار لاحقے لکھنے کو کہا گیا۔ میں نے جواب میں لکھا ”شادی شدہ“ گم شدہ، ختم شدہ، تباہ شدہ۔“

اگلے روز استاد محترم نے پیپرز چیک کر کے واپس دیے تو مجھے لاحقوں والے سوال میں چار میں سے آٹھ نمبر ملے تھے۔ میں نے استاد صاحب سے فالتو نمبروں کے متعلق پوچھا تو مسکرا کر کہنے لگے۔ ”پتر چار نمبر صحیح جواب کے ہیں اور چار صحیح

(فوزیہ ثمر بٹ ، گجرات)

گناہوں سے نفرت

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ کی قوم کے ایک لاکھ آدمی عذاب سے ہلاک کیے جائیں گے جن میں چالیس ہزار نیک لوگ ہیں اور ساٹھ ہزار بد عمل

حضرت یوشع علیہ السلام نے عرض کیا۔ رب العالمین بدکرداروں کی ہلاکت وجہ تو تو ظاہر ہے لیکن نیک لوگوں کو کیوں ہلاک کیا جارہا ہے تو ارشاد ہوا یہ نیک لوگ بھی ان بدکرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے اور ہنسی دل لگی کے شریک رہتے تھے۔ میری نافرمانیاں اور گناہ دیکھ کر ان کے چہروں پر کوئی ناگواری کا اثر نہ آیا۔
(تفسیر بحر محیط ۳/۵۳۳ المائدہ ۶۳)

حکمت عملی

ایک آدمی سرراہ اپنے ڈاکٹر سے ملا تو حیرت سے پوچھا۔ ”جناب آپ اپنا کلینک بند کرکے چپکے سے کہیں چلے گئے اور کسی کو بتایا تک بھی نہیں۔ ایسا کیوں؟“

ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ ”نہیں تو! میرا کلینک تو ابھی بھی وہیں پر ہے۔ تمہیں ایسا کس نے بتایا؟“

اس آدمی نے کہا۔ ”آپ کے کلینک کے نیچے پولٹری کی دکان والے نے۔“

ڈاکٹر صاحب سیدھا اس دکان پر گئے اور پوچھا۔ ”بھائی! تیرے میرے بیچ میں ایسی کون سی بات ہوگئی ہے کہ تم میرے مریضوں کو اوپر میرے کلینک میں جانے دینے کے بجائے بتاتے ہو کہ میں یہاں سے کلینک بند کرکے کہیں اور چلا گیا ہوں...... ایسا کیوں کررہے ہو۔“

پولٹری والے نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب، آپ بھی تو جو بھی مریض آتا ہے اس کے کہتے ہو۔

انڈے نا کھایا کرو ان سے الرجی ہوتی ہے۔ اگر کام کرنا ہے تو مل کر کرتے ہیں۔ ورنہ دکان بند ہوگی تو دونوں کی ساتھ ہوگی۔"

(سحر وقاص راجپوت ….. لاہور)

گوہر نایاب

☆ چیر کی موج اور چھوٹی سوچ ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔
☆ ٹوٹی قلم اور دوسروں سے جلن ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔
☆ کام کا آلس اور پیسے کا لالچ ہمیں ترقی کرنے نہیں دیتا۔
☆ کنارے پر تیرنے والی لاش کو دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا۔ بوجھ جسم کا نہیں سانسوں کا تھا۔
☆ سفر کا مزا لینا ہو تو ساتھ سامان کم رکھیے اور زندگی کا مزا لینا ہو تو دل میں ارمان کم رکھیے۔
☆ زندگی کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت نہیں ہے یہاں سے زندہ بچ کر کوئی نہیں گیا۔
☆ پیسہ انسان کو اوپر لے جا سکتا ہے لیکن انسان پیسے کو اوپر نہیں لے جا سکتا۔

حریم سلمان ….. کراچی

علامہ اقبال اور پروفیسر مفسر

ایک کالج کے پروفیسر کو شوق ہوا کہ میں قرآن پاک کی تفسیر لکھوں، خوب بکے گی پیسے اچھے آئیں گے۔ لکھنی شروع کر دی اب دل میں سوچ رہا ہے کہ بکے گی کیسے؟ مجھے تو کوئی جانتا نہیں۔ کوئی بڑے مولوی صاحب لکھیں کہ یہ تفسیر بہت اچھی ہے پھر بکے گی۔ لیکن مولوی صاحب ایک صفحہ میں بیس بیس غلطیاں نکالیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے ویسے ہی برا بھلا کہنا شروع کر دیں۔ لکھتا رہا، سوچتا رہا آخر ایک دن خیال آیا کہ علامہ اقبالؒ شاعر ہے۔ دین کا درد دل میں رکھتا ہے لیکن مولوی تو نہیں ہے ناں۔ اسے تفسیر دکھاؤں گا۔ ویسے ہی دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔

یہ آدمی تفسیر کا ایک حصہ لے کر علامہ اقبالؒ کے پاس چلا گیا کہ جی میں نے تفسیر لکھنا شروع کی جو عقلی شبہات کالجی لڑکوں میں پھیلائے جاتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر تفسیر لکھی تا کہ ان فتنوں کا انسداد ہو جائے۔

کہا: بہت اچھا کام ہے۔

کہنے لگا: میں ساتھ بھی لایا ہوں۔ آپ اس پر کچھ لکھ دیں۔

کہا: اچھا رکھ دو۔ میں پڑھوں گا پھر بعد میں آنا۔

اب کوئی دو ماہ بعد پروفیسر صاحب گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب خود ہی تفسیر کا ذکر چھیڑیں گے۔ انہوں نے کوئی بات ہی نہیں کی …… پروفیسر نے اٹھتے وقت کہا۔ میں آپ کو تفسیر دے کر گیا تھا۔

فرمایا کہ آپ کی تفسیر میں نے پڑھی۔ تفسیر سے میری ایک بہت بڑی غلط فہمی دور ہو گئی کہ آج تک میں غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ مظلوم ہستی حضرت حسینؓ کی ہے کہ پردیس میں چھوٹے چھوٹے بچے ذبح کر دیے گئے۔ لیکن آپ کی تفسیر پڑھ کر میری غلط فہمی دور ہو گئی کہ نہیں حسین سے بھی زیادہ مظلوم خدا کا قرآن ہے کہ جو بھی اٹھتا ہے اس کی تفسیر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

(از خطبات امین)

ایزی لوڈ

دل کی سم میں جان جاں
جس قدر بھی بیلنس تھا
قرض تھا محبت کا
خرچ کر دیا ہم نے سانس کی تجارت میں
کیش کے زمانے میں
ادھار کون دیتا ہے
دھڑکنوں کا ایزی لوڈ یار کون دیتا ہے

عاطف جاوید عاطف

☆☆

بشریٰ محمود

سونیا ربانی، کی ڈائری میں تحریر

عاطف سعید عاطف کی غزل

کبھی لو رہی تری یاد سے، کبھی خط پکڑ کے جلا دیا
کبھی شدت غم ہجر سے ترا نام لکھ کے مٹا دیا

مرے مرشدی ترے بعد دل کسی اور کا نہیں ہو سکا
کہ پجاریوں میں یہ ریت ہے جو چڑھا دیا سو چڑھا دیا

دل سوختہ کا وہ داغ ہو یا وہ منتوں کا چراغ ہو
ترے نام پر ترے بام پر جو جلا دیا سو جلا دیا

مری خاک کو نہیں چاہ اب، وہی در بدر کسی چاک کی
مرے کوزہ گر ترے ہاتھ نے جو بنا دیا سو بنا دیا

یہاں تشنگی رہے جب تلک نہیں پھیرتے ہیں نگاہ کو
یہاں ساقیوں میں رواج ہے جو بڑھا دیا سو بڑھا دیا

نہ وہ وحدتوں بھرا ہاتھ ہے نہ وہ شعلگی بھرا ساتھ ہے
ابھی مختصر یہی بات ہے جو بجھا دیا سو بجھا دیا

قاضی صبا ایوب، کی ڈائری میں تحریر

اقبال اشعر کی غزل

کبھی کسک صدائی کی کبھی مہک وصال کی
قدم نہ تھے زمین پہ جب وہ عمر تھی کمال کی

کئی دنوں تھکے فکر کا افق اداس اداس ہے
نہ جانے کھو گئی کہاں دھنک تیرے خیال کی

رفاقتوں کے وہ نشاں نہ جانے کھو گئے کہاں
وہ خوشبوؤں کی رہ گزر وہ رنگوں کی پالکی

کسی کو کھو کے پالیا کسی کو پا کے کھو دیا
نہ انتہا خوشی کی ہے نہ انتہا ملال کی

وہ روشنی کا خواب تھا مگر وہی سراب تھا
عروج میں چھپی ہوئی تھی ابتدا زوال کی

فرزانہ امین، کی ڈائری میں تحریر

فاروق روکھڑی کی غزل

دل کے معاملات سے انجان تو نہ تھے
اس گھر کا فرد تھا کوئی مہمان تو نہ تھا

کٹ تو گیا ہے کیسے کٹا یہ نہ پوچھیے
یارو سفر حیات کا آسان تو نہ تھا

تھیں جن کے دم سے رونقیں شہروں میں جا بسے
ورنہ ہمارا گاؤں یوں ویران تو نہ تھا

بانہوں میں جب لیا اسے نادان تھا مگر
جب چھوڑ کر گیا مجھے نادان تو نہ تھا

غلام گھر بنایا نہیں اپنی ذات کو
کمزور اس قدر میرا ایمان تو نہ تھا

دنیا ہی آ کے پوچھتا فاروق حال دل
کچھ اس میں اس کی ذات کا نقصان تو نہ تھا

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

شادی

میاں بیوی کا مزاج اگر ایک جیسا بھی ہو تو تب بھی شادی کے بعد بہت عرصہ لگتا ہے ایک دوسرے کو سمجھنے میں اور ویسے شادی ایک جیسے مزاج سے نہیں چلتی، شادی تو چلتی ہے سمجھ داری سے اور لچک پیدا کرنے سے کمپرومائز کرنے سے۔

(عمیرہ احمد...... زندگی گلزار ہے)

نجمہ جبار...... بہاولپور

بہشت یا دوزخ

فیصلہ کا لمحہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار یہ لمحات نہیں آتے۔ صحیح وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ اگر غلطی سے کوئی فیصلہ غلط ہو جائے تو اس کی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہیں۔ جیسے ہیں ان کی حفاظت تو کرنا ہوگی۔ دنیا کی تاریخ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا، اکثر تاریخی فیصلے غلط تھے۔ لیکن تاریخی تھے۔ تقدیر اپنا بیشتر کام انسانوں کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کر لیتی ہے۔ انسان راہ چلتے چلتے دوزخ تک جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے بہشت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

(واصف علی واصف...... دل دریا سمندر)

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

شوہر کی زندگی

اسکول میں ماسٹروں سے مرعوب ہونا ہمارے نزدیک ذلت کی بات تھی۔ البتہ ذرا ہیڈ ماسٹر کے گھنٹے میں تھوڑی دیر کے لیے دم سادھے بیٹھنا پڑتا تھا مگر اب تو یہ حال ہے گویا ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہی شادی کر لی ہے۔ کیا مجال ہے کہ بیگم صاحبہ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے پیدائشی حق یعنی آزادی سے بھی کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ صبح دیر سے سو کر اٹھیں تو منحوس، منہ ہاتھ دھوئے بغیر چائے پی لیں تو "اچھوت" دفتر دیر سے جانے کا ارادہ کریں تو کام چور، نوالہ حاضر، جاڑے کا زمانہ اگر بغیر غسل سے ٹالنا چاہیں تو افیونچی، تاش کھیلیں تو جواری، شطرنج سے دل بہلائیں تو نحوست کے ذمہ دار، باہر گھومنے جائیں تو آوارہ رات کو دیر سے گھر آئیں تو اعلا درجے کے بدمعاش، پتنگ اڑانے کا ارادہ کریں تو لوفر اور اگر کچھ بھی نہ کریں یعنی خاموش بیٹھ کر او نگھیں یا منہ اٹھائے محض بیٹھے رہیں تو بے وقوف۔

اب آپ ہی بتائیں یہ زندگی ایک شوہر کی زندگی ہے یا کالے پانی کی سزا پانے والے کسی مجرم کی زندگی۔

(شوکت تھانوی...... خطی)

مقدس ناز، صدف ناز...... ملتان

ہمت

میرے دوست اپنی بیویوں کو دوسری شادی کی دھمکیاں دے کر کنٹرول کرتے اور ان سے اپنی شرائط منواتے تھے۔ ایک دن میرے من میں بھی آیا کہ میں بھی اپنی بیگم کو دوسری شادی کی دھمکی دے کر ڈراؤں ایک دن میں نے طیش میں آ کر بیوی سے کہا اگر تیری چیخ چیخ ختم نہ ہوئی تو میں دوسری شادی کر لوں گا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ بیوی نے آستین چڑھا لیے اور کہنے لگے جا ابھی دوسری شادی میں نے جو عیشایاں کر لی ہیں۔ اب وہ بھی کر ے، میں کھا چکی اب وہ بھی کھائے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکالا اور کہا اب اس وقت تک گھر میں پاؤں نہ رکھنا جب تک دوسری شادی نہ ہو جائے۔ اگر اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو دوسری شادی کر کے دکھا اب وہ دن آج کا دن میں نے دوبارہ کبھی دوسری شادی کا نام نہیں لیا۔

(مشتاق احمد یوسفی)

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

☆☆

مُدیرہ کرن

سونیا ربانی.........قاضیاں محلہ باللی

اس بارتو جی حد ہی ہوگئی۔ اس طرح تو کبھی پری نے افق کی راہ نہ دیکھی ہوگی۔ جس طرح ہم ڈاک والے بھیا جی کی راہ دیکھی مگر وہ نہ آئے اور ہمارے سسرال سے ہمیں دعوت آ گئی کیونکہ مبین کہ کزنز کی (روٹی پکائی جارہی تھی) گاؤں میں نئے شادی شدہ جوڑے کی دعوت کو یہی کہا جاتا ہے۔ خیر اس روٹی کے چکر میں ہم کو دعوت دی گئی کہ صرف روٹی نہیں ہوتی۔ چھ سات ڈشیں تو بنانی پڑتی ہیں۔ سو ہم روٹی پکانے چلے گئے اور دل قاضیاں کی گلیوں میں رہ گیا۔ (کہ ہائے ڈاک نہ آئی) خیر واپس آئے تو پتا چلا کہ 15 اکتوبر کو کرن کی آمد ہوچکی ہے۔ سو ہم نے فوراً کھول کر پڑھنا شروع کردیا۔ اس بار مجھے ٹائٹل بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ صائمہ اکرم سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ ''میری بھی سنیے'' سوری جناب سکندر راجپوت صاحب ہم نے آپ کی نہیں سنی (ویسے ہم بھی راجپوت ہوتے ہیں) ''مقابل ہے آئینہ'' فجر ناصر نام کی طرح جواب بھی پیارے تھے (لیکن نام تو قلمی تھا) خیر لڑکیوں اگر اس بار تم میں کوئی آئینے کے سامنے آئی ناں تو سونی نے وٹا (پتھر) اٹھا کر آئینہ توڑ دینا ہے آئی سمجھ۔ (ساڈی واری آنے دو یاروں)

مکمل ناول دماغ لڑا لڑا کر کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا ہے۔ ''نمکین پانیوں کا سفر'' یعنی قاری پہلے شمائلہ سے محبت کرتے ہیں اور اب وہ بدل گئی ہے مجھے تو بہت بری لگی اب نہ جانے کیا کرنے جارہی ہے، معین کے ساتھ مل کر۔ مجھے نیسی کا کردار بہت اچھا لگا اور خضر حیات کا بھی۔ پرسکون کرنے والا اینڈ کرنا منعم جی۔ فرح جی کا ''محبت جیت جاتی ہے۔'' ہاں جی کہانیوں میں اکثر جیت جاتی ہے (اور حقیقت میں ہم اسے جیتنے نہیں دیتے)

مجھے مس نمرہ کی بے بسی رونا آیا جی۔ اللہ معاف کرے ایسے بھی بھائی ہوتے ہیں۔ عقیلہ ہاشمی جی لے کر آئیں۔ ''نکھرا ہے ابھی چاند۔'' چلیں نیلی کی قسمت نے ساتھ دیا اور ناصر صاحب نے سچ مچ جادو کی چھڑی گھمائی۔ ورنہ جو حالات نیلی کے گھر اور خاندان کے بیان کیے تھے ناناممکن ہی تھا (ویسے نیلی نام میرا ہاتھ تھام کر ماضی میں لے جاتا ہے) ''درد ہجر'' ام اقصیٰ آئیں اور سیدھا میرے دل میں اتر گئیں۔ کہاں ہیں آپ میں آپ کے ہاتھ چوم لوں یار۔ رنگیلی تائی مجھے یاد رہے گی درد ہجر کی ماری ہوئی عورت۔ افسانے دیکھ کر خوشی ہوئی پورے پانچ جو تھے ''قصور اور زندگی تم سے ہے'' کچھ کچھ ملتے جلتے تھے مگر اچھا سبق تھا دونوں میں ''الٹی ہوگئیں سب تدبیریں'' ام ہانی نے بھی اچھا لکھا۔ اور بہت مزا آیا جب باسل بھائی کی پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ رہا تھا۔ ''خوش قسمت'' میں مجھے تو ترس آیا اس ماں پہ۔ اور ''ماں جائے'' حقیقت سے قریب تھا۔ ''کرن کتاب'' کی بات ہوجائے۔ بیوٹی باکس میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے مگر اک مسئلہ ہے اگر کسی پاس حل ہو تو؟ میری ارسا جو چار سال کی ہے اچانک اس کے بال گرنے لگے ہیں اور تھوڑے سے رہ گئے ہیں کوئی حل بتادیں اگر کسی کے پاس ہے تو؟ نفسیاتی مسائل ہاں جی سچ میں والدین کے اپنے مسئلے اور فکریں ہیں اور بچوں کے اپنے۔ ابھی بچے چھوٹے ہیں مگر پھر بھی ان کی پڑھائی کو لے کر اکثر ٹینشن ہوتی ہے۔ ''گرز نے پل جو سوچوں تو''، سچ مچ بہت پیچھے جھانک کر لکھا تھا کچھ خوابوں سے پل اور پھر بہت سارے عذابوں سے لمحے جو رک گئے تھے مگر صبر اور صبر اور آخر میں بات ہوجائے۔ ''نامے میرے نام'' کی۔ فائزہ جی میں وہی ہوں اور دعا کریں اب نہ کھو جاؤں پھر مل کر سب کو پکڑ کر لے آئیں گے (انیقہ گڑیا شاہ، نواب زادی سونگی، حرمت ردا) اور کیا پوچھوں میں محسن نقوی سے کہ یہ سچ ہے کبھی کبھی جو صرف ہمارے لیے ہوتے ہیں ناں ہم ان کی خود ہی کھودیتے ہیں۔ فرزانہ امین کا تبصرہ اچھا لگا۔ وہ تو آخر میں جا کر پتا چلا کہ فرزانہ جی کا دل میرے تبصرے سے باغ باغ ہوا شکریہ۔

زرینہ خانم لغاری.........مظفر گڑھ

ستمبر کا شمارہ ملا سرخ کپڑوں والی پیاری سی بچی کو سرورق پر دیکھ کر دل خوش ہوگیا اتنی بھولی اور معصوم شکل دل میں کھب گئی۔ آگے بڑھے حجاب کے متعلق بہنوں کی رائے سنی تقریباً تمام بہنوں کو حجاب کا حامی پایا۔ یہ اللہ کا حکم ہے قرآن مجید میں فرمان خداوندی ہے'' نجمہ جبار'' سے آئینے میں۔ ملاقات ہوئی ماشاء اللہ اچھی دین دار خاتون لگی ہیں آخری سوال کا جواب تو بہترین تھا۔ ہر مسلمان کی خواہش بیان کردی۔

''ساتھ کیوں نہیں دیتے'' پیاری بہنو بعض دفعہ شوہر حضرات بھی مجبور ہوتے ہیں بیوی کا ساتھ نہیں دیتے ورنہ انہیں جورو کا غلام۔ زن مرید کے طعنے دے دے کر ماں بہنیں ذلیل کردیتی ہیں۔ ''تاش گھر'' نام سے لگتا ہے کہ جلد ٹوٹ جائے گا۔ آپ نے بابا کو مار دیا۔ رحمانی بستامی کو بابا بنادیا۔ صندل جوان ہوگئی واہ کیسی اڑان بھری کہانی نے ''آؤ خواب بنیں'' اچھا سبق تھا انسان کو خواب تو اچھے دیکھنے چاہییں آگے جو اللہ کو منظور ہوگا۔ ''غریق رحمت'' ماں باپ کی فرمانبرداری کی مثال تھی عقیق نے اپنی پسند پس پشت ڈال کر ماں باپ کی پسند پر سر جھکا دیا۔ ایسی بیٹیاں قابل فخر ہوتی ہیں۔ عادل کو بھی بہترین شریک حیات مل گئی۔ ''زندگی تیرے رنگ ہزار'' انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا ناشکرا کہیں کا۔ ''نمکین پانیوں کا سفر'' لگتا ہے اب نیسی صاحبہ کی عقل ٹھکانے آجائے گی بچارے خضر کا ایکسیڈنٹ کروا کر اب ہوش پکڑے گی۔ کرم الہی نے ثانیہ پر اعتبار کرکے قارئین کے دل جیت لینے لگتا ہے کرم الہی دل کا برا نہیں ہے۔ ''بار محبت'' باسی کھانے اکٹھے کرکے مہمانوں کو کھلانے والے انسان بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ مہمان خدا کی رحمت ہوتا کسی خوش نصیب کے گھر اللہ تعالیٰ بھیجتے ہیں ان کا خوش دلی سے استقبال کرنا چاہیے۔ بے شک اسے قورمے کباب نہ کھلائیں اپنی حیثیت کے مطابق دال ساگ خوش دلی سے کھلادیں ''تم سے چھپا کون'' منی اور عدیل کا خوب جوڑا ملایا، بہت اچھا ہوا۔ عدیل تو ویسے ہی احساس کمتری میں مبتلا تھا ورنہ معذور لوگوں کو بڑے اعتماد سے رہتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اپنے آپ میں گم نہ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے بے عیب پیدا کیا ہے۔ ''ٹھنڈی چھاؤں'' میکے میں بہن بھائیوں کی جن باتوں پر تب چڑھتی ہے۔ سسرال میں جا کر وہی یاد آتی ہیں اور دل چاہتا ہے وہی دن لوٹ آئیں۔ ''لا'' کا تبصرہ تو رہنے ہی دو کہانی آگے سرک ہی نہیں رہی دسواں باب چل رہا ہے ابھی تک لڑکیوں کی پڑھائیاں ہی چل رہی ہیں۔ ''دل درد آشنا'' خوب صورت کہانی تھی تمام کردار ہی دل کو بھائے۔ وانیہ کو خواہ مخواہ کے نخرے آرہے تھے۔ احد نے اسے دھوکا تو نہیں دیا تھا سچ بات بتادی کہ میں منگنی شدہ ہوں۔ اس میں اتنا قصوروار تو نہیں تھا جب قسمت نے حالات ایسے کردیے کہ ہم سفر بن سکتے تھے تو اتنا ری ایکشن دکھانے کی کیا ضرورت تھی شکر ہے محترمہ کو عقل آ گئی۔ ''زندگی کا گھر'' گھریلو ماحول پر ایک خوب صورت کہانی تھی۔ بچوں کی وجہ سے ہی گھر میں رونق ہوتی ہے اور ایک مثال ہے بچہ ہو اور شرارت نہ کرے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ''کرن کرن خوشبو میں'' تلاش گمشدہ بہت پسند آیا واقعی خلوص کھو گیا ہے اور ملنا بھی مشکل ہے۔

ج۔ زرینہ ''لا'' میں کالج کا ماحول ہی دکھایا گیا۔ جہاں مختلف علاقوں سے آئی لڑکیاں ہیں اور سب کی اپنی اپنی الگ کہانی ہے۔

سحر وقاص راجپوت.........لاہور

اتنے دنوں بعد خط لکھنے کا وقت ملا ہے زندگی نے اتنا مصروف کردیا ہے کہ رسالہ پورا پڑھا ہی نہیں جاتا۔ اس بار جلدی مل گیا تو تھوڑا وقت نکال ہی لیا ہے ان تمام بہنوں کا شکریہ جنہوں نے اس ناچیز کو یاد کیا۔ سب سے پہلے تو نمکین پانیوں کا سفر پڑھا جس کہانی نے شروع سے لے کر اب تک اپنے سحر میں جکڑ کر رکھا ہے صد شکر کہ خضر کو نیسی کا رائٹر ہونا پتا چل گیا۔ شکیلہ کا صدام کی حرکات کے جواب میں اپنی بہادری، عقل مندی دکھانا اچھا لگا۔ ثانیہ اور کرم الہی کے مکالموں نے تبرا ان کردیا۔ ''تاش گھر'' میں ہمیں ایمل رضا نے بھی باندھ

کے رکھا ہے اچھا ہے کہ چاند نے رحبانی سے شادی نہیں کی شاید اسے وہ بڑھیا بتا چکی ہو کہ اس کے پیارے انتش کا قاتل رحبانی ہے۔ صندل اور میرزاد ۔۔۔ جوڑی اچھی لگے گی دونوں کی کہانی اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ آنے والے وقت کے انکشافات کا انتظار کرنا نہیں پڑ رہا۔ رائٹر جو لائٹ موڈ میں بھی لکھتی ہیں تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جی جی "صائمہ اکرم چوہدری" سے مل کر اچھا لگا کافی ایکٹیو ہیں سوشل میڈیا پہ۔ فجر ناصر کا "مقابل ہے آئینہ" بھی اچھا تھا۔ "دامن سحاب" کی سلویٰ تو گوڈے گوڈے اسفند یار کے عشق میں مبتلا ہو گئی ۔اب سوچ بسیط تیرا کیا گا۔ اور گردیزی خاندان کی انا کا جھنڈا بلند ہو گا کہ سرنگوں کیونکہ جرار سے منسوب سلویٰ ہی ہے نا! منشاء محسن علی کا "لا" بہت سست روی کا شکار ہے حالانکہ دس باب گزر چکے ہیں مگر ابھی تک ہیروئن کے ہیرو ہی سمجھ میں نہیں آ رہے۔ کنیزاں نے سکندر کے ساتھ اچھا نہیں کیا اور یہ آیت اور سیرت کے باہمی تعلقات اتنے کشیدہ کیوں ہیں؟ کیا یہ سگی بہنیں نہیں ہیں!؟ "قصور" ہلکا پھلکا سبق آموز افسانہ واقعی وقت کی صحیح تقسیم سے ہی گھر چلتا ہے۔ قرۃ العین کا "زندگی تم سے ہے" بھئی ہمارے شوہر نامدار تو ہماری سالگرہ ہر سال بھول جاتے ہیں۔ چلو بھئی حجاب تمہارا شوہر آئندہ بھی یاد رکھا کرے گا اور ایسے ہی سرپرائز کے لیے تیار رہنا۔ عائشہ عبیل غالباً نئی رائٹر ہیں "ماں جائے" بہت اچھی اور آج کل کے زمانے کے ماں جائے کی عملی تفسیر بھی "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں" اللہ تعالیٰ بہترین کار ساز ہے اس کے آگے سب کی تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں ویلڈن باسل جو ماں کی عزت بھی رکھی اور من کی مراد بھی پالی۔ "خوش قسمت" میرے لحاظ سے اس ماہ کا نمبر ون افسانہ تھا بچوں کو غیر ممالک میں پڑھنے واسطے بھیجنے والی ماؤں کے حوصلے پر میں حیران ہوں کیسے اپنے لخت جگر کو اپنی نفسانی خواہشات کے لیے خود سے بہن بھائیوں سے دور کر دیتی ہیں پھر نتیجہ یہی ہوتا ہے جو زرتاشہ بیگم کے نصیب میں لکھا گیا۔ "درد ہجر" میں کچھ نوں ۔۔۔ [illegible]

سے نہیں لکھا تو اس شمارے میں ان کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی رنگیلی تائی کا کردار بہت اچھا لگا۔ محبت اور ہجر شاید لازم و ملزوم ہیں یا محبت کی تکمیل ہوتی ہے تا حشر یا پھر ابد تک ہجر کا کڑوا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ فرخ بھٹو جب بھی آتی ہیں ایسی ہی "محبت جیت جاتی ہے" کچھ رومانٹک، ٹریجڈی اور ہیروئین کی قربانیوں جیسی اسٹوری لے کر آتی ہیں۔ ایسے خود غرض بھائی بھی دیکھے نہیں پر نمرہ کی قربانی اور خوددار طبیعت اچھی لگی اور نشاط آپا جیسی بڑی بہن اللہ تعالیٰ سب کو دے۔ (آمین) میری کوئی بڑی بہن نہیں ہے نا اس لیے بڑی بہنوں کی ایسی فکر دیکھی نہیں ۔ "نکھرا ہے ابھی چاند" عقیلہ ہاشمی نئی رائٹر ہیں۔ کیا اچھا موضوع تھا۔ کچھ فلمی سی اسٹوری زمن کی ثابت قدمی نے دونوں کو ملا دیا۔ اندرون لاہور کی تنگ گلیوں محلوں کی اچھی عکاسی کی۔ اندرون لاہور تاریکی اور نو واردات سے بھرا یہ علاقہ حکومت کی عدم دلچسپی کا شکار ہے "کرن کرن خوشبو" میں افشاں سمیع کا انتخاب اچھا لگا۔ ثنا شہزاد اور فوزیہ ثمر نے بھی بہت پیارا انتخاب کیا "کچھ موتی چنے ہیں" صائمہ ریاض ہاشمی کی "خوبی" پسند آئی "کرن کتاب میں" بیکنگ سوڈا کے کمالات نے حیران کر دیا جرمن کباب ٹرائی کروں گی اس بار لاجواب تو نکلے نہیں تھے۔

ج: سحر! منشا کی کہانی کا آغاز حال سے ہوا تھا۔ اب ماضی دکھایا جا رہا ہے۔ چھ لڑکیوں کی کہانی چل رہی ہے۔ سیرت تمکین، نتاشا، عدن، فردوس، گوہر اور کنیزاں۔ آیت کنیزاں کی سوتیلی بہن ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران آمنہ بتول حریم فاطمہ گجرات

اکتوبر کا کرن ۱۰ کو ملا۔ جس کی مجھے بے پناہ خوشی ہوئی کہ سالگرہ والے دن ملا، دگنی خوشی مل گئی۔ ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ آج کل شادیوں کا سیزن ہے۔ تو اس حساب سے ٹائٹل اچھا لگا۔ باتیں ذوالقرنین سے ناظمہ طالب صاحبہ نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سوچتی ہوں، ان ہم لوگ دیکھے بغیر ان کی شخصیت سے متاثرہ ہیں۔ تو جن لوگوں نے ان بات چیت ملاقات کی ہے انہیں کتنا لطف آتا ہوگا۔ باکمال بندہ۔ کبھی نہلا پہ دہلا [illegible]

پڑھا کرتے تھے کچھ لڑکیاں ان کی تلوار جیسے مونچھوں کا خوب مذاق کرتی ہیں۔ مجھے حسرت ہوئی ہر سوال کا ریڈی میڈ جواب حاضر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے سے سوچا ہوتا ہے کہ اگر یہ سوال آیا تو جواب یہ دوں گا۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے آمین۔ ثم آمین۔ انٹرویو میں صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات اچھی رہی۔ ان کے تمام ڈرامے ہٹ ہوتے ہیں۔ "مقابل ہے آئینہ" کی دعا ساڈی وی اللہ پاک خوب سیرت خوب صورت ہیرو عطا فرمائے۔ اب یہ تو تمہاری نظر پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ کہ خوب صورتی کا تمہاری نظر میں کیا معیار ہے۔ کرن کے ناول کی بات ہو جائے "تاش گھر"۔ پچھلی قسط میں انتش کو قتل کر ڈالا سارا قسط ٹینشن میں گزارا کہ یہ خیام نے اچھا نہیں کیا۔ جانو بی بی کا کیا حال ہوگا۔ مگر اس ماہ کی قسط ایمل رضا صاحبہ تو ہمیں 20 سال آگے لے جا چکی ہیں مجھے لگتا ہے چاند بی بی جانتی ہیں کہ رحبان انتش کا قاتل ہے۔ نئی جنریشن کی نوک جھوک ہوا کا تازہ جھونکا ہے۔ "نمکین پانیوں کا سفر" ثانیہ اور کرم الٰہی کی گفتگو نے دکھی کر دیا۔ اور کرم الٰہی کے بارے میں جو منفی خیالات ہیں وہ بدل گئے۔ ثانیہ کے اچھے حالات ہونے کی دعا کی۔ "نکھرا ہے چاند" چلو شکر ہے۔ زمن کے آسمان کا چاند اسی زمین پر ہی مل گیا۔ زمن کو محبت مل گئی اور حنا کو کمائی والی بہو۔ نیلی کے گھر کا نقشہ ہو بہو ہماری گلی کا نقشہ تھا بس گلی میں کسی کی نانی دادی کی منجھی نہیں ہوتی مگر پوری گرمیاں اپنے اپنے دروازے کی دہلیزوں پر سارے محلے کی خبریں نشر ہوتی ہیں۔ وہی کھسر پھسر اسٹائل میں۔ کوئی بات ہو تو گلی کے اینڈ کی خبر منٹ میں سارے گھروں میں جا رہی ہوتی ہے اور کمال کی بات یہ ہے ہاتھ میں تسبیح دانے بھی چلتے رہتے ہیں۔ کیا فائدہ ان نمازوں سجدوں کا کہ اخلاقی قدروں کا فقدان ہو۔ "محبت جیت جاتی ہے" کیا رومینس بھری اسٹوری تھی۔ میکال صاحب بچارے ڈر ڈر کے رومینس بگھارتے رہے کہیں رائٹر پہ پہرا کوئی دفعہ نہ لگا دیں۔ نمرہ علی کے ماں جائے پر غصہ تو بہت آیا اور اپنے ماں جائے ۔۔۔ [illegible]

سامنے تو ہے۔ اللہ پاک لمبی عمر دے اور بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ آمین

ناولٹ "لا" دلچسپ ہے۔ یہ فردوس جیسی مخلوق بھی قابل رحم ہیں۔ "درد ہجر" عندلیب اور سلیمان کا درد مشترک تھا۔ حیدر نے اچھا فیصلہ کیا عندلیب کو چھوڑنے کا۔ رنگیلی تائی۔ لوگ کیسے دکھوں میں زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ ہر ایک کا دکھ اہجر دکھ اور درد سہنے پڑتے ہیں برداشت کرنے پڑتے ہیں کہ اسی کا نام زندگی ہے۔ افسانہ "قصور اور ماں جائے" آنکھوں میں آنسو۔ جب چھوٹے تھے تو بھی امی سے کہا کرتے ہیں۔ امی ماموں لاہور سے نہیں آتے۔ سالوں بعد چکر لگاتے ہیں۔ امی آپ ان کی سگی بہن ہیں کیا۔ اب ماں جائے ایک گھر میں رہتے ہوئے نظریں پھیر کر کمرے میں چلا جاتا ہے۔ "زندگی تم سے ہے" حجاب اچھی تھی کہ عمر کی آپا کا لحاظ کیا ورنہ تو الٹی کھوپڑی والی ہوتی تو کہتی آپا کون ہوتی ہیں۔ میں خود ماہر ہوں ہر کام میں بجائے کسی کو مان دینے کے الٹا جھگڑے کرتی۔ "کرن کرن خوشبو" زرینہ خانم لغاری کا انتخاب پسند آیا۔ روز محشر کا دن تو زندگی سے بھی مشکل ہوگا۔ انسان دھڑلے سے ہر کام کر لیتا مگر جب رب کی عدالت میں پیش ہوگا تب سوائے کاش کے کچھ نہیں کر سکے گا۔ اللہ پاک سب پر اپنا کرم فرمائے۔

"یادوں کے دریچے" سے مقدس ناز صدف ناز کی یاد اچھی لگی۔ "کچھ موتی چنے ہیں" یونس بٹ کی "قلابازیاں" اچھی تھی۔ آج کل جب میں اداس ہوتی ہوں تو پاکستانی پنجابی فلم دیکھتی ہوں۔ وہ بھی آواز بند کر کے۔ بس پھر دھیان فلم کی ہیروئین کی اکھڑی سانسیں اور ہیرو کا گھوڑا کھیتوں کی فصلیں برباد کرتے ہوئے جب اپنی مٹیار کو ملنے آتے۔ تب اداسی ساری ہنسی میں بدل جاتی ہے کہ بچارہ اتنی مشقت کر کے آتا ہے۔ ہیروئین اپنی آخری سانس لے رہی ہوتی ہے۔ "کرن کتاب" کا بیوٹی بکس ہاں یہ چیز کار آمد ہے۔ انڈے کی سفیدی اور ہینگ ۔۔۔ [illegible]

لگتا ہے۔

او لیول اور میٹرک کا فرق تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا اب سمجھ میں آیا او لیول انگریزی میڈیم والے اور میٹرک اردو میڈیم اسکول کی پڑھائی ہے۔

"گزرے جو پل سوچا تو" سونیا ہارون اندھیری رات کی اجلی صبح ضرور ہوتی ہے۔ اور اس کی درمیان والا وقت مشکل ہوتا ہے یہ تو وہی جانتا ہے جو یہ مشکل وقت سہہ رہا ہوتا ہے۔

اس ماہ کے مضمون میں "برتن کتنے خطرناک" جو آپ نے برتنوں کی تمام دھاتوں کا نام لیا ہے۔ سب ہی خطرناک ہیں ان ہی جراثیموں کی وجہ سے پاکستانی قوم کو جلد غصہ میں آ جاتا ہے پہلے وقتوں کے لوگ پاک مٹی کے برتنوں میں کھاتے تھے اور ایمان کے بھی مضبوط تھے۔

"نامے میرے نام" سب کے کرن کے بارے میں اچھے خیالات تھے۔ سونیا ارادہ باندھ لیا ہے۔ افسانہ لکھنے کا تو امید رکھوں اللہ ہمت بھی عطا فرمائے گا۔ باقی دوائی کے ساتھ رات کو [illegible] میں یاسین کا ورد کرو دماغ کو اس لفظ پر فوکس رکھنا۔ یقیناً تمہیں شفا ملے گی۔ ماریہ نذیر شاہ شہزادی، اقصیٰ شہزادی کیسی ہو۔ شاہ شہزادی اس بار تم نے مجھے سالگرہ وش نہیں کی۔ کیوں؟ کوئی زور زبردستی تھوڑی ہے دوستی کسی کے ساتھ۔ طوبیٰ ناز، شاہ شہزادی تم کوئی نہیں آئی کی بنیاں بنا کر بھجوا رہی۔ خود ہی بازار کی سمت بنیاں خرید کر کھاؤ اور انجوائے کرتا سردیاں۔ میں خود بھی کراچی کی طرف منہ کر کے کھاؤں گی اور انجوائے کروں گی۔ ہمارے گجرات میں تو سردی شروع بھی ہو گئیں۔ اولوں کے ساتھ بارش ہوئی تھی۔

ج۔ نور سیما! "زندگی تم سے ہے" میں صرف گلاب ابھی نہیں تھی آپا کا کردار بھی بہت اچھا تھا انہوں نے گلاب پر کوئی تنقید نہیں کی بلکہ بہت اچھے طریقے سے اسے سمجھایا۔ صرف ایک طرف سے محبت راہ [illegible] کام نہیں کرتا۔ دونوں طرف اگر محبت رہے ہوں تو بات بنتی ہے۔

نوشی مغل ... حافظ آباد

سلام پیش کرتی ہوں آپ سب کو جو کرن خواتین سے وابستہ ہیں اور دل لگا کر پڑھتے ہیں۔ ستمبر میں اپنا نام شب نور (خیر نام تو میرا نہیں لیکن خط میرا ہی ہے اس نام کی وجہ سے شب نور لکھ دیا تھا) دیکھ کر بہت بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ ٹھیک یہ ٹھیک یہ سوچ آپی آپ نے اس چڑیل (ہاہاہاہا) کو محفل میں جگہ دی۔ ہائے قسمیں آپی اتنی خوشی تو مجھے نیا سوٹ لیتے وقت نہیں ہوئی جتنا رسالے میں اپنا خط دیکھ کر ہوئی۔ آج مجھے سائرہ آپی نے بولا کہ تم اپنا رئیل نام ہی لکھو۔ جی تو میں نوشی مغل، ستمبر میں میرا خط پوسٹ ہوا تھا اور اب اکتوبر کا ناول [illegible] میرے پاس ہے پر افسوس فرزانہ آپی کے علاوہ کسی نے مجھے اپنی دوست یا بہن نہیں بنایا۔ فرزانہ آپی اپنا ایڈریس بتا دو گلاب جامن اور رس گلے کا ٹوکرا بھجوا دیتی ہوں لیکن ایک بات نہیں سمجھ میں آئی ٹوکرا خالی بھجواؤں یا اندر کچھ ڈال کے (ہاہاہا) مذاق تھا آپ جی۔ ویسے باقی ساریاں میری باجیاں کیوں نی بنیاں؟؟؟ فائزہ بی، ماریہ نذیر، سونیا ربانی، بنت جبار، عائشہ قیوم، شیریں انعم، الفت زہرا، انصاری سسٹرز، انشراح ایمان، آیت ارم، صائمہ ریاض، اقصیٰ شہزادی، شاہ شہزادی، فوزیہ ثمرہ، زرینہ خانم، امان [illegible] کور (میں تو آپ کی اسے کی ہوں گی) اور دیگر قارئین تمہیں تو لاالے توں کوئی گفٹ نہیں۔ ماگھوں کی بہن یا دوست بنالو (عرضی سن لو) بس آپ سے تھوڑا سا پیار اور تھوڑا سا اچار (ہی ہی) ہی مانگو۔ اگر گفٹ تو آپ خود ہی دے دو گے چھوٹی کو ہاہاہا۔ ویسے میں بھی چھوٹی نہیں ہوں بیس سال ہو گئے مجھے اس دنیا میں آئے ہاہاہا۔ میں آپ سب کو بہت زیادہ مس کرتی ہوں۔ شاہین آپی کو بھی میرا سلام۔ مدیرہ آپی، معذرت کہ آج ہی اکتوبر کا ملا اور آج ہی لکھ رہی ہوں اگلے مہینے ان شاء اللہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے گھر دو دو رحمتیں بھیجی ہیں۔ دونوں کے نام میں نے انفال اور ارحہ رکھے ہیں۔ چلو سارے مبارک دو میتوں (ہاہاہا)۔ آپ تو [illegible] ورنہ اس کزی کا دماغ اوہ ہو ہو دل ضرور شاک [illegible] جائے گا۔ [illegible] میرے پاس ابھی وہی کوئی نوٹ نہیں (آنکھوں)۔ ویسے میں آپ کے پاس سے رادی والوں ٹوکری چیک (آہم ہم) لائی ہوں۔ اچھا اچھا آپ صبر و تو موٹے موٹے ٹیشوں سے۔ اچھا آپ آنسوؤں [illegible] سے پہلے کہ مدیرہ آپی کا موڈ [illegible] کر جانے کو جاتی ہوں۔ دل تو نہیں کر رہا جانے کو لیکن اگر تفصیلاً باتیں لکھی تو ایڈٹ ہو جاتا میرا خط۔ رب راکھا۔

ج۔ نوشی مغل محفل میں خوش آمدید "کرن" پر تبصرے کا انتظار رہے گا۔

فرزانہ ... سمندری

یہ 10 اکتوبر کا دن تھا محلے کے تمام گھروں میں ربیع الاول کی آمد پر صفائی ستھرائی کا عمل جاری تھا تمام گھر والوں میں صفائی مکمل ہونے کے بعد ہم محلے کی تمام خواتین گلی کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو گئیں ہماری چچی جان اس بار پہلے سے زیادہ تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں اسی وجہ سے ہماری گلی آدھے گھنٹے میں ہی چمچما اٹھی تھی۔ گلی صاف کرنے کے بعد تمام خواتین جن میں امی جان، چچی جان میری کزنز وغیرہ شامل تھے۔ سب خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے ہم باتوں میں اس قدر مشغول ہو گئے کہ چچی جان کب اندر چلی گئیں (یعنی گھر) گھر پہنچ کر [illegible] کاموں میں مصروف دیکھا تو کہنے لگیں اقصیٰ صبح سے کاموں میں مصروف ہو لاؤ یہ چادریں میں دھو دیتی ہوں چادریں دھونے کے بعد وہ اقصیٰ سے مخاطب ہوئی تھیں۔ "اقصیٰ بیٹا یہ چادریں تو میں نے دھو دی ہیں تم ایسا کرو کہ میرے کپڑے بھی نکال دو وہ بھی ساتھ بھگو دیتی ہوں۔" لیکن اقصیٰ کمرے میں پہنچی بھی نہیں ہوئی کہ چچی جان [illegible] دھڑام سے غسل خانے کے فرش پر گر گئیں۔ اقصیٰ کی چیخ و پکار سے سارا محلہ اکٹھا ہوا تھا چچی کو سمندری لے کر فوراً روانہ ہوئے لیکن انہوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا (آہ) نہ وہ بیمار تھیں نہ ہی کوئی جسمانی بیماری بالکل تندرست ہر وقت ہنسی مذاق کرنے والی چچی خالدہ بیگم چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں (وجہ ہارٹ اٹیک) ابھی اس سانحہ سے ہم نکلے نہیں تھے کہ 19 اکتوبر بروز 12 ربیع الاول کو ہماری تائی جان بھی ہمیں روتا کرلاتا چھوڑ کر چلی گئیں۔

ج۔ فرزانہ! اللہ تعالیٰ آپ کی چچی اور تائی دونوں کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

نگہت غفار ... کراچی

"اداریہ" پڑھ کر ہمیشہ کی طرح ان حالات ان حکمرانوں، ان سیاستدانوں اور ملک دشمن عوام دشمن عناصر کے لیے دل سے تڑپ کر دعا نکلی کہ یارب العالمین اپنا رحم و کرم اور ان بے راہ بھٹکے ہوئے انسانوں کے لیے ہدایت عطا فرما۔ ہم ان سب کو نیک نیتی سے اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ (آمین)

"حمد و نعت" کی تعریف کرنا تبصرہ کرنا ہم جیسے ناچیز حقیر بندوں اور اس [illegible] کی قلم کی اوقات نہیں [illegible] سلسلے خوب صورت ہیں۔ "افسانے" "زندگی کا رنگ" اچھا افسانہ تھا زندگی میں ہمیشہ دونوں رخ پر سوچنا اور دیکھنا چاہیے۔ کسی ایک رخ پر اکتفا کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ "زندگی تیرے رنگ ہزار" زبردست بہت عمدہ اس معاشرے میں رہنے والے ان [illegible] لوگوں کی عکاسی ہے بالکل سچ اور حقیقت پر مبنی [illegible] بہت پسند آئی فکر انگیز پراثر کہانی ہے۔ "متاثل" جیتی رہو (میری خواہش کا نام بھی متاثل ہے)۔ "خطی چھالا" بہت خوب صورت پیار و محبت شرارتوں اور معصومیت سے بھری کہانی بہت اچھی لگی۔ انعم [illegible] ہادی [illegible] عشق [illegible] یار محبت "بہت [illegible] اچھی تحریر تھی۔ ہے بھی کبھی ایسا بھی وقت آتا ہے۔ زندگی کے رشتے نبھانے

حسن کی نزاکت چھپی ہے خوب صورت پاؤں میں

خواتین اپنے چہرے، بالوں اور ہاتھوں پر توجہ دیتی ہیں مگر پاؤں کی حفاظت کے لیے بہت کم توجہ دیتی ہیں اور زیادہ تر خواتین یہ سوچ کر اپنے پاؤں کو نظر انداز کر دیتی ہیں کہ یہ تو لوگوں کی نظر سے چھپے رہتے ہیں۔ پاؤں چھپے رہیں یا نظر آئیں اس کی نگہداشت و تحفظ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

موسم سرما کے آغاز سے جلد قدرتی نمی کھونے لگتی ہے جس کی وجہ سے اکثر ایڑیوں کے پھٹنے کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اس مسئلے سے نجات کے لیے بہت ہی آسان گھریلو ٹوٹکے پیش خدمت ہیں۔

1۔ ایک چوتھائی سرکے کو نیم گرم پانی میں مکس کر کے اس میں پاؤں ڈبوئیں۔ یہ عمل ہفتہ میں تین مرتبہ کریں۔

2۔ زیتون کے تیل میں سفید سرکے کے چند قطرے یا لیموں کے چند قطرے ملا کر ایڑیوں کی مالش کریں اور رات بھر کے لیے اونی جرابیں پہنیں۔ صبح دھولیں۔

3۔ کیلے کو مسل کر دس منٹ کے لیے ایڑیوں پر لگائیں۔ اس پیسٹ میں ناریل پیس کر بھی ملایا جا سکتا ہے۔

4۔ پیرافین ویکس میں سرسوں کا تیل اچھی طرح ملا کر ایڑیوں پر مالش کریں اور رات بھر لگائے رکھنے کے بعد صبح دھولیں۔ یہ عمل دس سے پندرہ دن تک جاری رکھیں۔

5۔ ہلدی میں تیل ملا کر ایڑیوں کی مالش کریں۔

6۔ ایڑیوں کو پانی میں کچھ دیر بھگونے کے بعد ان پر ناریل کا تیل لگائیں۔

7۔ پانی زیادہ پئیں کیونکہ ایڑیاں جسم میں پانی کی کمی کی وجہ سے پھٹتی ہیں۔

8۔ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اپنے پاؤں دس منٹ تک بھگو کر رکھیں۔ پھر انہیں پتھر سے بنے جھانوے سے رگڑیں۔

9۔ اگر آپ کی ایڑیاں زیادہ خراب نہیں تو موم بتی پگھلا کر موم کے قطرے ایڑیوں پر اس طرح گرائیں کہ دراڑیں بھر جائیں اس کے بعد جرابیں پہن کر کر بیس منٹ کے بعد موم کے قطرے چھیل کر اتار لیں، یہ عمل ہفتے میں دو سے تین مرتبہ دہرائیں۔

10۔ لال صابن کی آدھی ٹکیا کرش کریں پھر اس میں پچیس ملی لیٹر گلیسرین ملا کر ہاتھوں سے گوندھ کر پیسٹ بنالیں اور روزانہ رات کو سونے سے پہلے یہ پیسٹ پھٹی ہوئی ایڑیوں پر لگائیں۔

11۔ اگر آپ کے پاؤں کھردرے اور ایڑیاں پھٹی ہوئی ہیں تو بیسن میں لیموں کا رس، ایک چٹکی ہلدی اور بالائی اچھی طرح مکس کر کے اسے فریج میں ٹھنڈا کر لیں۔ اسے اپنے پاؤں پر پندرہ منٹ کے لیے لگائیں پھر گرم پانی سے دھولیں۔ اور آہستہ آہستہ مساج کریں۔ ہفتہ میں ایک بار یہ عمل کریں۔

☆☆

فیشن کے جدید رنگ سمٹ آئے زلفوں میں

آج کل جدید میک اپ کے ساتھ مختلف رنگوں سے بالوں کو رنگنے کا فیشن کچھ زیادہ ہی مقبول ہو رہا ہے۔ آپ بالوں کو رنگتی ہوں گی یا رنگنا چاہتی ہوں گی لیکن ایسا کرنے سے پہلے اپنی عمر اور چہرے کی رنگت کو ضرور مدنظر رکھیں۔ کچھ عرصے پہلے تک براؤن اور سیاہ ہیر ڈائی عام تھا۔ مگر اب اس میں جدت پسندی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اب صنف نازک مختلف رنگوں سے بالوں کو رنگنے میں دلچسپی لے رہی ہیں۔

اب لال، پنک، پیور گولڈ، ویٹ بولنڈے،

ایش گولڈ اور موکا ہیر ڈائی کا فیشن ان ہے۔ لیکن فیشن ڈائی اپنانے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ آپ کے بال کس طرح کے ہیں۔ اگر آپ کے بال نازک یا کمزور ہیں تو ڈائی کروانے سے پہلے پروٹین یا کیراٹین ٹریٹمنٹ ضرور کروائیں۔

فریش ایلوویرا جیل بھی لگا سکتی ہیں اسے رات بھر لگا رہنے دیں۔ اور صبح بال دھولیں لیکن اگر آپ مصنوعی کیمیکلز سے بنے ہیر ماسک استعمال کر رہی ہیں تو دی گئی ہدایات کے مطابق بال دھوئیں کیونکہ کچھ ماسک ایسے ہوتے ہیں جنہیں بالوں میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگانا چاہیے۔

ہیر ڈائی سے پہلے اور بعد میں موئسچرائزر بھی استعمال کریں۔ تاکہ بالوں میں نمی برقرار اور بال نرم و ملائم رہیں۔ آپ کوئی ہیر ماسک بھی استعمال کر سکتی ہیں جس میں وٹامن ای یا ایلوویرا شامل ہو۔ ٹین ایج لڑکیوں کو چاہیے کہ پورے بال ڈائی کروانے کے بجائے ہائی لائٹس کروائیں کیونکہ چھوٹی عمر میں بالوں میں اتنا زیادہ کیمیکلز کا استعمال بالوں کی صحت کے لیے مضر ثابت ہوتا ہے اور اگر آپ کے بال پہلے ہی سے کمزور ہیں تو پورے بالوں کو ہرگز ڈائی نہ کروائیں صرف ہائی لائٹس کروالیں اس سے شخصیت نمایاں نظر آتی ہے اور یہ ٹین ایجر لڑکیوں پر اچھی لگتی ہیں۔

کچھ عرصے سے بلیاج تکنیک کا فیشن زیادہ مقبول ہے جس میں بالوں کے سرے پر لائٹ اور جڑوں والے حصے پر ڈارک کلر کیا جاتا ہے۔

اکثر خواتین کو ہیر کلر کا انتخاب کرنے میں تھوڑی مشکل ہوتی ہے۔ آپ جو بھی شیڈ لینا چاہتی ہیں اس کو بالوں میں لگانے سے پہلے ہاتھ کی پشت پر لگا کر جلد کی رنگت سے میچ کریں۔ اگر وہ آپ کی جلد کے ساتھ میچ کریں تو آپ وہ شیڈ استعمال کر سکتی ہیں۔

گوری رنگت اور سرخی مائل خواتین پیور گولڈ اور شوخ شیڈز میں بال ڈائی کروائیں۔ البتہ گندمی مائل رنگت کی حامل خواتین کو وارم ٹون میں ہی ہیر ڈائی کا انتخاب کرنا چاہیے۔

اس بات کا خیال رکھیں کہ کلر کرنے سے پہلے بالوں کو نہیں دھوئیے کیونکہ بغیر دھلے بالوں میں اس کے نتائج زیادہ اچھے آتے ہیں۔

☆☆

کچن سے شفاء کا راز

دست اور قے کے لیے ایک آلو کو چھیل کر چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں اور ایک گلاس پانی میں ابال لیں۔ آلو ابل جائے تو اس پانی کو ٹھنڈا کر کے ایک کھانے کا چمچہ اسپغول شامل کر دیں اور آدھا کپ دہی ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ بچوں کو ایک چائے کا چمچہ اور بڑوں کو ایک کھانے کا چمچہ ہر ایک گھنٹے بعد کھلائیں۔

☆ اگر آپ کھانسی، گلا خراب اور زکام سے پریشان ہیں تو یہ ٹوٹکا آزمائیں۔ ایک چمچہ کشمش، آدھا چمچہ سونف، دو ٹکڑے لہسن، ایک چھوٹا ٹکڑا ادرک، دو عدد بڑی الائچی، تین ٹکڑے دار چینی اور چائے کی پتی ایک چھوٹا چمچہ۔ تمام چیزوں کو تین کپ پانی میں اتنا پکانا ہے کہ پانی دو کپ رہ جائے۔ اس کو دو سے تین دن تک روزانہ استعمال کریں۔

☆ ہائی بلڈ پریشر اور یورک ایسڈ کے لیے پانچ عدد خشک آلو بخارے، پسی ادرک (ایک ٹکڑا)، ایک عدد گلاب کے پھول کی پتیاں رات کو مٹی کے ایک گلاس پانی میں ڈھانپ کے رکھ دیں۔ صبح اٹھ کے خالی پیٹ پی لیں۔ مٹی کے گلاس میں اس لیے رکھنا ہے کہ مٹی کی خاصیت ہے کہ وہ عرق کو خالص رکھتی ہے۔

☆ ڈینگی کے بخار کے لیے تین سے چار تلسی کے پتے لے کر ان کو دھو لیں ان پتوں کو ایک گلاس پانی میں شامل کر کے ابال لیں۔ جب پانی ابلنا شروع ہو جائے تو اس میں تھوڑی سی مقدار کالی مرچ بھی شامل کر لیں۔ آپ دن میں کئی بار تلسی کے پتوں کا قہوہ استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ اگر آپ کے ہاتھ پیروں میں سوجن رہتی ہے تو اس کے لیے تین ٹوٹکے ہیں۔

1۔ تین چمچ سوکھا دھنیا لے کر اور ایک کپ پانی میں اتنا ابالنا ہے کہ آدھا کپ رہ جائے اس کو چھان کر پی لیں۔

2۔ آپ ایک کپ پانی میں ایک چائے کا چمچہ اجوائن ڈال کر ابالیں جب آدھا کپ رہ جائے تو چولہے اتار کر چھن لیں اور اس میں تھوڑا سا لیموں کا رس ملائیں۔ یہ صبح اٹھ کر نہار منہ پینا ہے۔

3۔ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ سیب کا سرکہ ملائیں اور خالی پیٹ پی لیں۔

یہ ٹوٹکے گردوں کی پریشانیاں اور سوجن کو کم کریں گے۔

☆ جب موسم کروٹ لیتا ہے نزلہ زکام اور کھانسی انسان کو گھیر لیتے ہیں اس کے لیے دو چٹکی پسی کالی مرچ اور دو چٹکی ہلدی ایک چمچہ شہد میں ملائیں دن میں دو بار اسے کھائیں۔

☆ وٹامن ڈی کی کمی کے علاج کے لیے ایک چمچہ کدو کے بیج (کوٹ لیں) ایک چمچہ میتھی دانہ دونوں کو ایک کپ پانی میں چار سے پانچ گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ پھر چھان کر پانی پی لیں اور کدو کے بیج اور میتھی دانہ بھی کھا لیں اس کے ساتھ ابلا ہوا انڈہ ضرور کھائیں۔

☆☆

"کرن کا دستر خوان"

خالدہ جیلانی

لاہوری مچھلی

اجزاء:

سرمئی مچھلی (فلے)	ایک کلو
چاول کا پانی	ایک کھانے کا چمچہ
چاول کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
بیسن (چھنا ہوا)	ایک پیالی
بھنا پسا سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
لیموں	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب: دیگچی میں چاول کا پانی، ہلدی اور دو لیموں کا رس ڈال کر ابالیں۔ اس میں مچھلی کے ٹکڑے ڈالیں اور دو منٹ کے بعد پلیٹ میں نکال لیں۔ ایک پیالے میں بیسن، چاول آٹا، لال مرچ، گرم مسالا، اجوائن، زیرہ اور نمک ڈالیں اور تھوڑا سا پانی ملا کر گاڑھا آمیزہ بنا لیں اس میں باقی لیموں کا نچوڑ رس اور چھلکے محفوظ کر لیں۔ چھلکوں کی مدد سے مسالا مچھلی کے ٹکڑے پر لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ توے پر ہلکا سا تیل گرم کریں اور مچھلی کے ٹکڑے اس پر دونوں جانب سے سینک کر نکال لیں۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور مچھلی کے ٹکڑے سنہری تل کر نکال لیں۔

اچاری سبزی

اجزاء:

پھول گوبھی	ایک پھول
مٹر	ایک پیالی چھلے ہوئے
سرسوں کا تیل	ایک پیالی
گاجر (کیوبز)	ایک عدد
آلو (کیوبز اور ابلے ہوئے)	چار عدد
لیموں	چار عدد
سیم کی پھلی	چھ عدد
میتھی دانہ	آٹھ عدد
ہری مرچ	آٹھ عدد
کڑی پتے	چند عدد
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
کٹی ہوئی رائی	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: کڑاہی میں سرسوں کا تیل گرم کر کے اس میں میتھی دانے ڈال دیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو پھول گوبھی۔ چھلے مٹر، ہری مرچ، گاجر، سیم کی پھلی اور کڑی پتے ڈال دیں۔ اب آلوؤں کے کیوبز الگ پین میں تل کر کڑاہی میں ڈالیں۔ ساتھ میں رائی، نمک، کٹی لال مرچ، ہلدی، سفید زیرہ اور کلونجی شامل کریں اور ہلکی آنچ پر ڈھک کر پکنے دیں۔ جب سبزی گل جائے تو اس میں لیموں کا رس ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مزے دار اچاری سبزی تیار ہے۔

☆☆

گھر والوں سے خوش گوار تعلقات کیسے؟

اگر فیملی پر نظر ڈالیں تو آپ پر واضح ہوگا کہ ایک شخص ہے جو سب پر بھاری ہے اور سب اس کے نقش قدم پر چل رہے ہوتے ہیں اور وہی ایسا بھی ہے جو مشکل کے وقت میں سب کے آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ آنسو بہاتا بھی ہے۔ گھر کے ہر فرد سے اچھے اور خوش گوار تعلقات رکھنے کے لیے آپ کو چاہیے کہ گھر کے ہر فرد کو جانیں اور سمجھیں۔

اخلاقیات: ہر شخص اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے تحت دوسروں کی جانچ کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اسے گھر کے ہر فرد سے پوچھ گچھ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر یہ روک ٹوک مثبت ہے تو اچھا ہے لیکن اگر یہ منفی اور اپنے فائدے کے لیے ہے تو پھر بات وہاں خراب ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر گھر کا کوئی فرد کہیں گھومنے کے لیے جانا چاہتا ہے اور گھر کا سربراہ اسے روک دیتا ہے تو یہ غلط ہے گھر کے بڑوں کو چاہیے کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کی خوشیوں کا خیال رکھیں۔

وارث: جو وارث ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتا ہے اور بہن بھائیوں کو ہمیشہ نیچا دکھانے میں لگا رہتا ہے۔ خود والدین بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ خاندان میں یہی وارث، سچا اور مخلص ہے۔ وہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر جائز ناجائز حربے استعمال کر لیتا ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے یا دھوکا دیتا ہے تو اسے نیچا دکھانے اور غلط ثابت کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ثبوت کے ساتھ اس کے جھوٹ کا پول کھول دیا جائے۔

خود مختار: جو خود مختار ہوتا ہے وہ کسی کی نہیں سنتا ہے۔ وہ نہ تو کسی سے کوئی مشورہ کرتا ہے، نہ کسی کی مدد کرتا ہے اور ایک ایسی زندگی تعمیر کرتا ہے جس میں گھر کے کسی فرد کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ وہ اکثر لوگوں سے شکایت کرتا رہتا ہے کہ اس کے گھر والے اس کے ساتھ درست نہیں ہیں۔ اس سے نمٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نظریات کا احترام کریں اور وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس سے کبھی مدد نہ مانگیں کیونکہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

تقسیم کرنے والا: لوگوں کو تقسیم کرنے والا اپنے ذہن کو ''تقسیم کرو اور حکومت کو'' کے اصول پر استعمال کرتا ہے۔ چونکہ ایسے فرد کا دارومدار قسمت پر ہوتا ہے لہٰذا گھر والوں کو چاہیے کہ اس کی بات کی ایک دوسرے سے تصدیق کر لیا کریں۔ اس طرح اس کی نفی ہو جائے گی۔

آمر: جب آمر کو راستہ نہیں ملتا ہے تو وہ افہام تفہیم سے کام لینے اور گفت و شنید کے بجائے چیخنے چلانے لگتا ہے اور ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ ہوتا ہے کہ سب اس کی بات مان لیتے ہیں اور جان چھڑاتے ہیں۔ چونکہ وہ چلا رہا ہوتا ہے تو کسی کو پتا ہی نہیں چلتا ہے اس کے ذہن میں کیا ہے اور وہ اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے فرد سے صبر و تحمل سے نمٹنے کی ضرورت ہے اور خاموش رہیں تاوقتیکہ اسے احساس ہو جائے کہ چیخنے چلانے سے بات نہیں بنے گی۔

احسان جتانے والا: یہ ایسا فرد ہوتا ہے جو گھر میں ہر کسی کی مدد کرنے پر ہر وقت آمادہ ہوتا ہے۔ مشورے بھی دیتا ہے اور ذہن میں یہ بات محفوظ رکھتا ہے کہ اگر کل کو اسے ضرورت پڑی تو اسے دوسروں سے بھی مدد ملے گی۔ اگر کبھی کسی نے اسے وقت پر مدد کرنے سے انکار کر دیا تو وہ اسے اپنے پچھلے احسانات گنوائے گا جو اس پر کر چکا ہوتا ہے۔ ایسے شخص سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کبھی اس کے قرض دار نہ بنیں۔ اگر وہ کھانا کھلاتا ہے تو ایک ہفتے کے اندر اندر آپ بھی اسے کھانا کھلا کر حساب برابر کر دیں۔

☆☆
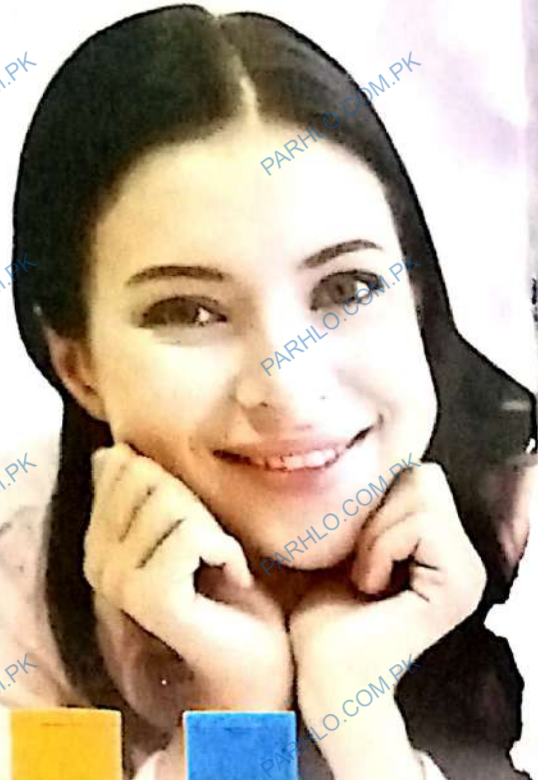
Extra Strength
دِن میں 3 بار...
عادت بنالیں!
جوہر جوشاندہ®
EXTRA STRENGTH
زنک، شہد، چاکلیٹ اور شوگر فری میں بھی دستیاب ہے!
www.qarshi.com
JoharJoshandaOfficial
www.qarshihealthshop.com